[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]		[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]		[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	٧
[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

مجلس ادارت

پروفیسر محمد مجیب	ڈاکٹر سید عابد حسین
ڈاکٹر سلامت اللہ	ضیاء الحسن فاروقی

مُدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی   مطبوعہ: یونین پریس دہلی   ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

شذرات

جون ۱۹۶۷ء میں ماہنامہ تحریک (دہلی) کے "اقبال نمبر" میں ڈاکٹر سید عبد اللطیف کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، عنوان تھا "ایک گنج گرانمایہ کی تلاش"۔ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ ستمبر یا اکتوبر ۱۹۳۷ء میں علامہ اقبال نے مجھے لاہور بلایا اور یہ خواہش کی کہ "میں ایک معتدبہ مدت کے لئے لاہور میں سکونت اختیار کروں تاکہ ایک طرف اسلامیہ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے اس کی کچھ خدمت کر سکوں اور دوسری طرف ان کے ایک منصوبے میں اُن کی مدد کر سکوں، وہ منصوبہ یہ تھا —— انہوں نے اسلامی اصول فقہ کی تجدید کے مسئلہ پر اپنی فکر کے نتائج کو نوٹس کی شکل میں قلمبند کیا تھا، یہ نوٹس انگریزی میں تھے لیکن وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ اپنی گرتی ہوئی صحت کے زمانے میں، ان نوٹس کی ترتیب و تہذیب اور انھیں کوئی قطعی شکل دینا اور شائع کرنا ان کے لئے دقت سے خالی نہیں، ان کی خواہش یہ تھی کہ میں اس کام میں ان کا ہاتھ بٹاؤں"۔ یہی وہ گنج گرانمایہ ہے جس کی آج ایک مدت کے بعد ڈاکٹر صاحب کو تلاش ہے، معلوم نہیں یہ نوٹس اب کس کے پاس ہیں اور موجود بھی ہیں یا نہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علامہ اقبال نے اسلامی فقہ پر کافی غور و فکر کیا تھا اور اس نتیجے پر پہونچے تھے کہ اِس عہد میں اس کے پورے لٹریچر اور اس کے اصولوں کا از سرِ نو جائزہ لینا چاہئے، اس کا اندازہ اُن کے اُس خطبہ سے ہوتا ہے جس کا عنوان ہے "الاجتہاد فی الاسلام" اور جو اُن کی کتاب تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں چھٹے خطبے کے طور پر شائع ہوا ہے، علامہ کے یہ خطبے انگریزی میں تھے، پہلے چھ خطبے تھے، بعد میں ایک کا اور اضافہ ہوا جسے انہوں نے لندن کی ایک علمی انجمن کی دعوت پر لکھا تھا

[illegible]

[illegible]

طرح علامہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ثبات اور تغیر دونوں خصوصیتوں کو ملحوظ رکھنے ہی سے ایک خوشگوار حیات اجتماعی قائم ہو سکتی ہے۔

اس تمہید کے بعد علامہ نے بتایا ہے کہ اجتہاد کیا ہے اور پھر یہ کہا ہے کہ نظری طور پر سنی اسلام نے اجتہاد کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا، گو جب سے مذاہب اربعہ قائم ہو چکے ہیں عملاً اس کی کبھی اجازت بھی نہیں دی۔ انھوں نے اس پر بڑے تعجب کا اظہار کیا ہے کہ جو نظام قانون قرآن مجید جیسی کتاب کو اپنی اساس قرار دیتا ہے جو زندگی کو متحرک اور متغیر مانتا ہے، وہ کس طرح جمود و تعطل کا شکار ہو گیا، انھوں نے مغرب کے اہل قلم کی سطحی قیاس آرائیوں کی نفی کرتے ہوئے خود اس کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے، اور اس سلسلہ میں بڑے پتہ کی باتیں کہی ہیں، تفصیل کی تو گنجائش نہیں، البتہ اس خطبے کے چند بلیغ ٹکڑے نقل کئے جاتے ہیں۔

بغداد کی تباہی (۱۲۵۸ء) کے بعد قدامت پسند مسلم مفکر چاہتے تھے جیسے بھی ممکن ہو اسلام کی ہیئت اجتماعیہ محفوظ رہے اور یہ وہ بات ہے جس میں وہ ایک حد تک حق بجانب بھی تھے، یہ اس لئے کہ قوائے انحطاط کا سدباب نظم و ربط ہی سے ہوتا ہے، لیکن وہ نہیں سمجھے اور ہمارے زمانے کے علماء نہیں سمجھتے تو یہ کہ قوموں کی اور ہستی کا دار و مدار اس امر پر نہیں کہ ان کا وجود کہاں تک منظم ہے بلکہ اس بات پر کہ افراد کی ذاتی خوبیاں کیا ہیں، قدرت اور صلاحیت کیا! یوں بھی جب معاشرہ حد سے زیادہ منظم ہو جائے تو اس میں فرد کی ہستی سرے سے فنا ہو جاتی ہے۔ —— یوں بھی ماضی کا غلط احترام، علی ہذا ضرورت سے زیادہ تنظیم کا وہ رجحان جس کا اظہار تیرھویں صدی اور بعد کے فقہا کی کوششوں سے ہوتا ہے، اسلام کی اندرونی روح کے منافی تھا اور یہی وجہ ہے کہ ابن تیمیہ کی ذات میں .... اس روش کے خلاف ایک زبردست ردعمل رونما ہوا۔

—— بد قسمتی سے اس ملک (غیر منقسم ہندوستان) کے قدامت پسند مسلم عوام کو ابھی یہ گوارا نہیں کہ فقہ اسلامی کی بحث میں کوئی تنقیدی نقطۂ نظر اختیار کیا جائے، وہ بات بات پر خفا ہو جاتے اور ذرا سی تحریک پر بھی

فرقہ وارانہ نزاعات کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔

____ لیکن پھر اس سلسلے میں غور طلب امر قرآن مجید کا وہ مطمح نظر ہے جو اس نے زندگی کے بارے میں قائم کیا اور جس میں اس کی نگاہیں جمود کے بجائے حرکت پر رہیں، لہٰذا ظاہر ہے کہ جس کتاب کا مطمح نظر ایسا ہوگا اس کی روش ارتقار کے خلاف کیسے ہو سکتی ہے؟ البتہ ہمیں نہیں بھولنا چاہیئے تو یہ کہ زندگی محض تغیر ہی نہیں، اس میں حفظ و ثبات کا ایک عنصر بھی موجود ہے۔۔۔

____ گر پھر اس بات کو ہم دوسرے لفظوں میں یوں ادا کریں گے کہ زندگی چونکہ ماضی کا بوجھ اٹھائے آگے بڑھتی ہے، اس لئے ہمیں چاہیئے جماعت میں تغیر و تبدل کا جو نقشہ ہم نے قائم کیا ہے، اس میں قدامت پسندانہ قوتوں کی قدر و قیمت اور وظائف فراموش نہ کریں، تعلیمات قرآنی کی یہی وہ جامعیت ہے جس کا لحاظ رکھتے ہوئے جدید عقلیت کو اپنے ادارات کا جائزہ لینا ہوگا۔

علامہ اقبال کی فکری کاوشوں کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم ان کے اشعار پر تو سر دُھنتے ہیں لیکن اُن کے افکار کو در خور اعتنا نہیں سمجھتے، اس سے بڑی مظلومیت اور کیا ہو سکتی ہے، ہمارے انگریزی داں اور علماء دونوں اس میں شریک ہیں، طبقۂ علماء یہ کہہ سکتا ہے کہ خطبات انگریزی میں تھے اس لئے ہماری رسائی ان تک نہیں ہوئی، حالانکہ یہ عذر لنگ ہوگا، پھر بھی اردو ترجمہ کو شائع ہوئے کوئی ۰ سال کا عرصہ ہوا، کیا یہ ترجمہ ہندوستان کے علماء میں متداول ہوا۔ اگر ہوا تو انہوں نے اس کا کیا اثر لیا؟ علامہ کے اشعار ہر طبقہ میں مقبول ہوئے، بہت گائے گئے، بہت گنگنائے گئے، اور ہر گروہ نے اپنے مطلب کی باتیں ان سے نکال لیں، لیکن وہ فکر و فلسفہ، زندگی کائنات اور منشائے تخلیق سے متعلق وہ آفاقی نظریہ جو اُن کے سیکڑوں اشعار اور ان کے خطبات کی روح ہے کتنے لوگوں نے اپنایا؟ ایسے تمام لوگوں سے علامہ کی شکایت اپنے پیر رومی کی زبان میں یہی ہے:

ہر کسے، از ظنِ خود، شُد یارِ من
وز درونم، کس نجُست اسرارِ من

[illegible]

[illegible]

1 .

[illegible]

[illegible]

[illegible]

میں بدیسی حکومت کے خلاف پیدا ہوا لیکن اس کو بروئے کار لانے میں کچھ عرصہ لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نوآبادیات کی ابتدائی سوسائٹی میں وہ اعتماد نہ پیدا ہو سکا تھا جو کہ ایسے ردعمل کے لئے ضروری ہوتا ہے۔

نوآبادیاتی نظام کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہ لوگوں میں خود اعتمادی ختم کر دیتا ہے۔ قومی لیڈر وہی کہلاتے ہیں جو ایک طرف اپنے ملک کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کر کے اور دوسری طرف بدیسی حکومت کے سیاسی اداروں، حربوں اور چالوں سے پوری طور پر واقفیت حاصل کر کے یہ "خود اعتمادی" اپنے اور اپنے ملک کے باشندوں میں پھر سے پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ خود اعتمادی اپنے اور اپنے ملک کے باشندوں میں پھر سے پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ خود اعتمادی حاکم کے اجتماعی شعور کے مقابلہ میں خود محکوم میں اجتماعی شعور کا احساس پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ایک بار اگر یہ شعور پیدا ہو جائے تو پھر نوآبادیات کی ہر خرابی اس کو تیز سے تیز تر کرتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوآبادیات میں حاکم طبقہ کا نابرابری کا سلوک قومی شعور کو ہمیشہ مستحکم کرتا رہا ہے اور اسی تناسب سے حصول آزادی کا مطالبہ شدت اختیار کرتا گیا ہے یہاں پہونچ کر "ارجنل" قومیت اور دور جدید کی قومیت کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ ارجنل قومیت اثباتی ہے جبکہ دور حاضر کی قومیت منفی۔ ارجنل قومیت سامراجی ہے جبکہ موجودہ دور کی قومیت سماجی جو برابری کا مطالبہ کرتی ہے۔ آج کی قومیت سیاسی بھی نہیں ہے یہ کسی حد تک معاشی ہے جو دنیا کی مملکتوں میں ایک خود مختار سماجی و معاشی اکائی کی حیثیت سے زندہ رہنے کا شعور پیدا کرتی ہے۔

۲

ایشیائی "قومیت" نہ تو کسی قدیم سوسائٹی کی خود ساختہ کوششوں کا نتیجہ ہے اور نہ ہی یہ کوئی منفرد طرز زندگی جس کو بچا کر رکھنا خود "قومیت" کو بچا کے رکھنے کے مترادف ہو۔ یہ تو ایک ایسی سوسائٹی کی جدوجہد کا نتیجہ ہے جو باہری طاقتوں کی مداخلت سے شکست خوردہ ہو چکی تھی اور جس کو تعمیر نو کی فکر تھی تاکہ وہ اس بدلتی ہوئی دنیا میں عزت و برابری کا مقام حاصل کرے۔ ایشیائی قومیت کا یہ مشترک مقصد مختلف ملکوں میں مختلف شکل اختیار کرتا رہا ہے۔ ہندوستان اور انڈونیشیا

میں اس نے ایک فکر انگیز اور جذباتی انقلاب کی صورت اختیار کی جس کا مقصد مغربی طاقتوں کی بیخ کنی تھی۔ چین میں یہ کمیونسٹ انقلاب کو پھیلانے کا ایک با اثر حربہ بن گئی۔ جاپان نے قومی انقلابات کو برپا کرنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا۔ اس نے ملایا، برما، انڈونیشیا اور فلپائن میں نہ صرف یہ کہ فوجی ٹریننگ کا انتظام کیا بلکہ ہتھیار بھی تقسیم کئے۔ ہندوستان کی "انڈین نیشنل آرمی" کو منظم کیا اور ہندوستان کے قومی لیڈر سبھاش چندر بوس کو ہم خیال بنایا۔ جو بھی شکل اس انقلاب نے اختیار کی مقصد ایک ہی تھا کہ کسی طرح ایشیا سے مغربی طاقتوں کے تسلط کو ختم کر دیا جائے۔

بدیسی حکومت کے خلاف انقلاب کے اس مشترک مقصد نے ایشیائی قومیت کو مستحکم و متحد کر دیا۔ مقامی تنگ نظری ختم کر دی۔ سماجی شعور وسیع کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں سوسائٹی متحرک ہوگئی۔ سیاسی کارکردگی بڑھ گئی۔ انقلابی طبقہ سے وابستگی کا احساس پیدا ہو گیا اور قومی مملکت کے یکساں مقصد کے لئے جاں نثاری و سرفروشی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ یہ سب بہت بڑی کامیابیاں سہی لیکن ان کی حیثیت بہرحال قومی اثاثہ کی ہے۔ ان کو انقلاب کا مقصد سمجھ لینا غلط ہوگا۔ ہم اب تک قومی اثاثہ کو بدیسی حکومت کے تسلط کو توڑنے کے منفی کام میں لگاتے رہے لیکن حصول آزادی کے بعد جب قومی نصب العین کے تعین اور قومی اداروں کے قیام کا وقت آیا تو ہماری قومی کارگزاریاں اور مفاد زوال پذیر ہونے لگے اور یہی مقاصد جذبہ جاں فروشی برباد ہونے لگے۔ قومی یک جہتی جو ایک دوسرے سے اور مملکت سے ہم آہنگی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے ایشیا میں منفی صورت میں بدیسی حکومت کے خلاف تو باقی رہی لیکن جب تعمیری مقاصد طے کرنے کا وقت آیا اور مثبت جد و جہد کی ضرورت پیش آئی تو اس کا شیرازہ بکھرنے لگا۔

کہا جاتا ہے کہ قوموں کی پہچان ہمیشہ "منفی" ہوتی ہے ان کو آپ کسی مثبت خاصیت سے نہیں پہچانتے بلکہ محض اس وجہ سے جانتے ہیں کہ فرانسیسی جرمن نہیں ہوتے یا اٹلی اور تھائی لینڈ کے باشندے برمی یا ملائی نہیں ہوتے۔ یہ بات ایشیائی قومیت پر بھی صادق آتی ہے اپنی قومی یک جہتی کو برقرار رکھنے کے لئے ایشیائی قومیت کو ہمیشہ کسی باہری دشمن کی تلاش رہتی ہے۔ اسی منفی رویہ کی وجہ سے آج ایشیا کی قومیت قوت فیصلہ سے محروم نظر آتی ہے۔ اشتراکیت یا سوشلزم، جمہوریت یا مطلق العنانیت،

لادینیت یا مذہبیت، مذہبی یا سیکولر مملکت۔ یہ اور اسی طرح کے اور بہت سے متبادل نظام سوسائٹی کے مختلف طبقے پیش کرتے رہتے ہیں لیکن آج تک یہ فیصلہ نہ ہوسکا کہ اِن اداروں اور نظاموں میں سے کس کو چھوڑا جائے اور کس کو اختیار کیا جائے۔ یہی گومگو کی کیفیت روزمرہ کے مسائل میں بھی نظر آتی ہے ہندوستان کو ہندی بہ حیثیت قومی زبان کے اپنانا چاہیئے یا انگریزی کو ایک مدت غیر معینہ کے لئے اختیار کرنا چاہیئے۔ انڈونیشیا اپنی یک جہتی کے لئے وحدانی طرزِ حکومت کو اختیار کرے یا علٰحدگی کے جذبہ کو مطمئن کرنے کے لئے وفاقی طرزِ حکومت کو اختیار کرے تو "یونین" اور "یونٹ" کے درمیان اختیارات کی تقسیم کس تناسب سے ہو۔ اسی طرح معاشی سرگرمیوں کو فرد اور مملکت کے درمیان کس طرح تقسیم کیا جائے کہ ایک طرف فرد کی آزادی و اس کی انفرادیت کو کوئی نقصان نہ پہونچے اور دوسری طرف سماجی مساوات و انصاف پر بھی آنچ نہ آنے پائے۔ اِن مسائل پر قطعی فیصلہ نہ ہو سکنے کی وجہ یہ ہے کہ قومیت کا خود کوئی مثبت نصب العین نہیں ہے۔ قومی مقصد کی یکسانیت مختلف طبقوں کے درمیان بٹ کر رہ گئی ہے جس کے نتیجہ میں ہر طبقہ اپنے آپ کو قومی مقصد کا واحد رہنما اور دوسرے طبقوں کے وجود کو قومی مفاد کے منافی سمجھتا ہے۔ اگر کسی سوسائٹی کی تشکیل مختلف طبقاتی عناصر سے ہوئی ہو تو ان میں سے کسی ایک طبقہ کو قومیت کا صحیح رہنما تسلیم کر کے نمایاں حیثیت دینا یا کسی کو یہ کہکر علٰحدہ کرنا کہ یہ قومیت کے عام کردار سے میل نہیں کھاتا انتہائی خطرناک صورت ہے۔ کسی بھی بنا پر ہم اِن میں سے کسی کو علٰحدہ نہیں کر سکتے کیونکہ سب ہی قومی زندگی کے ناقابل فراموش اجزاء ہیں۔

صحیح قومیت کے اظہار کا ذریعہ ایک آزاد حکومت ہوتی ہے لیکن ایشیائی حکومتوں کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ عوام اور ان کے چند لیڈروں کے درمیان ایک زبردست ذہنی خلا ہے۔ عوام اَن پڑھ اور سیاسی شعور سے بے بہرہ ہیں۔ اُن کے لیڈر خیالات کے اعتبار سے مغربی ذہنیت رکھنے کی وجہ سے اپنی ہی سوسائٹی میں اجنبی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ دونوں طبقوں میں اظہار خیالات کے لئے کوئی ربط باقی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ قومی لیڈر مستعار لئے ہوئے سیاسی اداروں میں وہ ضروری تبدیلیاں کیسے کریں جو عوام کے سماجی و روایتی شعور اور مقامی ضرورتوں کے پیش نظر ضروری ہیں۔

اب تفریق کا باعث ہو گئی ۔ اس کی وجہ سے "پلیورل" سوسائٹی کے تمام مسائل اٹھ کھڑے ہوئے اور اکثریت اقلیت کی کشمکش شروع ہو گئی۔ آج ایشیا کی قومیت کے سامنے یہ بنیادی مسئلہ ہے اس وجہ سے نہیں کہ اور تمام مسائل اسی سے پیدا ہوئے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان مسائل کی موجودگی میں اکثر یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ ایشیائی ملکوں کو قومی مملکت بھی سمجھا جائے یا نہیں۔ مثال کے طور پر ملیشیا، انڈونیشیا اور تھائی لینڈ میں چینی، لنکا میں ہندوستانی، ہندوستان میں ناگا، برما میں Karens اور Shans اور انڈونیشیا میں اہل جاوہ ایسے [illegible] ہیں جو ان ممالک میں خود مختار رہنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان مطالبات کی شدت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایشیا کی مملکتیں آگے چل کر چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں بٹ جائیں گی بالکل اسی طرح جس طرح سے عہد وسطیٰ کے یورپ نے اپنے مقامی مطالبات کی تسکین کے لئے اپنے کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کرنے پر مجبور پایا۔ پنجابی صوبہ کا خود رائے دہندگی اور مرکز سے آزاد ہونے کا مطالبہ اور پنجاب اور ہریانہ صوبوں کے درمیان تقسیم دراصل اسی رجحان کے ابتدائی مظہر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اقتصادی منصوبہ بندی اور قومیت کے درمیان گہرا تعلق پیدا ہو جانے سے شاید یہ مرکز گریزی کا رجحان رک جائے لیکن یہ امید موہوم ہے۔ بہرحال ایشیا کی قومیت کے سامنے جو سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کے حل کرنے میں دقتیں ہیں وہ دراصل خارجی نہیں بلکہ داخلی ہیں۔ وہ ہمارے ذہن، اسپرٹ اور رجحان کی دقتیں ہیں جس کی وجہ سے ہم کبھی پیچھے ہٹتے ہیں اور کبھی آگے بڑھتے ہیں۔ اس طرح ہم رجعت پسندی اور ترقی پسندی کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔

۳

عربوں کی قومیت کا سرچشمہ ایک عرصہ تک انگلستان اور فرانس رہے لیکن بعد میں دونوں سے رنجشیں پیدا ہو گئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فرانس نے مینڈیٹ ختم کرکے سیریا اور لبنان کو نو آبادیات بنا لیا اور انگلستان نے اسرائیلیوں کو فلسطین میں بسا کر ایک نئی ریاست کی بنا ڈالی۔ اس کے بعد ہی عربوں کی قومیت کا واحد مقصد مغربی طاقتوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ہو گیا۔ ایک زمانہ تھا جب کہ شاہی خاندان کے افراد دولت عثمانیہ کے خلاف قومی انقلاب میں حصہ لے کر مغربی طاقتوں کا قرب حاصل

کرتے تھے۔ لیکن آج کے قومی رہنما جن میں صدر ناصر کی حیثیت نقش اول کی ہے مغربی طاقتوں کے سخت مخالف ہو گئے اور ان کا مقصد عرب سوسائٹی کی از سرِ نو تشکیل ہو گیا۔

مشرقِ وسطیٰ میں مغربی طاقتوں کی دلچسپی کی وجہ صرف تیل نہیں ہے بلکہ اس کی جغرافیائی حیثیت بھی ہے۔ مغربی طاقتوں کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ نقشہ میں کہاں ہے اس کے بعد یہ اہم ہے کہ اس کے ریگستان کی تہہ میں کیا ہے۔ چنانچہ عدن کی نو آبادیات، خلیج فارس سے برطانیہ کا معاہدہ اور کویت سے اُس کی دلچسپی کی وجہ "ارضیاتی" اور "جیوپولیٹیکل" دونوں ہیں، جس کی سخت مخالفت سعودی عربیہ اور عراق کر رہے ہیں۔

لیکن عرب قومیت کی انفرادیت مغربی ممالک کی مخالفت میں نہیں بلکہ اس کو آپسی جھگڑوں میں استعمال کرنے میں مضمر ہے۔ مثال کے طور پر ایران میں ڈاکٹر مصدق کا برسرِ اقتدار آنا بھی قومیت اور ۱۹۵۳ء میں ان کا معزول ہونا بھی۔ اسی طرح ۱۹۵۸ء اور ۱۹۶۲ء کے درمیان عراق کے صدر جنرل قاسم کا برسرِ اقتدار اور معزول ہونا قومیت ہی کی کرشمہ سازی سمجھی جاتی ہے۔ آزادی کے بعد شام کے ہر انقلاب کو قومی کہا جاتا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں یمن کا ریپبلکن انقلاب بھی قومی اور اس کے ردعمل میں شاہی انقلاب بھی قومی کہلاتا ہے۔ برطانیہ کے خلاف صدر ناصر کی کارکردگی کو بھی قومیت کہا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں شرق اردن کے بادشاہ نے عرب فوج سے جنرل گلب کو علٰحدہ کر دیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد اردن کے بادشاہ کا ناصر کے حامیوں کے خلاف اقدام بھی قومیت کہلاتا ہے کیونکہ اس نے جارڈن کو متحد کیا اور تقسیم ہونے سے بچا لیا۔

آپس کی ان نااتفاقیوں کی وجہ محض سیاسی نہیں بلکہ معاشی بھی ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کو معاشی حیثیت سے دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ وہ امیر ممالک جن کے پاس تیل کے ذخیرے ہیں اور باقی وہ غریب ممالک جو اس دولت سے محروم ہیں۔ جب بھی کبھی عرب یکجہتی کو باعمل بنانے کی بات آتی ہے امیر ممالک یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اُن کی تیل کی دولت میں غریب ممالک کو بھی شریک کرنا پڑے گا جس کے لئے وہ آمادہ نہیں ہیں۔ انھیں معاشی مقاصد کی حفاظت میں وہ

عرب اتحاد کے بجائے موجودہ سیاسی سرحدوں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ عرب یونین بن جانے کے بعد چاہے سیاسی سرحدیں جوں کی توں باقی رہیں لیکن معاشی سرحدیں ضرور ٹوٹ جائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ پان عرب سیاسی یونین کا مطالبہ شدت سے ان ممالک کی طرف سے آتا ہے، جو غریب اور تیل کی دولت سے محروم ہیں جیسے مصر، سیریا اور یمن اور اس تجویز کی مخالفت وہ امیر ممالک کرتے ہیں جن کے یہاں تیل کے ذخیرے ہیں جیسے سعودی عربیہ، عراق، کویت اور خلیج فارس۔ اسلامی برادری اور تہذیبی وحدت یا ہم آہنگی کی بات صرف زبانی کی جاتی ہے ورنہ مشرق وسطی کا معاشی طبقہ موجودہ ریاستی سرحدوں کو تبدیل کرنے کا سخت مخالف ہے۔ کیونکہ یہی سرحدیں تو اس طبقہ کی تجارتی اجارہ داری کو قائم کئے ہوئے ہیں۔ اس طرح عرب قومیت کا وجود ایک "جذباتی مخزن" کا ہے جو ہمیشہ متحرک تو رہے گا لیکن اٹلانٹک سے لے کر خلیج فارس تک اس جذبہ کو کوئی سیاسی حقیقت سمجھنا یا اس کی امید کرنا محض خیالِ خام ہے۔

۴

کہا جاتا ہے کہ قومی مملکتوں کی سرحدیں خود ساکنانِ مملکت مقرر کرتے ہیں۔ کسی اور طرح سے ان کا تعین غیر فطری ہوتا ہے اس اصول پر افریقہ کی کسی مملکت کو قومی مملکت نہیں کہا جا سکتا۔ افریقہ میں فطری سرحدیں قبیلوں کی ہیں جبکہ مملکت کی سرحدیں بدیسی حکومت کی بنائی ہوئی ہیں۔ یوروپ کی نوآبادیاتی طاقتوں نے فطری قبائلی سرحدوں کا خیال کئے بغیر افریقہ کو اپنی مصلحت کے مطابق بانٹ لیا۔ اب جبکہ یہی آزاد مملکتوں کی سرحدیں قرار پا چکی ہیں اِن سے "مِل" کے قول کی تصدیق نہیں ہوتی کہ "ملکوں کی سرحدیں قوموں کے اعتبار سے ہونی چاہئیں"۔

قومی مملکتوں کی تشکیل میں انفرادی وفاداری کی ضرورت ہوتی ہے۔ افریقہ میں مشکل یہ ہے کہ جن اکائیوں سے یہ وفاداری وابستہ ہے وہ یا تو قومی مملکتوں سے بہت چھوٹی ہیں یا بہت بڑی۔ محدود وابستگی قبیلہ کے ساتھ ہے جس کو قومی مملکت کا مرتبہ دیا جاتا ہے لیکن اس کا سیاسی وسماجی قد مملکت سے بہت چھوٹا ہے۔ وسیع وابستگی پان افریقی تصور کے ساتھ ہے جس میں کئی سیاسی وسماجی اکائیوں کا وجود قومی مملکت کی تشکیل میں حائل ہے۔ افریقہ کے سامنے یہی دو بڑی دشواریاں ہیں۔ ایک طرف

کا وجود باقی ہے اور اس لحاظ سے افریقہ کا ہر چھوٹا بڑا، وحدانی و وفاقی ملک اپنے اندر ایک "کرانگا" بسائے ہوئے ہے۔

پان افریقی تصور یورپ کے اُس پورے رویہ کے خلاف ایک ردِ عمل ہے جو اس نے ماضی میں افریقہ کے ساتھ روا رکھا۔ کچھ لوگوں کے خیال کے مطابق یہ ایک نسلی تعصب کی پیداوار ہے جس کا مقصد سیاہ فام قوم کی برتری قائم کرنا ہے۔ دوسرے پان افریقی تصور کا ایک وسیع نظریہ پیش کرتے ہیں، ان کے خیال کے مطابق یہ نسلی تعصب سے بالاتر ہر اس شخص کے لئے ہے جو افریقہ میں پیدا ہوا ہو اور وہاں کا باشندہ ہو۔ کچھ کا یقین ہے کہ افریقہ کی معاشی ترقی اور اس کے اتحاد کے لئے یہ تصور بہت ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ افریقہ کی قومیت نہ صرف یہ کہ بے معنی بلکہ خطرناک ہو جائے اگر اس کو پان افریقی تصور سے وابستہ نہ کر دیا جائے۔ ۱۹۵۹ء میں نکرومہ نے گھانا کی دسویں سالگرہ کے موقع پر کہا تھا کہ "آج سے کوئی شخص اپنے آپ کو نیبنٹ، آشانتی، یو، فاس اور ڈوگمباس نہ سمجھے وہ سب اپنے آپ کو اہلِ گھانا سمجھیں"۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ وہ گھانا مملکت کے قومی تصور کو مضبوط کرنے کے لئے ایسا نہیں کہہ رہے تھے بلکہ جیسا کہ انھوں نے خود آگے چل کر واضح کیا کہ "اس سے وہ انسانی ذہن کو قبائلی تنگ نظری سے آزاد کرا کے ایسی وسیع النظری پیدا کرانا چاہتے ہیں جو پان افریقی تصور کا نصب العین ہے"۔ اسی پان افریقی تصور کے پیشِ نظر افریقہ کے باشندے اپنے آپ کو کسی ذاتی ملک کے بجائے پورے افریقہ سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ افریقی شخصیت، افریقی تاریخ، افریقی تہذیب، افریقی سوشلزم، افریقی جمہوریت اور سول سروس کا کلیتاً افریقی بنانے کا تصور ان چھوٹی چھوٹی مملکتوں میں کیا نہیں جا سکتا جو یورپ کے تسلط کی دین ہیں۔

اس وقت افریقہ کی قومیت ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ اگر چھوٹی مملکتوں کو گھٹا کر قبیلوں کے مطابق کر دیا جائے تو اس سے قبائلی جھگڑے اور اس سے پیدا شدہ نقصانات سے تو نجات مل جائے گی لیکن موجودہ قومی مملکتوں کا تصور باقی نہیں رہے گا۔ دوسری طرف اگر پورے افریقی براعظم کو پان افریقی تصور کے تحت ایک اکائی مان لیا جائے تو شبہ ہونے لگتا ہے کہ کیا اتنے بڑے علاقہ اور

اس میں بسنے والے اتنے مختلف باشندوں پر ایک قومی مملکت کا اطلاق ہو سکتا ہے ۔ یورپ خود اس کشمکش سے گزر چکا ہے ۔ ایک طرف رومن ایمپائر کا آفاقی تصور تھا اور دوسری طرف جاگیرداری کا مقامی تصور ۔ لیکن ان میں سے کوئی قومی مملکت کی شکل اختیار نہ کر سکتا تھا ۔ علاقائی مملکتوں کے قیام نے اس کشمکش سے نجات دلائی کیونکہ یہ اکائی ایسی تھی جو جاگیرداری سے بڑی اور رومن ایمپائر کے آفاقی تصور سے چھوٹی تھی ۔ میرا خیال ہے کہ اپنے قبائلی اور پان افریقی تصور سے پیدا شدہ مشکلات کے حل کے لئے افریقہ کو بھی یورپ کی طرح کسی علاقائی مملکت کے قیام کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا ۔

۵

تاریخ شاہد ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی ایک زمانہ تک خاندان، گاؤں، قبیلہ اور ذات پات تک محدود رہی ۔ اگرچہ قومیت پوری انسانی برادری کو اپنے اندر سمو لینے میں ناکامیاب رہی لیکن اس سے انسان کی اجتماعی زندگی کم از کم ایک محدود دائرے سے نکل کر قومی مملکت کے وسیع دائرے تک ضرور پہونچ گئی ۔ قومی مملکتیں اپنی ارتقاء سے لے کر آج تک تین منزلوں سے گزری ہیں ۔

پہلی منزل خالص قومیت کی منزل ہے ۔ اس منزل میں قومیت کا مقصد تسلیم شدہ جغرافیائی حدود میں اقتدار اعلیٰ کے ساتھ آزادی حاصل کرنا ہوتا ہے ۔ اس ابتدائی منزل کی قومیت کو "اجتماعی خود غرضی" کا نام دیا گیا ہے یا زیادہ سے زیادہ اس کو آپ "اجتماعی تعلق خاطر" کہہ لیجئے ۔ اس منزل کی قومیت میں خود بینی کے عناصر زیادہ ہوتے ہیں ۔ اپنی تہذیب اور اپنے طریقہ زندگی کو مکمل اور صحیح سمجھا جاتا ہے اور دوسروں کی تہذیب اور طریقہ زندگی سے نفرت پیدا کر کے اس کو مضبوط بنایا جاتا ہے ۔

قومیت کی دوسری منزل "اجتماعی تحفظ" کی منزل ہے ۔ یہ منزل اس وقت آتی ہے جب قومی مملکتوں کو یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کی بقا کے لئے پہلے "امن" اور دوسرے خوشحالی لازم و ملزوم ہیں اور ان کے حصول کے لئے ایک دوسرے کی امداد ضروری ہے ۔ یہاں پہونچ کر پہلی منزل کی "خالص خود غرضی" "مصلحت اندیشی" میں بدل جاتی ہے ۔ قومی مملکتوں کو اپنی بقا کے لئے اپنا وجود حقیر و ناکافی معلوم ہونے لگتا ہے اگرچہ جغرافیائی سرحدوں کا تحفظ اسی قومی شدت کے ساتھ کیا جاتا ہے

جو پہلی منزل کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس منزل میں آ کر وطن پرستی کا جذبہ اگرچہ غیر ضروری نہیں سمجھا جاتا لیکن ناکافی ضرور سمجھا جاتا ہے۔

تیسری منزل بین الاقوامیت کی منزل ہے جس کے سامنے قومی ضرورت دب جاتی ہے کیونکہ اس کا نصب العین انسانیت ہو جاتا ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں پہونچ کر انسانی ضرورتوں کو قومی سرحدوں میں بانٹ کر نہیں پورا کیا جاتا۔ جیسا کہ اب تک قومی ریاستیں پورا کرتی رہی تھیں یا ان سے بھی پہلے شہری ریاستیں پورا کیا کرتی تھیں۔ یہ منزل پورے طور پر حاصل نہیں کی جا سکی ہے اور نہ اس وقت تک حاصل ہو سکے گی جب تک فوجی طاقت کو کسی بین الاقوامی ادارے کے سپرد نہ کر دیا جائے اور مملکتیں یہ خیال نہ ترک کر دیں کہ اقتصادی نظریہ و پالیسی طے کرنا ان کے اقتدار اعلیٰ میں شامل ہے۔ ایسا ہو جانے کے بعد تہذیبی اکائی کو سیاسی اہمیت حاصل نہ ہو سکے گی جس کی وجہ سے وہ دوسری اکائیوں کے برابر ہو جاتی ہے۔ اسی صورت میں تقسیم کار عناصر کی اصل وجہ ختم کی جا سکتی ہے۔ بغیر اس کے بین الاقوامیت کی منزل تک رسائی مشکل ہے۔ لیکن مملکتوں میں عام رجحان قومیت کی اسی تیسری منزل کی طرف پایا جاتا ہے۔ "یونیسکو" نے انسانی تہذیب کی آفاقیت، سائنس کی لامحدود وسعت اور نفرت و رنجش سے پاک تعلیم پر زور دیا ہے۔ یہ اصول محض غیر قومی نہیں بلکہ مکمل طور پر بین الاقوامی ہیں۔ انھیں سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا دھیرے دھیرے بین الاقوامی نظریہ کی طرف گامزن ہے۔

آج دنیا کی مملکتوں میں توازن باقی نہیں ہے کیونکہ یہ قومیت کی مختلف منزلوں سے گذر رہی ہیں اور منزلوں کے اختلاف کے باوجود بہر حال سب ہی کو مل جل کے رہنا ہے۔ اگرچہ پندرھویں صدی میں یورپ، ایشیا اور امریکہ اور اٹھارویں صدی میں برطانیہ اور جاپان مختلف منزلوں میں تھے لیکن چونکہ رسل و رسائل کی کمی تھی اس لئے ایک دوسرے سے اجنبی تھے اور ان اختلافات کا کوئی احساس نہ پیدا ہوا تھا لیکن آج یہ بات آسانی سے نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ ترقی یافتہ مغربی ممالک جبکہ قومیت کی تیسری منزل میں داخل ہو رہے ہیں ایشیا اور لیٹین امریکہ کے بہت سے ممالک ابھی دوسری منزل اور افریقہ پہلی ہی منزل میں ہے۔ مسئلہ اور بھی

پیچیدہ ہوجاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان منزلوں کو قطعیت کے ساتھ تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ ایک ہی ملک جو بین الاقوامی نظریہ کا حامل ہے کچھ مسئلوں میں روایتی قوم پرستی کا شکار ہوجاتا ہے۔ ہندوستان کے سابق صدر ڈاکٹر رادھاکرشن نے انسانیت کے لئے بین الاقوامی وفاداری پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ "انسانی نسل ایک ہے۔ یہ ایک محض طرز بیان نہیں ایک تاریخی حقیقت بنتی جارہی ہے"، ایک دوسری تقریر میں انھوں نے کہا تھا کہ "آج بیسویں صدی کا انسان جبکہ کائنات کے راز افشا کررہا ہے اُس کو دنیا کے کسی گوشے میں محض اس وجہ سے محصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اتفاق سے وہاں پیدا ہوا تھا۔ ہماری حقیقی قومیت انسانی نسل ہے اور ہمارا گھر یہ دنیا" اس لحاظ سے ہندوستان کا نقطۂ نظر بین الاقوامی قرار پاتا ہے۔ لیکن دوسری طرف ہندوستان کے سیاسی فیصلے خالص قومی ہیں۔ کیرالا میں کمیونسٹوں کی گرفتاری حفاظتی کونسل میں پاکستان کی کشمیر میں بے جا مداخلت کے خلاف ہندوستان کا احتجاج۔ ہندوستان کے وزیر دفاع کا اعلان کہ ہندوستان چین یا پاکستان کی طرف سے ہونے والے ہر حملہ کے لئے تیار ہے۔ مغربی جرمنی، کناڈا اور ایران کے خلاف ہندوستان کا سخت احتجاج کہ یہ ممالک پاکستان کو سیبر جیٹ اور دوسرے فوجی سازوسامان فراہم کرکے ہندستان کے امن کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ ہندوستان کا ایک اقدام سابق صدر کے الفاظ میں "بین الاقوامی" ہے جبکہ دوسرا اقدام خالص "قومی" ہے۔ ایک اقدام "پرامید" ہے تو دوسرا ایسی خالص "حقیقت" جس سے کوئی ملک عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ قومیت کی دونوں منزلیں بیک وقت ایک ہی ملک، ایک ہی زمانہ اور ایک ہی نسل میں پائی جاتی ہیں۔

یہ امید کی جاتی ہے کہ آفاقیت قومیت کو کسی منزل میں پہونچ کر اپنے میں جذب کرلے گی۔ یوروپین کونسل۔ پان افریقی۔ پان عرب اور کمیونسٹ تحریکیں عالمی ریاست کی طرف ہماری رہنمائی کررہی ہیں۔ لیکن یہ سب قبل از وقت امیدیں اور آرزومندانہ خواہشات ہیں۔ یہ بڑی اکائیاں اگرچہ مافوق القومیت کا درجہ رکھتی ہیں لیکن دراصل ایک دوسرے کے خلاف منظم کی گئی ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ اعتماد سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ سب ہماری رہنمائی بین الاقوامیت کی طرف کریں گی۔ اس کے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ١٧٧١ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

(٨)

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کے بیچ میں لبنانی قوم بڑی مصیبت، فقر و فاقہ اور تنگ دستی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ مارونی عیسائیوں کے بہت سے خاندان اس دوطرفہ مصیبت کی تاب نہ لاکر امریکہ، برازیل اور میکسکو کے شہروں میں ہجرت کر گئے تھے۔ انھیں خاندانوں میں جبران کا خاندان بھی تھا جو ۱۸۹۵ء میں امریکہ پہنچا اس وقت جبران کی عمر صرف ۱۲ سال کی تھی۔ اس خاندان نے امریکہ کے شہر باسٹن میں ایک زمانے تک بڑی تنگدستی اور فقر فاقہ کی زندگی گزاری۔ ان کی بڑی بہن ماریانا محلے ٹولے کے لوگوں کے کپڑے سی کر گزر بسر کرنے کے لئے چند سکے کما لیتی تھیں۔ چنانچہ جبران نے ایک دن بڑے درد سے ان سے کہا کہ "تمھاری سوئی میری آنکھوں کو اندھی اور تمھارا تاگا میرے گلے میں پھانسی کا پھندا معلوم ہوتا ہے"[۱]۔ جبران خلیل جبران نے اس تکلیف دہ ماحول اور ناساعد حالات میں پرورش پائی تھی طبیعت حساس تھی چنانچہ ان سارے واقعات نے دل پر وہ گہری چھاپ ڈالی جو رہتی عمر تک نہ مٹی اور جوں جوں وہ بڑھتے گئے دین و دنیا کے ٹھیکیداروں کے خلاف ان کا جذبۂ انتقام پروان چڑھتا گیا اور جب گوش و ہوش کی آنکھیں کھلیں تو یہ طے کر لیا کہ ان دونوں کے خلاف علم بغاوت بلند کریں گے اور اس مشن کو کامیاب بنا کر چھوڑیں گے۔ چنانچہ انھوں نے جتنی بھی کہانیاں لکھی ہیں اکثر انھیں دونوں یعنی دین و دنیا کے ناقص علمبرداروں کی برائیوں، مظالم اور بدکرداریوں کا پردہ فاش کرتی ہیں۔ دوسری برائی جو اس زمانہ میں لبنانی متوسط خاندانوں میں بری طرح پھیلی ہوئی تھی۔ وہ تھی لڑکیوں کی بغیر ان کی مرضی کے بے جوڑ شادی، جس سے نہ معلوم کتنے خاندان تباہ ہوئے اور کتنے معصوم اور بے گناہ بچے ماں باپ کے جیتے جی یتیم ہو گئے۔ جبران نے اس زخم پر بہت تیز نشتر لگائے ہیں

آئیے اب جبران کی کہانیوں پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ ان کا انداز فکر، طرز نگارش اور مرکزی خیال کیا ہے اور کہاں تک وہ ان میں کامیاب ہو سکے ہیں۔

جبران نے سب سے زیادہ لڑکی سے بغیر پوچھے اور اس کی مرضی کے خلاف زبردستی شادی کر دینے پر قلم اٹھایا ہے اور اتنی شد و مد اور اپنے فن کی پوری قوت سے اس مسئلہ پر لکھا ہے کہ اس کی مثال کسی اور ادیب کے یہاں نہیں ملتی۔ اور یہ اس وجہ سے کہ وہ خود بھی اس برائی کے کشتہ ہیں۔ ان کو "سلمی کرامہ" سے شدید محبت تھی اور سلمی کو بھی ان سے شدید لگاؤ تھا۔ سلمی سے ان کی شادی کی بات چیت طے ہو چکی

---

[۱] مقدمہ میخائیل نعیمہ لمؤلفات جبران

تھی لیکن مطران نے سلمیٰ کو اپنے بھتیجے سے شادی کرنے پر مجبور کیا۔ جب کوئی چارہ نہ رہا تو سلمیٰ نے شادی کر لی لیکن اس غم میں جان جان آفریں کے حوالے کر دی۔ اس واقعہ کی چوٹ جبران کے دل پر اتنی کاری لگی کہ ساری عمر اس سے خون رستا رہا اور ان کی کہانیوں کی شکل میں دنیا کے سامنے اس ظلم وجور کی خون چکاں کہانی کو دہراتا رہا۔ اس کی بہترین مثال ان کی کہانی "وردۃ الہانی" "مضجع العروس" اور "مرتا البانیہ" ہیں۔[1]

ان کہانیوں میں انھوں نے جبری شادی اور اس کے مہلک انجام پر بڑے درد اور تاثر سے قلم اٹھایا ہے اور چونکہ خود اس مہلک بیماری کا شکار ہیں اس لئے جو کچھ لکھا ہے حقیقت میں ڈوب کر اور کرب والم کی ایسی آمیزش کے ساتھ کہ سنگدل سے سنگدل آدمی کی آنکھوں میں بھی آنسو آجاتے ہیں اسی طرح نوجوانوں کی اخلاقی پستی اور کم ہمتی کو بھی بڑے پراثر انداز سے نمایاں کیا ہے جو سادہ لوح سیدھی سادی لڑکیوں سے محبت وعشق کی پینگ بڑھا کر اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد انھیں بے عزتی، بدنامی اور گمنامی کے تاریک گڑھے میں ڈال کر کس مپرسی کے عالم میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ ان کی کہانی "مرتا البانیۃ" اس خیال کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

"وردۃ الہانی"[2] میں جبران نے جبری شادی کی برائی اور اس کے انجام پر بڑے موثر طریقے سے قلم اٹھایا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک دوشیزہ کی شادی ۱۸ سال کی عمر میں گھر والے ایک بوڑھے رئیس سے کر دیتے ہیں۔ بوڑھا شوہر نوجوان بیوی کے دل کو موہ لینے کے لئے اسے گہنوں اور زیورات سے لاد دیتا ہے کمخواب و دیبا میں لپیٹ دیتا ہے۔ گلے کلائی کو مرصع زیورات اور سر کو ہیرے جواہرات کے تاج سے مزین کر دیتا ہے۔ ناز ونعم کا ہر سامان اس کے قدموں پر لا کر ڈھیر کر دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود نوجوان بیوی کا دل اس کی طرف مائل نہیں ہو پاتا۔ وہ اپنے آپ کو ایک چڑیا کی طرح محسوس کرتی ہے جسے سونے کے پنجرے میں قید کر دیا گیا ہے ... اور ایک دن وہ اپنے خواب غفلت سے جاگتی

۱۔ جورج صدح: أدبناء أدباء نا فی المھاجر الامیرکیۃ

۲۔ مجموعۃ الارواح المتردۃ

لیکن اس شکوہ اور اس پکار میں جبران نے اپنی پوری فنی صلاحیت اپنا بھرپور جوش، اپنا حسین پیرایہ بیان، اپنا پرزور قلم اور دل دردمند کا پورا خلوص سمو دیا ہے[1]"۔

اس کہانی کے لکھنے سے جبران کا مقصد یہ ہے کہ وہ قاری کے سامنے ازدواجی تعلقات سے متعلق اپنی رائے پوری وضاحت اور صفائی سے پیش کریں اور یہ بتائیں کہ معاشرہ میں جبری شادی کی جو خرابی پیدا ہوگئی ہے اس کا انجام کتنا ہولناک اور ہوشربا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی اس رائے کا اظہار "وردۃ الہانی" کی زبان سے جو طویل خطبہ دلایا ہے (وردۃ الہانی اپنا سارا قصہ کہانی کے راوی سے اپنی زبان سے بیان کرتی ہے) اس طرح کرتے ہیں:

"یہ مرد جو عالم ابدی سے آتے ہیں اور پھر اس میں زندگی کا حقیقی مزہ چکھنے سے پہلے واپس چلے جاتے ہیں اس عورت کے دل کا درد اور اندوہ نہانی سمجھ ہی نہیں سکتے جسے وہ اس وقت محسوس کرتی ہے جب اپنے آپ کو دو مردوں کے درمیان پاتی ہے۔ ایک تو وہ جسے وہ آسمان کی مرضی اور اس کے ایما سے چاہتی ہے اور دوسرا وہ جس سے وہ زمینی شریعت کے مطابق صرف چپکا دی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی دردناک کہانی ہے جو عورت کے خون اور آنسوؤں سے لکھی گئی ہے۔ مرد اسے ہنستے ہوئے پڑھتا ہے اس لئے کہ وہ اسے سمجھتا ہی نہیں اور اگر سمجھ گیا تو اس کا قہقہہ بیہودگی (فجور) اور سنگدلی میں بدل جاتا ہے اور اپنے غیظ و غضب کا اظہار عورت کے سر پر آگ اور گندھک برسا کر کرتا ہے اور اس کے کانوں کو لعنت و ملامت اور ڈانٹ پھٹکار سے بھر دیتا ہے[2]"۔

بلاشبہ جبران اپنی اس کہانی کے ذریعہ اپنے مرکزی خیال کو بیان کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوگئے ہیں۔ انھوں نے اس ظلم کے خلاف قاری کے دل میں غم و غصہ اور انقلاب لانے کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔

۱۔ مقدمہ میخائیل نعیمہ مؤلفات جبران

۲۔ مجموعۃ الارواح المتمردۃ ص ۲۶ الطبعۃ الثانیۃ ۱۹۲۲ مطبوعہ المطبعۃ الرحمانیۃ۔ مصر

لیکن ایک دوسری برائی کا دروازہ بھی کھول دیا ہے جو اگر بند نہ ہو تو پھر معاشرہ صرف حسب دل خواہ جنسی لذت اندوزی کا گہوارہ بن جائے وہ یہ کہ شادی اگر اپنی مرضی سے نہیں ہوتی ہے تو پھر عورت کو یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ معاشرہ، دین اور رسم و رواج کے سارے بندھنوں کو توڑ کر جس سے اس کا دل اٹکے اسی سے لٹک جائے۔

جبران نے اس کہانی میں بھی اور اس قسم کی دوسری کہانیوں میں بھی جس شادی کا ذکر کیا ہے وہ عام طور سے عیسائی طریقے پر کی ہوئی شادی ہے جو ایک مرتبہ ہو جانے کے بعد نہیں ٹوٹ سکتی۔ کیونکہ حضرت مسیح کا قول ہے اور اسی پر عام مسیحیوں کا اعتقاد اور عمل ہے کہ

"جس شادی کو اللہ نے گانٹھ دیا اسے پھر کوئی انسان نہیں توڑ سکتا۔"

مگر یہ برائی اسلامی معاشرہ میں نہیں ہے۔ مسلمانوں کے یہاں یہ تصور نہیں ہے کہ جس شادی کو قاضی نے کرا دیا وہ رہتی عمر تک نہیں ٹوٹ سکتی بلکہ اسلام نے چند شرائط کے ساتھ عورت کو بھی حق خلع دیا ہے اور وہ ان اسباب کو دکھا کر قاضی سے خلع کرانے کی درخواست کر سکتی ہے اور اسے اس کی ضرورت نہیں پیش آئے گی کہ وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر وردہ کی طرح کسی دوسرے کے ساتھ ناجائز طریقے پر رہنے لگے اور بیسوا اور خائنہ کا لقب پائے۔ اس نقطۂ نگاہ سے اگر آپ اس کہانی پر نظر ڈالیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ کہانی کا دائرہ بہت محدود ہو گیا ہے۔ یعنی یہ بات صرف مذہب عیسوی کے ایک خاص طبقہ پر صادق آ سکتی ہے۔ عام روشن خیال عیسائیوں اور مسلمان گھرانوں میں اس قسم کے واقعات بالکل نہیں پیش آ سکتے کیونکہ اس قسم کی لڑکیوں کے لئے عدالت کے دروازے ہمیشہ سے کھلے ہوئے ہیں۔ جہاں "غیر کفو" یا "ناقابل زندگی" کے لائق نہ ہونے کی صورت میں عورت کے حق میں فیصلے ہوتے رہتے ہیں اور زن و شو میں قانوناً علیحدگی کر دی جاتی ہے۔ اسی لئے عربوں میں عام ہندوستانیوں کے مقابلہ میں طلاق کے واقعات زیادہ پائے جاتے ہیں اور اب اس کو ہندوستان کے برخلاف برا بھی نہیں سمجھا جاتا۔ اس اعتبار سے جبران کی یہ کہانی اس آفاقیت کو کھو دیتی ہے جو کہانی کو حیات جاودان بخشتی ہے۔

امین الغریب نے کہا ہے کہ "اس عورت کو خائنہ اور فاجرہ وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جو

اپنی خواہش نفسانی کو بجھانے کے لئے سادہ لوح گاؤں کی لڑکیوں کو دھوکہ دے کر شہر کی چمکتی دمکتی زندگی اور اس کی لذت کوشیوں کا لالچ دلا کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور جانوروں کی طرح اپنی ہوس کی آگ بجھاتے ہیں اور جب مئے شباب کا ایک ایک قطرہ چوس لیتے ہیں تو انھیں بیکس ولاچار گندی گلیوں میں چھوڑ کر کسی دوسرے شکار کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ اس ظلم کے خلاف جبران جو کچھ خود کہنا چاہتے تھے اسے انھوں نے مرتا کی زبان سے کہلوانے کی کوشش کی ہے۔ کہانی بہت اثر انگیز اور پر درد ہے۔ اس میں ایک مظلوم عورت کے درد کی پکار، اس کے زخموں کی کسک اور کس مپرسی اور بیچارگی کی آہ و فغاں ہے۔

یہ کہانی بھی جبران کے اسلوب اور فن کی ایک زندہ مثال ہے۔ کہانی صرف تین کرداروں کے گرد گھومتی ہے اور تینوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعات اور حوادث کے منطقی نتیجہ کے طور پر اپنے رول نہیں ادا کر رہے ہیں بلکہ ان سے جبران اپنی مرضی اور خیالات کے مطابق رول ادا کرا رہے ہیں۔ جس کا نتیجہ بقول سعد صائب یہ ہے کہ

> "اس کہانی میں مرکزی خیال اس کپڑے سے کہیں بڑا ہے جو اسے جبران نے پہنایا ہے اور جس شکل میں یہ ظاہر ہوا ہے کیونکہ یہ خیال زیادہ تر کرداروں کے اقوال اور خطبات میں اِدھر اُدھر جھانکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ان کے اعمال اور انفعال سے کم ظاہر ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہانی نگار واقعات کے بیان کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ اسے اس کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے کہ جا بجا واقعات اور حوادث پر اظہار رائے بھی کرتا جائے۔ گویا کہ کہانی کے کردار اس کے ہاتھ میں گڑیوں کی طرح ہیں جنھیں وہ جہاں اور جیسا چاہتا ہے گھماتا ہے اور جو کچھ کہنا چاہتا ہے ان کی زبان سے ادا کراتا ہے[۱]۔"

کہانی اگرچہ بہت مؤثر اور المناک ہے لیکن اگر اس پر واقعاتی نقطہ نظر سے غور کیا جائے تو بہت ڈھیلی ڈھالی اور کمزور اور حقیقی زندگی سے بہت دور دکھائی دے گی۔ بھلا یہ ممکن ہے کہ گاؤں کی ایک سیدھی سادی

۱۔ سعد صائب ۔ الادیب ماہ نومبر ۱۹۶۲ء

لڑکی ایک گھوڑ سوار کے ساتھ جسے کبھی اس نے نہ دیکھا جس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتی ایک لامعلوم دنیا کی طرف بغیر سوچے سمجھے چل دے اور پھر بیروت پہنچ کر اپنے آپ کو اس کی ہوس رانیوں اور جنسی لذت کوشیوں کے حوالے کر دے۔ یہاں تک کہ اس کا نتیجہ ایک بچے کی شکل میں بھی ظاہر ہو جائے اور اچانک وہ اسے چھوڑ کر چل دے اور وہ داد و فریاد بھی نہ کر سکے۔ نہ آس پاس کے لوگ اور پڑوسی ہی اس حرکت کے خلاف آواز اٹھائیں بلکہ سارے واقعات اس طرح ہوتے رہیں کہ جیسے ملک میں نہ کوئی قانون ہے نہ کوئی اخلاقی ضابطے اور نہ معاشرہ میں کوئی اصول ہے۔ بات یہ نہیں ہے کہ ملک میں کوئی قانون نہیں ہے اور نہ کوئی اخلاقی ضابطہ، اور نہ یہ کہ ایسے واقعات ہوتے نہیں ہیں۔ ہوتے ضرور ہیں لیکن اس کے کچھ منطقی نتیجے ہوتے ہیں۔ واقعات اور حوادث کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ قدرتی طور پر کہانی اپنے مقصد کی طرف فطری طور سے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ہر واقعہ اور ہر موڑ اپنی جگہ انگوٹھی میں نگینہ کی طرح جڑا معلوم ہوتا ہے اور اس سے دل پر جو اثر ہوتا ہے وہ کبھی نہیں مٹتا۔ جبران کے یہاں یہ بات مفقود ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک مخصوص حادثہ اپنی ایک خاص رائے کو ظاہر کرنے کے لئے یا کسی خاص بات کو کہنے کے لئے گڑھا ہے۔ کرداروں کے اعمال کے فطری اور منطقی نتیجہ کے طور پر یہ واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔ پانچ سال گزارنے کے بعد جبران کو اس لڑکی کا معلوم "انجام" جاننا ہے۔ ظاہر ہے اس کے لئے انھیں مرتا کے پانچ سالہ لڑکے کو پھول فروش بنانا پڑا اور سارے بازار سے گھمانے پھرانے کے بعد اسے قصہ کے راوی کے پاس لانا پڑا اور اس کے منہ سے مرتا کا نام کہلوا کر راوی کو مرتا تک لے جا کر دل میں غم و غصہ کی جو چنگاریاں سلگ رہی ہیں انھیں مرتا کے منہ سے کہلوانا پڑا۔ مرتا بھی اپنی کہانی ایک واعظ کی طرح شروع کرتی ہے اور کہانی ختم ہوتے ہی اس کی نبض کی بھی آخری سانسیں چھوٹ جاتی ہیں۔ کہانی فنی نقطۂ نظر سے اتنی کمزور ہے کہ اگر آپ کرداروں کو نکال دیں اور کہانی کے جملوں کو جوڑ دیں تو ایک بہت بلیغ خطبہ بن جائے گی کہانی نہ رہے گی۔ اس لئے کہ افسانہ میں جان کرداروں اور ان کے اعمال سے نہیں بلکہ جبران کے سیال قلم اور آتشیں افکار نے ڈالی ہے اور یہ قلم اور یہ افکار اتنے جاندار اور موثر ہیں کہ انسان کے دل پر اپنی چھاپ چھوڑے بغیر نہیں رہتے۔ یہ اور بات ہے کہ اگر اس چھاپ پر اس سے تیز رنگ کی

[illegible]

ہے۔ چنانچہ وہ اسے باغ میں بلواتی ہے اور اس سے معذرت کرتی ہے کہ میں یہ سمجھ رہی تھی کہ تم نے اب مجھ کو چاہنا چھوڑ دیا ہے اس لیۓ میں یہ شادی کر بیٹھی۔ اب تم مجھے معاف کرو۔ ظاہر ہے وہ اس کا یہ گناہ معاف نہیں کرتا اور اس پر وہ اس کے پہلے چھرا گھونپ دیتی ہے اور پھر خود بھی چھرا گھونپ کر مر جاتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب اسے خبر دی گئی کہ ایم اب تم کو نہیں چاہتا ہے تو کیا وہ اس سے اس خبر کی تصدیق نہیں کر سکتی تھی اور خاص طور سے جب اس کے پاس اس کی ایک بہت امین بھروسہ کے قابل اور محرم راز سہیلی سوسن بھی ہے۔ پھر جس طرح وہ جشن شادی میں شریک ہوتی ہے اگرچہ بے حس طرح شادی و تقریب بے جان سی شکل میں شادی کرانے آتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس شادی کو برضا و رغبت کر رہی ہے کیونکہ اتنی بڑی اور بظاہر اتنی بہادر اور فلسفی لڑکی کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔ شادی کی دعوت میں یک بیک اس کی نظر اپنے محبوب پر پڑ جاتی ہے اور یکا یک اس کی ساری محبت ایک انگڑائی لے کر جاگ اٹھتی ہے اور وہ سب کچھ ہوتا ہے جو کہانی میں دکھایا گیا ہے اور جو واقعاتی اعتبار سے مبالغہ پر مبنی ہے۔ امین الغریب نے لکھا ہے کہ[1]

"ایک پادری نے جب یہ قصہ پڑھا تو کہا کہ اس میں محض مبالغہ آرائی ہے۔ میں نے کہا کہ وہ کیسے؟ تو کاہن نے کہا کہ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی پادری ایک لڑکی کو شادی کے رشتے میں بغیر اس کی مرضی معلوم کئے اور پوری طرح اطمینان کئے ہوئے باندھ دے گا۔ ہم نے کہا کہ گستاخی معاف ہو مقدس باپ ..... ہمارا تو یقین ہے کہ اس وقت لڑکی جو کچھ بھی کہتی ہے اس کے دل کی آواز کی آواز نہیں ہوتی کیونکہ رسم و رواج اور کبھی ان کا خوف دامن گیر ہوتا ہے۔"

یہ بات ایک حد تک صحیح ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ عام طور سے ایسی لڑکیاں کسی کو دل نہیں دیئے ہوتی ہیں اسی وجہ سے جس سے باندھ دی جائیں نباہ بھی کر لیتی ہیں اور جگ ہنسائی اور تھکا فضیحتی نہیں کرتیں جو جبران کی لڑکی نے کی ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر کا یہ واقعہ ہے اور اس زمانے میں جب ان کی لڑکی

۱۔ مقدمۃ "الارواح المتردۃ"

بہادر اور اتنی چرب زبان اتنی بڑی فلسفی اور عالم ہے کہ اس کے سامنے بڑے بڑے بہادر لوگوں کو بھی آنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اور دوسری طرف اتنی بیوقوف اتنی سادہ لوح اور شکی مزاج ہے، کہ صرف سنی سنائی بات پر دوسرے آدمی سے محض اپنے محبوب سے انتقام لینے کی خاطر یا اسے جلانے کے لئے شادی رچارہی ہے، اور اس خبر کی تصدیق تک نہیں کرتی۔ اس جیسی لڑکی سے اس کی بھی توقع بے جا نہیں ہے کہ وہ خود ہی سلیم کے پاس نجیب کو لے کر جاتی اور بنفس نفیس ساری بات کی تحقیق کرتی۔ مگر جبران نے اسے یہ کام نہیں کرنے دیا اس لئے کہ پھر غلط فہمی دور ہو جاتی اور کہانی کی تان جہاں جبران توڑنا چاہتے تھے نہ توڑ سکتے۔ درحقیقت جبران اپنی کہانیوں میں واقعاتی تسلسل اور حقیقت سے ان کے تعلق کی طرف کم توجہ دیتے ہیں بلکہ ان کی کوشش یہی ہے کہ اپنے خیالات وافکار کو کرداروں کے منہ سے خواہ حقیقت پر مبنی ہوں یا نہ ہوں ادا کرادیں۔ اس لئے جب کہانی پڑھ چکیے تو یہ زبان سے کم ہی نکلتا ہے کہ ایسا واقعہ ابھی تو فلاں جگہ پیش آیا تھا۔ یا ہمارے جاننے والوں میں ایک آدمی کے یہاں بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔ رہ گیا جبران کا یہ کہنا کہ اس کہانی کو ایک خاتون نے انھیں سنایا تھا اور وہ خود بھی اس لڑکی کی عزیز تھیں تو اس سے زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس قسم کا ایک واقعہ ہوا لیکن کیا ایسے واقعات معاشرہ میں عام طور سے آئے دن ہوتے رہتے ہیں؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہے۔ یہ واقعہ ایک خاص واقعہ ہے جو ایک دفعہ ہو گیا اس شاذ و نادر واقعہ پر تو آپ کہانی کی بنیاد نہیں رکھ سکتے ورنہ پھر کہانی اپنی آفاقیت یا شمولیت کھو دے گی۔

ان اجتماعی موضوعات کے علاوہ جبران نے ارباب حکومت، کلیسا اور پادریوں کے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اس قسم کی کہانیوں کا اسٹیج بھی شمالی لبنان کے گاؤں یا قصبے ہیں کیونکہ بقول جبران:

"ابتدائے آفرینش سے آج تک یہی ہوا ہے کہ موروثی شرافت پر قابض لوگ عوام کے خلاف کاہنوں اور دینی پروہتوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کئے رہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی بیماری ہے جو بنی نوع انسان کی گردن کو اپنے چنگل میں پھنسائے ہوئے ہے۔ اور اس وقت تک اس سے پیچھا نہیں چھوٹ سکتا جب تک اس دنیا سے جہالت اور غباوت کا خاتمہ نہ ہوجائے اور جب تک ہر مرد کی عقل بادشاہ اور ہر عورت کا دل کاہن (پادری) نہ ہوجائے۔"

یہ اس لئے کہ "موروثی شرافت" کا مالک اپنا محل کمزور غریبوں کے جسموں پر کھڑا کرتا ہے اور پادری گرجا کی قربان گاہ مطیع و فرماں بردار مومنوں کی قبروں پر بناتا ہے...... والی شہر بیکس کسان کے بازوؤں کو اپنے قبضہ میں کئے رہتا ہے اور پادری اپنا ہاتھ اس کی جیب میں دیئے رہتا ہے مالک کھیت کے سپوتوں کی طرف تیوری پر بل ڈال کر دیکھتا ہے اور پیروہت ہنستے ہوئے ان سے چمٹا رہتا ہے اور چیتے کی چڑھی ہوئی تیوری (عبوست) اور بھیڑیے کی مسکراہٹ کے درمیان بکریوں کا گلہ ختم ہو جاتا ہے۔ حاکم شریعت پر عمل پیرا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور پادری دین کی اطاعت کا اور ان دونوں کے درمیان جسم فنا ہو جاتے ہیں اور روحیں (تعفن) گھلتی رہتی ہیں۔"

"اور لبنان میں جو ایسا پہاڑ ہے جہاں سورج کی کرنوں کی روشنی کی بہتات ہے لیکن جہاں علم و معرفت کی روشنی کی کمی ہے۔ شریف اور پادری نے اس غریب و لاچار کسان کے خلاف گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ جو زمین کو جوتتا ہے اور اس سے غلہ پیدا کرتا ہے بالکل اس طرح جس طرح وہ اپنے جسم کو اول الذکر کی (حاکم) تلوار اور ثانی الذکر (پادری) کی لعنت سے بچاتا ہے۔"

"موروثی شرافت" کا مالک لبنان میں اپنے محل کے سامنے کھڑے ہو کر لبنانیوں سے چلا کر کہتا ہے کہ "سلطان نے مجھے تمہارے جسموں کا مالک بنایا ہے" اور پادری قربان گاہ کے سامنے کھڑے ہو کر ندا دیتا ہے کہ "اللہ نے مجھے تمہاری روحوں کا والی بنایا ہے" مگر لبنانی اپنے منہ پر تالہ لگائے ہوئے چپ چاپ سب کچھ سن لیتے ہیں کیونکہ جن دلوں پر گرد کی تہ جم گئی ہو وہ ٹوٹتے نہیں کیونکہ مردے روتے نہیں۔[1]"

یہ ہے وہ پس منظر جس میں جبران نے حاکموں اور دینی رہنماؤں کی برائیوں، ان کے ظلم و استبداد کے قصوں، ان کی بے رحمیوں، لاقانونی حرکتوں اور من مانی کارروائیوں کا پردہ فاش کیا ہے اور **لبنانیوں کی بیچارگی، مجبوری، جہالت اور فقر و فاقہ کا نقشہ بہت دردناک اور موثر انداز میں کھینچا**

1۔ مجموعۃ الارواح المتمردۃ ۔ کہانی ۔ خلیل الکافر

ہے۔ [illegible] ساتھ ہی اس دین کے خلاف جو انسان کی مجبوری اور اس کی کس مپرسی پر رحم نہ کرے اور اس حاکم کے خلاف جو رعایا کے فقر و فاقہ اور ان کی تنگ دستی کا علاج نہ کرے علم بغاوت بلند کرنے کی بالواسطہ تلقین کی ہے [illegible] یہ [illegible] ممکن نہیں جب تک زمانہ نہیں بد[illegible]

علم و حکمت کی روشنی [illegible] نور جلوہ گر نہیں [illegible]

[illegible] میں سب سے زیادہ موثر اور دردناک دو کہانیاں ہیں۔ ایک یوحنا [illegible] ۔ ایک تیسری کہانی بھی ہے جو بادشاہوں اور دینی پیشواؤں کے عدل و انصاف [illegible] ہے اور وہ کہانی ہے "صراخ القبور" جس کا ماحصل یہ [illegible] چوپٹ راجا کے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا"۔

یوحنا المجنون میں جبران نے ایک چرواہے کا قصہ لکھا ہے جس کا نام یوحنا ہے۔ اس کی جوانی کی آنکھیں گائے بیل چرانے [illegible] سے چھپ کر چپکے سے انجیل پڑھتے کھلیں۔ اور اس طرح اس نے زندگی اور زندگی [illegible] تعلیمات کو اچھی طرح سمجھا اور عزم کیا کہ انھیں اپنی زندگی میں خود برتے گا اور جو لوگ صرف زبان سے [illegible] کو اپنانے کی ضرورت پر، ان کی حقانیت اور افادیت پر لکچر دیتے [illegible] بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند" ان کے مکر و فریب کا پردہ چاک کرے گا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ وہ حسب معمول اپنے جانور چرانے کے لیے جاتا ہے، چراگاہ پہنچ کر جانور چرنے چگنے میں لگ گئے اور یوحنا اپنی دنیا میں کھو گیا۔ جانور چرتے چرتے قریب کے گرجا کے کھیتوں میں جا پہنچے [illegible] پادریوں نے انھیں پکڑ کر بند کر لیا۔ جب یوحنا اپنی خیالی دنیا سے چونکا اور جانوروں کی طرف نظر ڈالی تو اندازہ ہوا کہ جانور تو بہت کم ہو گئے ہیں چنانچہ وہ انھیں ڈھونڈھتا گرجے جا پہنچتا ہے اور پادریوں سے بڑی لجاجت اور شرمساری سے درخواست کرتا ہے کہ پہلی دفعہ یہ غلطی ہوئی ہے آپ [illegible]

۱۔ مجموعۃ الارواح المتمردۃ

[illegible] الارواح المتمردۃ : یوحنا المجنون

[illegible]س کے جانوروں کو چھوڑ دیں۔ پھر وہ کبھی بھی انہیں لے کر اس علاقہ میں نہ آئے گا۔ مگر پادری بغیر تاوان
[illegible] چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے ہیں۔ کچھ کنیز میں اور گرجے کے پر[illegible]
[illegible]سے تاوان دینے کے لئے مجبور کرنے لگتے ہیں لیکن اس کے پاس تاوان دینے کے لئے کچھ نہیں۔ چنانچہ آپ
[illegible] آنکھ ہے اور وہ انجیل[illegible] کے خلاف ایک لمبی چوڑی تقریر کرتا
[illegible]میں انہیں بڑی [illegible] اور انجیل مقدس کے ان اسباق و احکام کا ذکر کرتا ہے جن کا تعلق
[illegible] پر ہمارے اچھا اثر ہونے کے انہیں اس کی یہ باتیں زہر لگتی ہیں او
[illegible]ہیں بند کر دیتے ہیں۔ بیچاری ماں دوڑی ہوئی آتی ہے اور بیٹے کی طرف
[illegible] بغیر جرمانہ لئے چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے چنانچہ دکھیا ماں اپنا وہ ہار پادری
[illegible] اس کی ماں نے شادی میں اسے دیا تھا اور اس طرح یوحنا کو پادریوں کی قید سے
چھڑا کر [illegible] قربان گاہ کے افتتاح کی تقریب ہوتی ہے۔ وہاں سارے
گاؤں کے [illegible] دیہاتوں کے رہنے والے جمع ہیں اس تقریب کے خاتمہ پر یوحنا پھر ایک
[illegible] کی [illegible]، دنیا طلبی، حرص و ہوس کا پردہ فاش کرتا ہے۔ چنانچہ
[illegible] ہیں اور اس وقت تک اسے نہیں چھوڑتے جب تک اس کا بوڑھا باپ آکر
[illegible] کس بیری کا واسطہ دے کر اس کا اقرار نہیں کرتا کہ یوحنا پاگل ہے۔ وہ ہمیشہ سے ایسی
[illegible] ہے۔ چنانچہ بڑی مشکل سے پادریوں کو اس کے دماغ خراب ہونے کا یقین ہوتا ہے۔
[illegible] دیتے ہیں اور یہ مشہور کر دیتے ہیں کہ یوحنا پاگل ہے۔ اس کی باتوں میں کوئی نہ آئے مگر
یوحنا اپنی [illegible]م، استقلال سے جما رہتا ہے۔ وہ ان کے تقدس اور مذہب کے [illegible]
زرگری کی مذمت سے باز نہیں آتا لیکن اس کی بات اب سننے والا کوئی نہیں۔ دیوانوں کی یاد گوئی تو
کون [illegible] کا احساس ہو جاتا ہے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ

[illegible] زیادہ ہوا اور میں تنہا ہوں اس لئے میرے متعلق جرچ میں آئے کہو اور میرے ساتھ
[illegible]۔ کیونکہ بھیڑیے بکریوں کو رات کی تاریکی میں پھاڑ دیتے ہیں لیکن ان کے خون کے

فشانات وادی کے سنگریزوں پر باقی رہ جاتے ہیں یہاں تک کہ سپیدۂ صبح نمودار ہوتا ہے اور سورج پہاڑ [illegible] سے طلوع ہو جاتا ہے۔"

[illegible] یہیں پر کہانی ختم ہوتی ہے۔

[illegible] اس کہانی میں جبران نے عیسوی مذہب کے ٹھیکہ داروں کے مکر و فریب اور دین کے نام پر [illegible] غارت گری کو واقعاتی روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح پادریوں کے خلاف جبران [illegible] کے دل میں [illegible] کی جو آگ بھڑک رہی ہے اسے اپنے [illegible] سے دوسروں کے سینوں میں منتقل کرنے کی [illegible] ان کے مکر و فن سے بچے رہیں اور ان کے بظاہر لاہوتی لیکن بباطن طاغوتی ہاتھوں [illegible] نہ کر سکیں لیکن بقول محمد یوسف نجم[۱]:

"کہانی کرداروں اور واقعات میں ہم آہنگی اور ربط پیدا کرنے میں یکسر ناکام ہے۔ کہاں ایک [illegible] جاہل اور کہاں فصیح و بلیغ حکمت و موعظت سے لبریز دو تقریریں۔ کہاں کوہستان کا یہ سیدھا سادا نوجوان کہاں اس کی تقریر کی وہ گہرائی اور فلسفہ کی وہ دقیق باتیں۔"

درحقیقت یوحنا کے منہ سے جبران [illegible] رہے ہیں اور اس طرح بول رہے ہیں کہ صاف پتہ چلتا ہے کہ "زبان غیر سے فریاد میری" پھر کہانی اپنی جگہ پر بہت کمزور اور بے جان ہے اور پڑھنے والا آسانی سے سمجھ جاتا ہے کہ یہ کہانی جبران نے صرف اس لئے گڑھی ہے کہ پادریوں اور کلیسا کے خلاف ان کے دل میں جو پھپھولے پڑ گئے ہیں انہیں صرف پھوڑنے پر اکتفا کریں۔ حقیقی زندگی سے شاید ان واقعات کا تعلق کم ہے۔

جبران نے کلیسا اور اہل کلیسا کی ظلم و زیادتی کی داستان ایک اور کہانی "خلیل الکافر"[۲] میں بھی بیان کی ہے اور ساتھ ہی حکومت کے ذمہ داروں کی چیرہ دستیوں اور خود فریبیوں کے ماتحت اہل کلیسا سے گٹھ جوڑ کرکے کسانوں پر ظلم و ستم ڈھانے کے واقعات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

۱۔ یوسف نجم: القصہ فی الادب العربی   ۲۔ مجموعۃ الارواح المتمردۃ

"خلیل الکافر میں واقعات کا منطقی تسلسل بالکل مفقود ہے [illegible] یوحنا کی طرح ایک چرواہا [illegible]
[illegible] یہ ہے کہ خلیل گرجا گ[illegible] [illegible]تا ہے اور یوحنا اپنے ماں باپ کے جانوروں کا۔ یوحنا بھی چھپکے
[illegible] ایک تلاوت کر کے حقیقت تک پہنچتا ہے اور خلیل بھی۔ یوحنا تو کسی حد تک موقعہ سے فائدہ اٹھا کر ارباب کلیسا
کی بداعمالیوں کے خلاف اپنی دونوں تقریریں کرتا ہے لیکن خلیل تو حقیقت ابدی کو انجیل کے ذریعہ معلوم کرنے
کے بعد ایک دن بغیر کسی [illegible] (عرفان حقیقت نے تبلیغ کا جذبہ شدید اس کے دل میں
پیدا کر دیا تھا) پادریوں کے سامنے جا کر ایک لمبی چوڑی تقریر شروع کر دیتا ہے جس میں ان کی زندگی سے
[illegible]ت اور دجل وفریب کا پردہ فاش کر کے رکھ دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ماہ کے لئے
گرجے کے قید خانہ میں قید کر دیا جاتا ہے لیکن جب قید سے نکلتا ہے تو پھر وہ ایک ایسے موقعہ سے جو کسی طرح
[illegible] کے خلاف تقریر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس
تیرہ [illegible] میں جس میں شدید برف باری ہو رہی تھی طوفانی ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے، سردی سے
[illegible] گرجے سے نکال دیا جاتا ہے اور وہ جب بے ہوش ہو کر گر جاتا ہے تو ایک بیوہ
[illegible]اس کی جوان لڑکی اسے اپنے گھر میں پناہ دیتی ہیں اور تیمارداری کرتی ہیں۔ جس کا اعتراف وہ اس فلسفیانہ
[illegible] کہتا ہے "لیکن تند و تیز ہواؤں اور برف کے ڈھیروں کے پیچھے تاریکیوں اور کالے بادلوں
کے پرے چاند ستاروں کی دنیا سے بھی دور غرض کائنات اور موجودات کی ہر چیز کے ماورا ایک طاقت
کارفرما ہے جو سراسر علم ومعرفت اور رحم وکرم ہے۔ اس طاقت نے میری چیخ وپکار سن لی۔ اس نے یہ نہ چاہا
کہ میں [illegible] بستہ میں سے جو کچھ بیچ رہا ہے انھیں جانے بغیر مر جاؤں۔ اس لئے اس نے تم دونوں
کو میرے پاس بھیج دیا کہ تم دونوں مجھے موت اور قبر کی بے پناہ گہرائیوں سے نکال کر زندگی کی کارگاہ میں
[illegible] آؤ۔"

اس طرح خلیل دونوں عورتوں کی تیمارداری اور دلسوزی کی بدولت اچھا ہو کر کارگاہ حیات

۱۔ الارواح المتمردة

میں دوبارہ داخل ہوجاتا ہے لیکن شیخ عباس کی [illegible] جو اس علاقہ کا حاکم ہے اس پر پادریوں کی نافرمانی اور کلیسا کی بے حرمتی کرنے کے جرم میں مقدمہ چلتا ہے۔ [illegible] تو شیخ عباس [illegible] کہتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی صفائی میں ایک لمبی چوڑی تقریر کرتا ہے جو کتاب کے [illegible] پر مشتمل ہے۔ تقریر میں عیسوی مذہب کے صحیح خدوخال کو پیش کرنے کی [illegible] [illegible] اور دینی رہناؤں کے ظلم وزیادتی مکروفریب کا پردہ پورے جوش اور جرأت سے فاش کرتا ہے پھر عام لوگ جو اس مقدمہ کو دیکھنے کے لئے جمع ہوئے ہیں ان سے مخاطب ہوکر ان کو اس [illegible] کی زندگی گزارنے کے خلاف ابھارتا ہے۔ اس کی تقریر کا یہ اثر ہوتا ہے کہ "جب شیخ عباس خلیل کی باتوں کی تاب نہ لاکر اپنی تلوار سونت کر اس پر جھپٹتا ہے تو تماشائیوں میں سے ایک تنومند [illegible] کر اس کی تلوار کو پکڑ لیتا ہے اور کہتا ہے کہ "جناب والا اپنی تلوار میان میں کرلیجیے کیونکہ جو تلوار اٹھاتا ہے وہ اسی [illegible] سے ختم بھی ہوجاتا ہے"۔

خلیل کی موثر تقریر کا یہ اثر ہوتا ہے کہ سارا مجمع اور شیخ عباس کے سارے کارندے جو خلیل کو خود ہی پکڑ کر لائے تھے شیخ عباس اور پادری الیاس کے خلاف ہوجاتے ہیں۔ شیخ کے کارندے [illegible] سے دستبردار ہوجاتے ہیں اور اس قدر اشتعال پیدا ہوجاتا ہے کہ اس موقع پر ان دونوں کا قتل ہوجانا کوئی بعید بات نہیں دکھائی دیتی لیکن جبران اس پورے مجمع میں اتنی جرأت نہیں پیدا ہونے دیتے کہ وہ دونوں کو قتل کردے، پھر یہ سارا مجمع انتہائی طیش میں خلیل کے حکم سے اس گرجے میں پہنچتا ہے جہاں سے خلیل کو نکالا گیا تھا لیکن وہاں بھی بجائے اس کے کہ یہ مجمع پادریوں سے ان کے جرائم کی بازپرس کرے، خلیل کی ایک دوسری تقریر سننے میں مصروف ہوجاتا ہے جو اس موقعہ پر بالکل ٹھونسی ٹھانسی معلوم ہوتی [illegible] کے بعد انتہائی سکون سے خلیل مریم اور راحیل کے پیچھے ان کی جھونپڑی کی طرف چل [illegible] سب لوگ بھی اپنے اپنے گھروں کو چل دیتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ کسی [illegible] میں گئے تھے اور سیر وتفریح کے بعد گھر واپس آگئے "اور پھر دو ایک گھڑی بھی گذرنے نہیں پائی کہ جھونپڑیوں کے دیئے گل ہوگئے اور اطمینان وسکون نے اپنی چادر اس گاؤں پر پھیلادی اور خیالوں نے کسانوں کی روحوں

[illegible] اپنی گود میں لے لیا اور شیخ عباس کی روح کورات کے بھوتوں کے ساتھ جاگتی ہوئی چھوڑ دیا کہ اپنے گناہوں کے سامنے تڑپتی رہے اور اپنے خام خیالوں کے پنجے میں پڑی اُبھرتی رہے"۔ کہانی کی تان یہاں آکر ٹوٹتی ہے کہ شیخ عباس پاگل [illegible] اور خلیل کی شادی بیوہ کی لڑکی راحیل سے ہو جاتی ہے اور وہ اسی گاؤں میں رہنے لگتا [illegible] بغیر کسی قانونی چارہ جوئی کے گاؤں کی ساری زمین کسانوں کی ملکیت ہو جاتی [illegible] ندے ان سے کسی قسم کا ٹیکس وصول کرتے ہیں اور نہ ہی [illegible] یہاں غلہ کی وصولی کے لئے آتے ہیں اور "آج پچاس سال گزرنے کے بعد اگر کوئی ادھر سے [illegible] کوہستان کے [illegible] ایک خوبصورت شہر بسا ہوا ہے جو باغات اور ہرے بھرے کھیتوں [illegible]"۔ اور اس طرح بغیر کسی منطقی تسلسل اور واقعات کے فطری طریقے سے ظہور پذیر [illegible] ختم ہو جاتی ہے جو جبران کے کلیسا اور ارباب کلیسا پر شدید حملہ اور ان سے نفرت و کراہیت کی ایک زندہ مثال ہے۔

یوحنا المجنون اور خلیل الکافر میں بقول امین الغریب "صرف یہ فرق ہے کہ یوحنا ارباب کلیسا سے ہار مان کر مرگیا لیکن خلیل اپنے بیکس و لاچار اور خود غرض دشمنوں کے مقابلہ میں کامیاب ہو کر زندہ رہا۔ یوحنا کو اس بیماری جوئے کا احساس تھا جسے پادریوں اور پروہتوں نے غریب کسانوں [illegible] رکھا تھا۔ اس لئے اس نے اس کے خلاف پر زور درد بھری اور المناک آواز اٹھائی۔ مگر ان کی چیرہ دستیوں، جوڑ توڑ اور ہتھکنڈوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور آخر کار "پاگل" کا لقب پا کر مرگیا۔ مگر خلیل اپنی مدلل وزنی اور دل لگتی باتوں کے بل بوتے پر ججوں اور حاکموں کے سامنے کھڑے ہونے کی طاقت رکھتا تھا۔ پھر اس کے ہمنوا گاؤں کے لوگ اور کسانوں کی ایک اچھی خاصی جماعت تھی جو اس کی بات پر کان دھرتی تھی اور اپنے ساتھ کی گئی ناانصافی اور ظلم کو

[illegible] ارواح المتمردة ۔ قصہ خلیل الکافر

۲۔ مقدمہ الارواح المتمردة

محسوس کرکے اس سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی اس لیئے وہ لبنان کے دھانوں کے کھیت کے قریب
کے گاؤں میں ہنسی خوشی اور آرام وچین سے زندگی گزارتا رہا مگر یوحنا کا کوئی ساتھی نہ تھا۔ ماں باپ
[illegible] ہے کہ پادریوں کے مقابلہ میں آئیں کیونکہ
ان کا اور ان کے بیٹے کا کوئی ہمنوا نہ تھا کوئی ساتھی نہ تھا۔ لاچاری، کس پرسی اور تنگدستی آدمی
[illegible] کو حق کہلانے پر بسا اوقات مجبور کردیتی ہے اور یہی یوحنا کے ساتھ ہوا۔ غرض کہ جبران
کی تمام کہانیوں کا یہی رنگ ہے اور ان کے لکھنے کا یہی ڈھنگ۔ دراصل یہ طرز نگارش اس مکتب فکر کے
تمام ادباء کا مشترک اسلوب ہے۔ خواہ وہ جبران ہوں یا مصطفیٰ لطفی منفلوطی یا مصطفیٰ صادق الرافعی۔

میخائیل نعیمہ نے خلیل جبران کے اسلوب بیان اور فن افسانہ نگاری کے متعلق لکھا ہے:۔

"جبران اپنے قصوں میں ایسے واقعات اور ایسے کردار پیش کرتے ہیں جن میں فنی باریکی اور
واقعہ کی صحیح تصویر کشی ہمیشہ کم ہوتی ہے۔ ان واقعات اور کردار کو پیش کرنے کا مقصد
ان کے نزدیک یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کی مدد سے اپنے قلم کی جولانیاں دکھا سکیں اور انسانی
فطرت اور مختلف احساسات ومشاعر کے بیان کرنے میں اپنی فنی پختگی کا مظاہرہ کرسکیں۔
خاص طور سے رنج وغم، یاس حرمان کا عنصر غالب ہو یا جبران کے سہارے لوگوں کی سنگدلی تنگ
نظری اور بد اخلاقی کے متعلق تقریر دلپذیر کرسکیں یا محبت کے لطف، حسن کی چاشنی اور آزادی
کی قیمت کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرسکیں[۱]۔"

میخائیل نعیمہ جبران کے جگری دوست اور ان کے بڑے قدردان ہیں اور جدید ادباء میں جبرانیات
کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے جبران کی مختلف تصانیف پر بڑے فاضلانہ مقدمے لکھے ہیں اور
مندرجہ بالا اقتباس ان کے ایک مقدمے سے لیا گیا ہے جو انھوں نے مولفات جبران پر لکھا ہے نعیمہ
نے اپنے دوست کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے صاف اندازہ ہوجاتا ہے کہ جبران نے

---

[۱] مقدمہ میخائیل نعیمہ لو لفات جبران

سی، اجتماعی، دینی اور دنیوی مسائل پر کس انداز سے قلم اٹھایا ہے اور ان کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ اگر ہم
ن کی کتابوں کا مطالعہ بنائر نظر کریں تو ہمیں صاف دکھائی دے گا کہ جبران اور منفلوطی جتنا ک طرح
ایک ہی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ مسائل پر نظر ڈالنے کا کم وبیش وہی انداز ہے اور وہی اسلوب بیان وہی
پند ونصیحت ہے اور وہی مبالغہ آرائی۔ ... جبران چونکہ شاعر بھی ہیں اور بہت اچھے
مصور بھی اس لئے اپنی شاعری اور فن مصوری کے سہارے ... بعض خیالات کو اور خاص طور سے
قسم کے خیالات کو بیان کرنے میں بڑا معجز نما انداز بیان اختیار کر لیتے ہیں اور جو بھی واقعہ بیان کرتے
ہیں اس کی تعبیر کچھ ... لیتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مغربی ادب اور مغربی تہذیب وتمدن
سے ... میں رچ بس جانے کا موقعہ جبران کو ملا ہے منفلوطی کو نہیں مل سکا جس کا
نتیجہ یہ ہے کہ جبران کے یہاں منفلوطی کے مقابلہ میں وسعت نظر، گہرائی زور بیان اور اپنی بات پر یقین کامل
کا عنصر بہت زیادہ نمایاں ہے۔ جس کی وجہ سے بقول نعیمہ "ان کہانیوں میں ابدیت کی شان پیدا ہوگئی
ہے۔" اگرچہ میرے نزدیک انہوں نے اپنی وسعت نظری کی بنا پر مشرق کی بعض، قدار پر ایسی ضرب کاری
لگائی ... معاشرہ کی روح مجروح ہوگئی ہے بلکہ عربی رسم ورواج اور عربی
مالوفات اور بعض اخلاقی قدریں بھی بری طرح پامال ہوگئی ہیں۔ میرا اشارہ جبران کے اس خیال کی طرف
ہے کہ اگر لڑکی سے بغیر پوچھے اس کی شادی کر دی جائے اور وہ اپنے شوہر کو ناپسند کرتی ہو تو پھر دین،
معاشرہ، سماج اور خاندان کی عزت آبرو کو ملیامیٹ کر کے ناجائز طور پر کسی دوسرے کے ساتھ بندھ جانے
میں ... حالانکہ اس کا صحیح حل اول تو مذہب نے بھی دیا ہے۔ پھر عدالتوں کے
... گئے ہیں کہ اس ظلم کے خلاف چارہ جوئی کی جائے۔ اب رہ گیا زبان کا
... بعض جگہ بہت حسین اور پرکیف ہے۔ مگر بحیثیت مجموعی منفلوطی کی زبان
زیادہ سلیس ... دل آویز اور صرف ونحو اور اصول بلاغت کے اعتبار سے زیادہ صحیح وبلیغ ہے۔ اور یہ اس
وجہ سے ہے کہ بقول ... منفلوطی فطرتاً اور طبیعتاً ادیب پیدا ہوئے ہیں ان کا فن کسبی
نہیں بلکہ موہوبی ہے۔ کیونکہ کسب سے اچھوتا اور ممتاز ادب نہیں پیدا ہو سکتا اور نہ ہی اچھوتا

اسلوب بیان۱ ۔ منفلوطی ازہر کے تعلیم یافتہ تھے اس لیے ان کی زبان آج بھی بحیثیت قابلِ تقلید نمونہ مسلّم ہے۔ جبران عربی زبان کی تعلیم باقاعدہ کہیں حاصل نہ کر سکے۔ انھوں نے صرف چار سال تک لبنان میں مدرسۃ الحکمۃ میں عربی کی تعلیم حاصل کی اور پھر بوسٹن واپس چلے گئے۲۔

ظاہر ہے چار سال کی تعلیم اور وہ بھی مدرسہ کے معیار پر عربی جیسی بحر بیکراں زبان پر قدرت حاصل کرنے کے لیے کہاں کافی ہو سکتی ہے۔ اور اس تعلیم کے ساتھ جب ادب کی زبان [illegible] ہو گا جس کی طرف احمد حسن الزیات نے اشارہ کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ

"ہمارے لبنانی بھائیوں نے مصر میں اور امریکہ میں ادب عربی کو مغربی ادب سے روشناس کرایا لیکن اس مہم میں انھوں نے ایسے فن اور ایسی زبان کا مظاہرہ کیا جس سے عربی ادب اب تک نابلد تھا اگر یہ زبان اسلوب کے اعتبار سے اور پیرایۂ بیان کے اعتبار سے بڑی ناقص اور سقیم تھی اس لئے ہم نے اسے اسی طرح ناپسند کیا جس طرح مقامات کے اسالیب بیان اور بے معنی جملوں رکیک تراکیب اور تصنع کو۳۔"

یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں زبان کی غلطیاں ملتی ہیں جن سے منفلوطی کا قلم بالکل پاک ہے۔ جبران کو بھی اپنی اس کمی کا احساس تھا چنانچہ انھوں نے ایک مرتبہ کہا کہ میری زبان میں غلطیاں دکھائی دیتی ہیں تو کیا خیالات و افکار میں تو میرا کوئی ہمسر نہیں اور پھر

غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

جہاں تک دینی افکار و معتقدات کا تعلق ہے منفلوطی اور جبران دونوں نے ان کی تبلیغ کی ہے اور یہ تبلیغ قصوں کے درمیان وعظ و نصیحت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ

۱۔ احمد حسن الزیات : وحی الرسالۃ

۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے الدیوان مرتبہ محمود تیمور اور ابراہیم المازنی

الزیات : وحی الرسالۃ

جبران نے ایسے موقعوں پر منفلوطی کے مقابلہ میں زیادہ [illegible] سے اور زیادہ [illegible]

ہے اور انداز ایسا ہے جس سے تصور ہوتا ہے کہ جبران نہیں بلکہ ایک پادری بول رہا ہے۔ منفلوطی نے

زیادہ تر اخلاقی قدروں پر جو سب قوموں کا [illegible] سرمایہ ہیں زور دیا ہے لیکن جبران نے کو

مذہب عیسوی کی تعلیمات اور انہیں اقدار کی تبلیغ کی ہے جس کی وجہ سے ان کی یہ چیزیں محدود

[illegible] غیر محدود ہو گئی ہیں اور وہ آج بھی اسی طرح نئی اور قابل قبول ہیں جس طرح منفلوطی کے زمانے

[illegible] مصیبت و پریشانی کی جتنی مبالغہ آمیز تصویر کھینچی ہے اور

ان کے نتائج میں جتنے آدمیوں کو موت کی ابدی نیند سلادی ہے اتنی مبالغہ آمیز تصویر منفلوطی کے یہاں

[illegible] سے ان مظلوموں اور ستم رسیدہ دل کو قبر کی کال کوٹھری میں

[illegible] سے جبران نے یہ کام کیا ہے۔ سعد صائب نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ

[illegible] ہے کہ زندگی میں اس قسم کے المیہ حادثات اتنی کثرت سے ہرگز نہیں پیش آتے

[illegible] ان ادیبوں نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ ہی غریبوں کے سسک

[illegible] حادثے کا نشانہ بننے والوں کے خودکشی کرنے سے [illegible] مسائل حل

[illegible] ادب کے ممتاز نقاد اور ادباء میں سے کسی نے بھی، اور خاص طور سے

[illegible] جبرانی ادب کو کبھی بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہو۔ زبان کی سطحیت

[illegible] اباحیت" کو ہر سنجیدہ طبقے نے ناپسند کیا جس کا احساس جبران کو بھی تھا اور وہ کبھی کبھی

[illegible] رویہ کے خلاف دبی زبان سے احتجاج بھی کرتے تھے لیکن ان کی مخالفت کرنے والوں میں ایسے جید

[illegible] تھے جن کے خلاف بولنے کی جرأت نہ وہ خود کر سکتے تھے اور نہ ان

کے حواری [illegible]

[illegible] سعد صائب

مصطفیٰ لطفی کی بھی مخالفت کی گئی اور بڑی شدت سے اور سب سے زیادہ ان کے خلاف ابراہیم المازنی نے جو اپنے زمانے کے استاد تھے اور جن کا طوطی ایک زمانہ میں مصر میں بولتا تھا لکھا ہے۔ لیکن ان کی مخالفت منفلوطی کی فنی خامیوں کی وجہ سے تھی۔ منفلوطی کی اکثر کہانیوں میں رونا دھونا [illegible] یہ طبیعت پسند نہ تھی۔ [illegible]

[illegible] پڑھنے والوں میں تخنث پیدا کر دیا ہے [illegible] احساس [illegible] قومیں نہیں بنتیں، قومیں بنتی ہیں مصیبتوں کے سامنے [illegible] ہوئے مردانہ وار سینہ سپر [illegible] حوادث کی شرر باری [illegible] اور چلتی ہوئی تلواروں کے سایہ میں زندگی کرنے کی خو پیدا کر کے سے اور یہ سبق منفلوطی کی کہانیوں سے قوم کے جوانوں کو نہیں ملتا۔ جس سے ان میں بزدلی کم ہمتی اور [illegible] پیدا ہوتی ہے جو ساری قوم کی موت ہے۔

رہ گیا اسلوب بیان کا معاملہ تو اس پر بھی انھوں نے بعض اعتراضات کئے ہیں لیکن ان اعتراضات کی نوعیت یہ ہے کہ مازنی کے خیال میں ایک خاص لفظ کی جگہ جسے منفلوطی نے استعمال کیا ہے فلاں لفظ زیادہ موزوں ہو سکتا تھا۔ جسے منفلوطی نے نہیں استعمال کیا۔ یا اس مقصد کے لئے فلاں قسم کی عبارت زیادہ موزوں تھی وغیرہ وغیرہ۔

مگر میرا خیال ہے کہ مازنی کے اکثر اعتراضات محض معاصرانہ چشمک کی وجہ سے تھے کیونکہ منفلوطی اس گروہ میں تھے جو مازنی اور ان کے ساتھیوں سے ادب کے میدان میں دست و گریبان رہتا تھا اور مصر کا یہ زمانہ ادبی چپقلشوں کے لئے بہت مشہور رہا ہے اور اس کو ہوا دینے میں حاکم طبقہ کا بھی بہت [illegible] اس سے اس کو اپنے مفید مطلب ادیبوں کو حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہو جاتی تھی۔

۱ تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے: الدیوان مرتبہ محمد تیمور اور ابراہیم المازنی

امام مرتضیٰ نقوی

تلخیص اور اس کا فن

تلخیص [illegible] سے بنا ہے جس کے معنی اصلی اور عمدہ حصہ چھانٹنا، انتخاب کرنا، تشریح کرنا، خلاصہ کرنا ہیں۔ ترکی دواوین کی زبان میں اس سے مراد وہ [illegible] میں اہم مسائل کا خلاصہ سلطان کی [illegible] پیش کرنے کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ وہ افسر جو ان کاغذات کی تیاری اور سلطان کی خدمت میں پیش کرنے کے ذمہ دار تھے وہ وزیر اعظم اور شیخ الاسلام کہلاتے تھے۔ لیکن [illegible] موجودہ مفہوم انگریزی لفظ [illegible] سے آیا ہے۔ جس کے معنی کسی ادبی شہ پارے کا ایک خاص طرز سے خلاصہ کرنا ہے

ایک انگریز [illegible] کا قول ہے "کچھ لوگ زیادہ اس لئے پڑھتے ہیں تاکہ دوسرے لوگ کم پڑھ کر ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔"

[illegible] تلخیص کا مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہوتا اور معاملہ تشریح طلب رہ جاتا ہے۔ پھر بھی یہ اشارہ ہے علم اور اشاعت و طباعت کی اس روز افزوں ترقی کی طرف جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ [illegible] ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم ہو سکیں۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ تلخیص کسی ادبی شہ پارے کے خلاصے کو کہتے ہیں۔ جہاں تک اس کی [illegible] ہے کہ آج اس سائنسی دور میں جبکہ علم کے ہر گوشے میں سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں کتابیں، رسائل اور مضامین شائع ہو رہے ہیں یہ پتہ لگانا انتہائی دشوار ہو گیا ہے کہ فلاں مضمون کہاں شائع ہوا۔ اور اس میں کیا کہا گیا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ مضمون یا مقالہ کسی ایسی زبان میں ہو جس کو اس فن سے متعلق لوگ نا آشنا [illegible] معمولی قابلیت [illegible]۔ بعض اوقات

مضامین اتنے طویل ہوتے ہیں کہ مصروف ذہن اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ مضمون کو پورا پڑھا جائے [illegible] کبھی مضمون میں غیر معمولی اور بے جا تفصیل قاری کے لئے اکتاہٹ کا سبب بن جاتی ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا [illegible] ہے چاہے اس میں کیسی ہی کام کی باتیں ہوں۔

قارئین کی ان دشواریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ تفصیل کو اجمال کا [illegible] پہنایا جائے اور ملخص رسائل یعنی Abstracting Periodical کا اجرا عمل میں لایا جائے [illegible] ایک انوکھی چیز تھی لیکن نہایت جامع اور اپنے اندر افادیت کا پہلو لئے ہوئے۔ یہ کام سب سے پہلے جرمنی میں ۱۸۳۰ء میں شروع ہوا۔ ان کی دیکھا دیکھی برطانیہ والوں نے بھی علم کیمیا پر ایک سہ ماہی مجلہ نکالا۔ جس میں علم کیمیا پر ان مضامین کی تلخیص کی جاتی تھی جو مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ یہ مجلہ آج بھی وہاں [illegible] رہا ہے۔ مغربی ممالک میں یہ کام نہایت تیزی سے ہو رہا ہے۔ سائنسی علوم خاص طور پر علم طبیعیات علم کیمیا اور علم حیوانات پر بڑے اچھے اچھے ملخص رسائل شائع ہو رہے ہیں لیکن سب سے زیادہ امریکہ کا علم کیمیا پر وہ مشہور جریدہ ہے جس میں تقریباً پچھتر ہزار مضامین کی تلخیص ہر سال کی جاتی ہے۔

یونیسکو نے بھی اس کام میں ایک اہم رول ادا کیا ہے اس نے سماجی علوم مثلاً معاشیات، سیاسیات اور دوسرے شعبوں میں ملخص رسائل کے اجرا کا کام شروع کیا ہے۔ ہندوستان میں "انڈین نیشنل ڈاکومنٹیشن سنٹر" اور پاکستان میں "پاکستان نیشنل ڈاکومنٹیشن سنٹر" کے تحت یہ کام ہو رہا ہے۔ سائنسی موضوعات پر جو مضامین ہر ماہ شائع ہوتے ہیں وہاں ان کی تلخیص کی جاتی ہے۔

تلخیص دو طرح کی ہوتی ہے ایک اشاراتی اور دوسری معلوماتی۔ اشاراتی تلخیص اس کو کہتے ہیں جس میں قاری صرف عنوان سے ہی پتہ لگا لیتا ہے کہ مضمون اس کے کام کا ہے یا نہیں۔ یہ تلخیص صرف ان لوگوں [illegible] ہوتی ہے جو اپنے فن میں کامل ہوتے ہیں۔ اور انھیں اس پر پورا عبور رہتا ہے۔ ان کی نظر [illegible] ہوتی ہے اور وہ پورے پس منظر سے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ صرف ایک نظر دیکھنے سے اس کی تہ تک پہونچ جاتے ہیں۔

برخلاف اس کے معلوماتی تلخیص وہ ہوتی ہے جو سادہ اور عام فہم زبان میں کی گئی

مضمون کے ہر پہلو کو اس طرح بیان کر دیا جائے کہ کہیں جھول اور بے ربطی نہ رہے، مضمون کے ہر اہم پہلو اور گوشے پر اجمالی طور سے روشنی پڑ سکے تاکہ ہر شخص اسے آسانی سے سمجھ سکے۔

تلخیص کرنے میں سب سے پہلا اور بنیادی کام جس سے تلخیص کرنے والے کو دوچار ہونا پڑتا ہے مضمون کا عنوان، اس کو چاہئے کہ سب سے پہلے اس عنوان پر اچھی طرح غور کرے کہ آیا یہ اس مضمون سے مناسبت رکھتا بھی ہے یا نہیں، لیکن ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ مضمون کچھ اور ہو اور عنوان کچھ اور۔ تلخیص کرنے والے کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ مضمون کے عنوان میں اپنی طرف سے کمی بیشی کرے۔ اس کو چاہئے کہ بعینہ اسے نقل کر دے۔ اکثر مضامین میں عنوان کے بعد ذیلی عنوان بھی ہوتا ہے، اس سلسلے میں تلخیص کرنے والے کو یہ دیکھنا چاہئے کہ یہ عنوان کافی ہے یا نہیں، اگر وہ کافی نہیں ہے تو ذیلی عنوان سے عنوان کی پوری وضاحت ہو جائے گی، اگر مضمون کسی دوسری زبان میں ہے تو اپنی زبان میں ترجمہ کر دینا چاہئے۔

مضمون کے مصنف کا نام، رسالے کا نام، تاریخ اشاعت، جلد نمبر، مضمون کے شائع ہونے کے صفحات نمبر دینے چاہئیں۔

تلخیص کرنے سے پہلے مضمون کو اچھی طرح پڑھ لینا چاہئے اور اس کی اصلی روح تک پہونچ جانا چاہئے تاکہ ذہن میں اس کا واضح تصور ہو سکے اور کوئی مبہم گوشہ باقی نہ رہے۔ تلخیص کتنی طویل ہوگی یہ پہلے ذہن میں رکھنا چاہئے کیونکہ ماہرین فن کے لئے تفصیل بے سود ہوگی۔ عام اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے تلخیص بہت شرح کے ساتھ کی جائے تو وہ ان کے لئے مفید ہوگی۔ تلخیص کرتے وقت زبان کا خیال رکھنا چاہئے۔ زبان ہی لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتی ہے اور اکثر عدم دلچسپی کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ تلخیص کے لئے وہی زبان استعمال کی جائے جو اصل مضمون کی زبان ہے بلکہ اس میں تلخیص کرنے والا اپنی زبان استعمال کر سکتا ہے، مگر اس کے لئے سب سے بنیادی چیز یہی ہے کہ وہ زبان ادبی ہو، عام فہم ہو۔ زیادہ دقیق زبان تلخیص میں پسند نہیں کی جا سکتی۔ زبان کا معاملہ اگرچہ بہت کچھ موضوع کے مواد سے تعلق رکھتا ہے۔

فلسفیانہ اور منطقی استدلال لئے ہوئے ہے تو زبان بھی اسی کی مناسبت سے استعمال کی جائے گی
[illegible] زبان محض اس کے اصلی مضمون کی طرح فلسفیانہ انداز لئے ہوئے ہو بلکہ اس کے اندر ایک ایسا توازن ہو جس میں مضمون کی زبان اور تلخیص کرنے والے کی زبان دونوں کا حسین

ایک خاص بات تلخیص کرنے والے کو اپنے ذہن میں یہ رکھنی چاہئے کہ وہ اس مضمون کو تنقیدی نقطۂ نظر سے نہ دیکھے۔ اس کا کام تنقید کرنا نہیں۔ نہ وہ اپنا کوئی خیال ظاہر کرسکتا ہے، بلکہ اسے تو بجنسہ مضمون کا خلاصہ کردینا ہے، اگر وہ اپنی راہ سے ذرا بھی ہٹتا ہے تو مضمون کی افادیت میں یقیناً کمی آجائے گی اور پھر وہ تلخیص نہیں رہے گی بلکہ تنقید ہوجائے گی۔ اس لئے تلخیص کرتے وقت صرف مضمون کے مصنف کے خیالات، مشاہدات اور تجربات کا ہی اظہار کرنا ہے جو اس نے اپنے مضمون میں کئے ہیں یا جو نظریات اس نے پیش کئے ہیں انھیں ہی اپنی تلخیص میں پیش کرنا ہے

اکثر لوگ اپنے مضامین میں مثالوں کا سہارا لیتے ہیں۔ جس سے خواہ مخواہ مضمون طویل ہوجاتا ہے۔ یا ایک بات کو کئی کئی جملوں میں ادا کرتے ہیں۔ یا کبھی دوسروں کے مضامین کا بھی حوالہ دیتے ہیں۔ یہ سب باتیں تلخیص کرتے وقت نظر انداز کردینی چاہئیں۔ تلخیص مثالوں کے بوجھ کو برداشت نہیں کرسکتی۔ اسی طرح ایک بات کو کئی کئی جملوں میں ادا کرنے سے اس کا مقصد فوت ہوجاتا ہے۔ یہی چند باتیں ہیں جو تلخیص کرتے وقت ذہن میں رکھنی چاہئیں۔ ورنہ ان کے بغیر اچھی تلخیص وجود میں نہیں آسکتی۔

اردو میں تلخیص کا کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب تک کوئی ایسا جامع کام نہیں ہوسکا۔ حالانکہ اردو زبان میں جتنے رسائل نکلتے ہیں شاید ہی ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں نکلتے ہوں۔ ان رسائل میں علمی، ادبی، تحقیقی اور تاریخی ہر قسم کے اعلیٰ پایہ کے مضامین ہر ماہ آتے رہتے ہیں۔ لیکن ان سب کو یکجا کرنے کے لئے کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے معلوم ہوسکے کہ کیا کیا لکھا جارہا ہے۔ اگر ایک شخص کسی موضوع پر تحقیق کررہا ہے اور اس کے موضوع سے متعلق کہیں کچھ چھپتا ہے تو اسے علم بھی نہیں ہوتا۔ یہ سب ادب میں انتشار کی وجہ ہے۔ اردو ادب میں پھیلاؤ ہے، وسعت ہے،

لیکن انتشار کے ساتھ، اردو ادب کا قیمتی سرمایہ بکھرا پڑا ہے، اسے ایک لڑی میں پرونے کی ضرورت [illegible] یہ ہر شخص کے امکان سے باہر [illegible] ہر رسالے پر نظر رکھے اور تلاش کرتا پھرے کہ اس کے مقصد کی چیز کہاں مل سکتی [illegible] لئے ان تمام دشواریوں کو پیش نظر رکھ کر اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اردو میں ملخص رسائل کا اجرا ہونا چاہیئے جو محققین اور عام لوگوں کے لئے نہایت [illegible] رسائل میں جو مضامین نکلتے ہیں ان میں مختلف قسم کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ [illegible] مذہبی، تحقیقی، ادبی، تاریخی وغیرہ۔ تلخیص کے رسائل کی تقسیم بھی اسی طرح ہونی چاہئے۔ کسی میں صرف تاریخی مضامین کی تلخیص ہو، کسی میں مذہبی کی اور کسی میں ادبی کی۔ یہ درجہ بندی تقسیم محققین کے لئے نہایت کارآمد ثابت ہوگی۔ اور انہیں یہ تلاش کرنا نہیں پڑے گا کہ فلاں مضمون کہاں مل سکتا ہے۔ یہ [illegible] طلبا کے لئے بھی اور قارئین کے لئے بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

یادِ رفتگاں

ایک مخلص جامعی محمد یوسف صاحب کا انتقال

جامعہ کے ایک معزز گریجویٹ اور سابق کارکن، اہل اردو زبان وادب کے حوصلہ مند ناشر جناب محمد یوسف صاحب جامعی کا ۱۳ر دسمبر کی صبح کو ساڑھے دس بجے دہلی میں انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم کی عمر کوئی ۵۷ سال تھی۔

محمد یوسف صاحب جامعہ کے ان چند ممتاز طلبائے قدیم میں سے تھے جو اپنی مادرِ علمی کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں، اور اردو کے ان چند خدمت گزار ناشروں میں سے تھے، جن کا نصب العین ہے کہ ہر حال میں

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے

میں ۳۶ء میں جامعہ کالج میں داخل ہوا تو جامعہ کے مختلف اداروں میں جو نوجوان طلبائے قدیم کام کر رہے تھے، ان میں یوسف صاحب بھی تھے، ان کا تعلق مکتبہ جامعہ کی نشر و اشاعت سے تھا اور طلبائے کالج کی یونین انجمن اتحاد کے حیاتی رکن تھے۔ مجھے شروع ہی سے صحافت نگاری اور نشر و اشاعت سے دلچسپی تھی اور طلبا کی سرگرمیوں میں پابندی کے ساتھ حصہ لیا کرتا تھا، اس لیے موصوف سے بہت جلد میرے تعلقات قائم ہوگئے۔ بعد میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب میں نے مکتبہ کے شعبۂ تصنیف تالیف اور طباعت کے انچارج کی حیثیت سے کام شروع کیا، تو زمانہ طالب علمی کے یہ تعلقات اور مستحکم اور استوار ہوگئے اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ دوستی اور رفاقت کا یہ رشتہ خوشگوار

[illegible]وار تر ہوتا گیا۔ تیس اکتیس برس کے اس طویل [illegible] شخصیت کے ہر پہلو کو دیکھنے کا [illegible]
[illegible] ملا اور مجھے اعتراف ہے کہ وہ ہر معاملے میں کھرے اور [illegible]
ثابت ہوئے۔ ان پر مشکل دور بھی [illegible] اقبال کا بھی، مگر دوستوں کی دوستی اور
ساتھیوں کی رفاقت کو ہمیشہ یاد رکھا اور تا عمر حق دوستی اور حق رفاقت کو حسن و خوبی کے ساتھ نبھایا۔

یوسف صاحب یوپی کے ایک تاریخی ضلع فیض آباد کے ایک دیہات کے متوسط گھرانے سے [illegible] جامعہ میں جب طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے تو بہت خستہ حال اور پریشان حال [illegible] مگر [illegible] عزم و ارادے کے پکے، چنانچہ نہ صرف تعلیم مکمل کی بلکہ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد [illegible] سوجھ بوجھ کی بنا پر بہت جلد اپنی ایک حیثیت بنالی اور پرخلوص جذبۂ خدمت کی بنا پر ان کا ایک وسیع [illegible] قائم ہو گیا۔ ان کے احباب میں ہر طبقے اور ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل [illegible] اور سبھی لوگوں میں وہ یکساں طور پر مقبول تھے۔ ان کی شخصیت اور کردار کی یہ عجیب خوبی تھی کہ ان [illegible] تعلق رکھنے والوں میں متضاد طبیعت اور رجحان کے لوگ تھے۔ ان میں ایک طرف [illegible] دوسری طرف ادیب اور سیاسی کارکن بھی تھے۔ انھوں نے سنہ ۴۲ء کی قومی تحریک میں اچھا خاصا کام کیا، بعد میں بھی کانگریس کے بعض تعمیری کاموں میں شریک رہے۔ ساتھ ہی مسلم لیگ کے [illegible] ان کے اچھے تعلقات تھے۔ انھوں نے جب رسالہ شاہراہ اور مکتبہ شاہراہ کے ذریعہ اردو کی خدمت کا کام شروع کیا تو ان کے تمام تر مددگار ترقی پسند ادیب تھے، مگر ساتھ ہی ان ادیبوں سے بھی ان کے تعلقات [illegible] ترقی پسند نہیں تھے یا ترقی پسندوں کے سخت مخالف تھے اور اب جب ترقی پسندوں میں مارکسی اور غیر مارکسی کی ٹولیاں بن گئی ہیں تو [illegible] ٹولیوں کے انتہا پسندوں سے بھی ان کے تعلقات قائم رہے، غرض ان کے حلقۂ احباب [illegible] خیال کے لوگ ملیں گے اور خاص بات یہ ہے کہ کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ ان میں سے کسی فرد یا گروہ کو یوسف صاحب کے خلوص اور دوستی پر اعتماد نہیں ہے۔ یہ متضاد عناصر مکتبہ شاہراہ کے محدود کمرے میں کبھی کبھی اکٹھا بھی ہو جاتے تھے، بحثیں بھی ہوتیں، تلخیاں بھی ہو جاتیں، مگر یوسف صاحب اپنی کرسی پر بیٹھے مسکراتے رہتے، ہنستے رہتے، کوئی اپنی حدود سے آگے بڑھ جاتا یا کوئی کسی کے ساتھ زیادتی کر بیٹھتا تو تعلقات [illegible]

سے، کسی کو ڈانٹ دیتے، کسی کو خاموش کرتے، کسی کی خوشامد کرتے، مختصر یہ کہ ہر ایک کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے اور دوستوں کا حلقہ بدستور قائم رہتا۔

ادیب نہیں تھے، مگر ادیب گر ضرور تھے۔ انھوں نے بہت سے ادیب پیدا کئے اور بہت سے ادیبوں کو شہرت دوام عطا کی۔ شاہراہ کے پہلے اڈیٹر جناب ساحر لدھیانوی ایک شاعر کی حیثیت سے بے شک مشہور و معروف تھے، مگر صحافت نگار اور ادیب کی حیثیت سے ان کی شہرت شاہراہ ہی کی مرہونِ منت ہے۔ ان کے بعد جناب پرکاش پنڈت اڈیٹر مقرر ہوئے تو ہندی کے ادیب کی حیثیت سے ان کی شہرت جو بھی رہی ہو، مجھے اس کا علم نہیں، مگر اُس وقت اردو ادب میں ان کا کوئی مقام نہیں تھا۔ شاہراہ کے اڈیٹر کی حیثیت سے سب سے پہلے وہ اردو ادب میں متعارف ہوئے اور خوشی کی بات ہے کہ ان کا اردو کے مستند ادیبوں میں شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح بہت سے چوٹی کے ادیبوں کی تخلیقات منظرِ عام پر نہ آتیں، اگر مکتبہ شاہراہ ان کی اشاعت کی ذمہ داری نہ لیتا۔ یوسف صاحب نے سال بھر کے بہترین ادب کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا جو بہت مقبول ہوا اور ان مجموعوں کی وجہ سے اردو ادب میں نہایت مفید اضافہ ہوا۔ یوسف صاحب کتابوں کے علاوہ اور بھی کاروبار کرتے تھے، مگر نقد پیسوں کی تنگی ہمیشہ رہی لیکن پھر بھی کسی اچھی اور مفید کتاب کی اشاعت کا مسئلہ ان کے سامنے آتا تو ہمیشہ ہمدردی سے بات کرتے اور حالات اجازت دیں یا نہ دیں، مگر کسی ادیب کو مشکل ہی سے مایوس کرتے تھے۔ اردو کے ناشروں کا مجھے اچھا خاصا تجربہ ہے، مگر یوسف صاحب جیسا حوصلہ مند ناشر جو نقصانات کے خطرات میں بے محابا کود پڑے، مجھے نہیں ملا۔ آج کل اردو کتابوں کا کاروبار سراسر گھاٹے کا سودا ہے، اس کا اثر مکتبہ شاہراہ پر بھی پڑا، پھر بھی پچھلے چند برسوں میں انھوں نے بہت اچھی اور معیاری کتابیں شائع کیں، جن سے مالی منفعت کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔

یوسف صاحب کو جامعہ سے بڑی محبت تھی۔ ہر درسگاہ کے قدیم طلبار کو اپنی مادرِ علمی سے محبت ہوتی ہے۔ جامعہ کے قدیم طلبار کے بارے میں، میرا خیال ہے کہ ان کا جامعہ سے تعلق اور محبت اوروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ہے۔ مگر یوسف صاحب کی محبت میں مجھے جو خلوص اور لگاؤ نظر آیا وہ بہت ہی قابلِ قدر

ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جامعہ سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے مکتبہ جامعہ میں کام شروع کیا اور اپنے خلوص
اور کارکردگی کا بہت اچھا ثبوت دیا اور مکتبہ کی قابلِ قدر خدمت کی۔ ۱۹۴۰ء میں جب مکتبہ کی مالی حالت
خراب ہو گئی اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں کارکنانِ مکتبہ کا جلسہ منعقد ہوا اور اس کی حالت
کو بہتر بنانے کی صورتوں پر غور کیا گیا تو اس کے علاوہ اور کوئی صورت سمجھ میں نہیں آئی کہ کارکنوں کی
[illegible] کمی کی جاسکے، کر دی جائے، مگر ظاہر ہے عملاً اس میں بڑی دشواریاں تھیں، اس لیے جامعہ کے
طلبائے قدیم نے، جو مکتبہ میں کام کرتے تھے، رضاکارانہ طور پر اپنے استعفے پیش کر دئے۔ ان لوگوں میں
[illegible] محمد یوسف صاحب اور راقم الحروف تھا۔ علاء الدین خالد صاحب، جو اگرچہ جامعہ کے
طلبائے قدیم میں [illegible] تھے، مگر مکتبہ کے ایک ذمہ دار عہدہ پر فائز تھے، انھوں نے بھی اپنا استعفیٰ پیش
کر دیا۔ [illegible] جامعہ کے کتب خانہ میں منتقل کر دی گئیں اور ان لوگوں نے اپنا الگ کاروبار شروع کیا۔
بدر الحسن صاحب اور خالد صاحب نے مل کر حالی پبلشنگ ہاؤس خرید لیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد خالد صاحب کراچی
[illegible] کاروبار شروع کیا اور اب ماشاء اللہ ان کا پاکستان کے مشہور اور بہت بڑے ناشروں
[illegible] ہے۔ خالد صاحب کے چلے جانے کے بعد ان کی جگہ یوسف صاحب نے لے لی اور اردو زبان و
ادب کی خدمت میں لگ گئے۔ بعد میں حالی پبلشنگ ہاؤس سے الگ ہو کر مکتبہ شاہراہ کی بنیاد رکھی۔ مکتبہ شاہراہ
[illegible] شاہراہ کی حیثیت اگرچہ نجی اور شخصی تھی اور یوسف صاحب کے پاس سرمایہ بھی بہت نہیں تھا، لیکن
پھر بھی [illegible] اردو ادب میں نئے رجحانات اور نئے اسلوب پیدا کرنے میں بڑی مفید اور [illegible]
خدمت انجام دی ہے۔

جامعہ سے بے تعلق ہونے کے بعد بھی یوسف صاحب کی جامعہ سے دلچسپی اور اس کی خدمت کا جذبہ
بدستور باقی رہا، بلکہ اگر میں یہ عرض کروں کہ اس میں کچھ اضافہ ہی ہوا تو ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا۔ انھوں نے
[illegible] انجام دی ہیں، ان میں ایک جیتی جاگتی یادگار طلبائے قدیم کی عمارت ہے۔ یہ عمارت ایک طویل
عرصے تک مقروض تھی اور اس کی وجہ سے انجمن طلبائے قدیم کے تصرف میں نہیں تھی۔ دلی کے باہر جامعہ کے
بہت سے ایسے قدیم طالب علم تھے جو آسانی سے یہ رقم ادا کر سکتے تھے، دلی کے طلبائے قدیم میں اگر کوئی ایک

شخص ایسا نہیں تھا تو اتنی تعداد تو تھی ہی جو مل کرانے ادا کر سکتے تھے، مگر یہ شرف صرف یوسف صاحب کو حاصل ہوا جنھوں نے یکہ وتنہا اس رقم کو ادا کر کے عمارت کو واگزار کرا دیا۔ ایسی مثالیں ایک دو نہیں بہت سی ہیں [illegible] درمے قدمے سخنے مدد کی۔ افسوس کہ ایسا جامعی ہم [illegible] چلیں اس کی خوشی ہے کہ وہ جامعہ نگر ہی میں آسودہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ جس طرح جامعہ اور انجمن طلبائے قدیم کو یاد رکھا، ہم لوگ اس کو یاد رکھیں گے۔

تعزیت

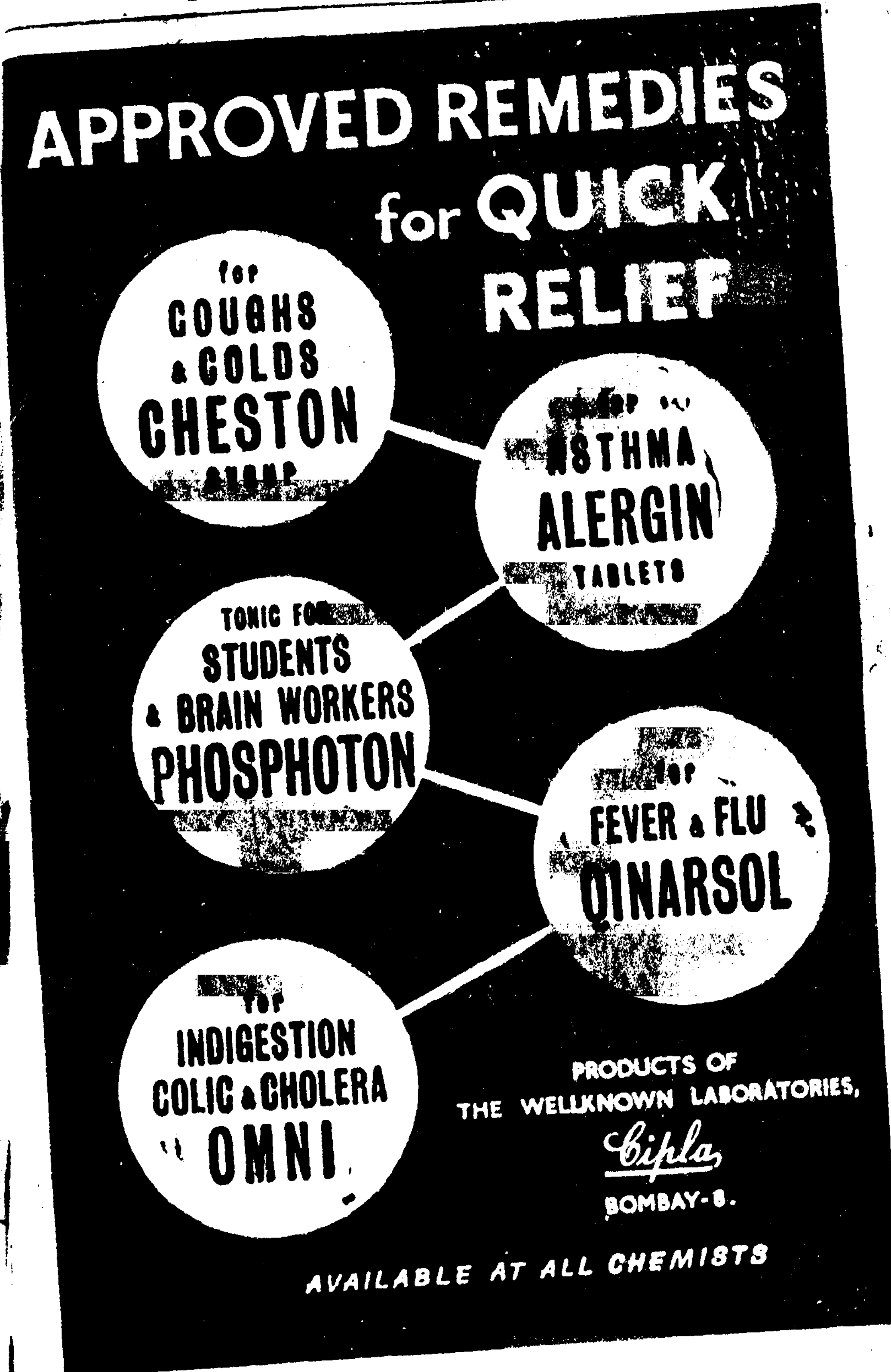
انجمن طلبائے قدیم جامعہ کا ایک تعزیتی جلسہ جناب عبدالغفار مدہولی صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا اور مرحوم یوسف صاحب کی خدمات اور ان کی سیرت کی مختلف خوبیوں اور اچھائیوں پر جناب سعید انصاری صاحب نے تقریر کی اور راقم الحروف نے وہ مضمون پڑھ کر سنایا جو اوپر [illegible] ہے۔ [illegible] تجویز منظور کی گئی، جس میں یوسف کی جامعہ ملیہ سے محبت، انجمن طلبائے قدیم سے گہرے تعلق اور اردو ادب کی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔

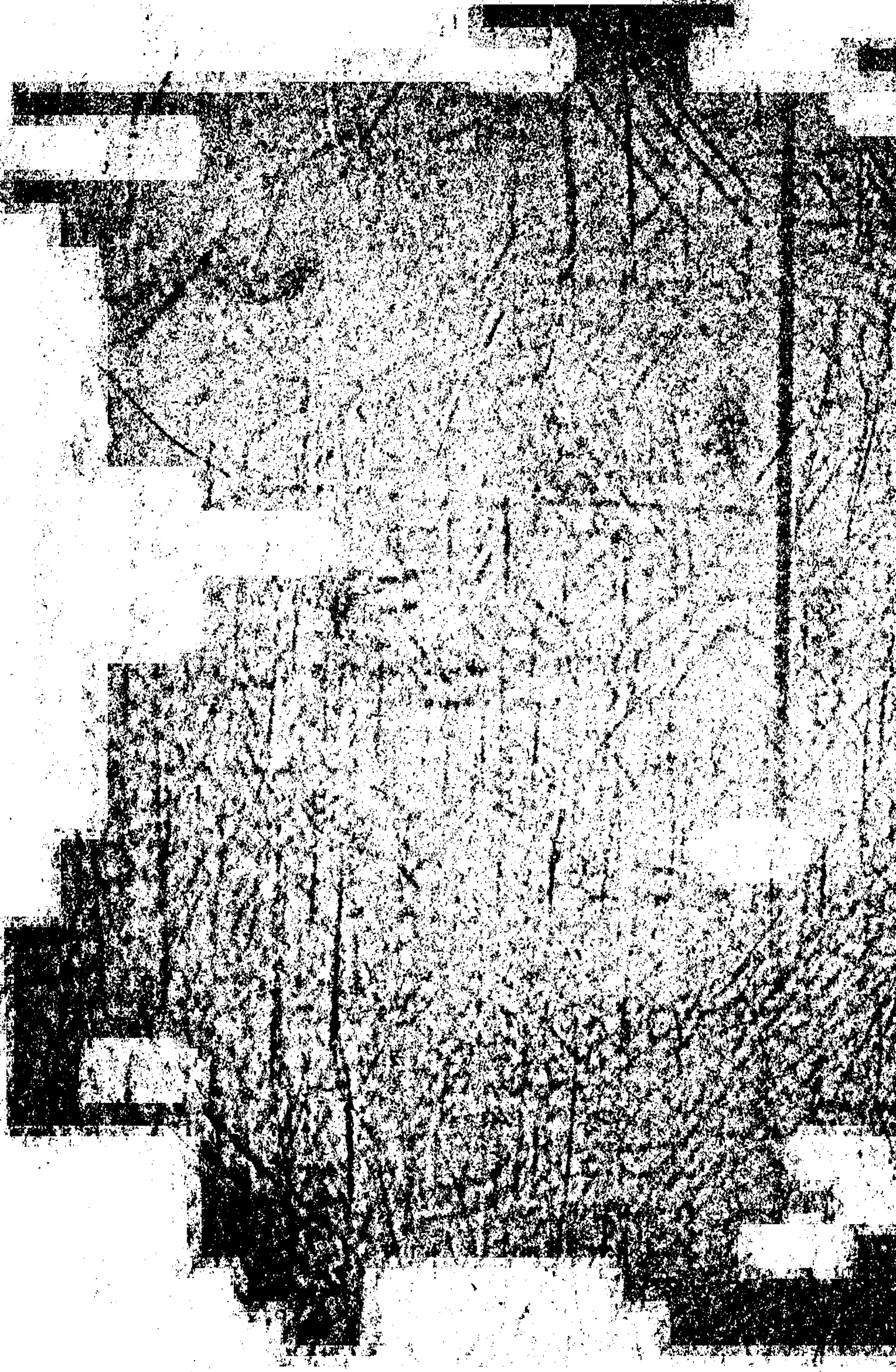
جناب قاضی رشید احمد صاحب ہاشمی بھی یوسف صاحب کے زمانۂ ملازمت میں مکتبہ جامعہ میں بحیثیت خزانچی کے کام کرتے تھے۔ موصوف نے مرحوم پر ایک قطعہ کہا ہے جو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

یوسفِ بازارِ اردو اب کہاں ہیں گام زن
[illegible] راہ زندگی طے کر [illegible] زن
بدھ کا دن ۱۳ دسمبر ایک، نو، چھ، سات سن
دسواں روزہ ان کے سر پر باندھ [illegible] آیا کفن



P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25





سالانہ چندہ [illegible] روپے

جامعہ

[illegible] پرچہ پچاس [illegible]

[illegible]	بابت ماہ فروری سنہ ۱۹۶۸ء

فہرست مضامین

کے مابین امیری اور غریبی کا یہ فرق بڑھتا جا رہا ہے، یہ صورت حال امن عالم کے لئے ایک بہت بڑا

بہت بڑا ایٹم بم ہے۔

اقوام متحدہ کی دوسری عالمی تجارتی و ترقی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے یو تھانٹ [illegible]

[illegible] حال کی طرف خاص طور سے مندوبین کی توجہ مبذول کرائی اور کہا کہ جب تک امیر اور

درمیان بڑھتے ہوئے فرق کو کم نہ کیا جائے گا، اس وقت تک دنیا میں امن و سکون نہیں ہو سکتا

[illegible] امن کے خواہاں اور سکون کے متلاشی ہیں، کسی ملک میں جائیے اور کسی سے پوچھئے

[illegible] کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص جو صحیح طور پر سوچتا ہے یہ نہیں کہے گا کہ دنیا میں امیری اور

[illegible] رہا ہے، تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کی بین الاقوامی برادری جس کی نمائندگی اس طرح

میں ہوتی ہے، یہ طے کرے کہ خوشحال، ترقی یافتہ اور معاشی اعتبار سے طاقتور قوموں کی یہ ذمہ

کو پچھڑے ہوئے اور ترقی پذیر ملکوں کی معاشی ترقی میں مدد دیں، خیال ہے کہ اس کانفرنس میں

اہم مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ضرور تلاش کیا جائے گا۔

ہمارے دیش میں آج ہر طرف سے یہی آواز آ رہی ہے کہ زبان، مذہب، علاقائی مفاد

بات، مقامی اور غیر مقامی کی تمیز ـــــ غرض کسی معاملے میں تعصب اور تنگ نظری سے کام نہیں

ورنہ ملک کی وحدت پارہ پارہ ہو جائے گی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہمارے سماج میں مختلف

کی بیماریاں زور پکڑ گئی ہیں، لیکن یہ کیا بات ہے کہ بتانے والے بتاتے ہیں کہ بیماریاں کیا کیا ہیں

کہاں ہیں، اور سننے والا کوئی نظر نہیں آتا، کیا یہ صورت حال جسے ہم بے حسی سے تعبیر کر سکتے ہیں

بیماری نہیں ہے جس میں پوری قوم مبتلا معلوم ہوتی ہے، بے حسی کی زندگی جانوروں کی زندگی ہو

جانوروں کے لئے کسی اخلاقی قدر کی پابندی نہیں، اب ایسا تو نہیں کہا جا سکتا کہ ہم سب کے سب

ہیں، لیکن بے حسی کی یہ زندگی، زندگی نہیں کہی جا سکتی، کچھ اور ہو سکتی ہے، ہمارا خیال ہے کہ دیش کی

ایک اخلاقی بحران سے دوچار ہے، یہ بحران ہو سکتا ہے کہ ابھی اور بڑھے اور حالات کی تاریکیاں

جائیں کہ طلوعِ آفتاب ناگزیر ہو جائے، پہلے بھی ایسا ہوا ہے، بحران اور اضطراب جب بہت بڑھتا ہے تو
۔۔ور وطن کی کوکھ سے کسی عظیم ہستی نے جنم لیا ہے اور اس عظیم ہستی نے ملک کے ضمیر کو بیدار کیا ہے۔
۔۔لئے انتشار اور اضطراب کے اس ۔۔۔ ہونا چاہیئے۔

۔۔بمبئی سے سہ ماہی ادبی رسالہ 'گفتگو' علی سردار جعفری کی ادارت میں بڑے سلیقہ سے شائع ہوتا
۔۔کا شمارہ ۳ اس وقت سامنے ہے، اس میں ایک پرانی بحث 'یہ بربریت کیوں؟' سرار کے نتائج
۔۔وٹ کے ساتھ خواجہ احمد عباس صاحب کے قلم سے ہے، یہ بحث بڑی دلچسپ ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی
۔۔اس بحث کی یہ تھی کہ آزادی اور تقسیم کے بعد شمالی ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات سے متاثر
۔۔رامانند ساگر نے جب اپنا ناول "اور انسان مرگیا" لکھا تو اس پر خواجہ صاحب سے دیباچہ لکھوایا،
یہ دیباچہ ترقی پسندوں میں بحث کا موضوع بن گیا، جو واقف کار ہیں وہ جانتے ہیں کہ ۱۹۴۸ء میں جب
یہ ناول چھپا تھا عام طور پر اشتراکی ادیبوں کا موڈ کچھ اور تھا، اس لئے خواجہ صاحب کے اس دیباچے کی خوب خ
۔۔دھجیاں اڑائی گئیں اور انھیں رجعت پرست، عوام دشمن اور سامراج دوست ایسے خطابوں سے نوازا
۔۔صاحب نے تمام الزاموں کا جواب یعنی اپنی صفائی کا بیان اسی وقت قلمبند کر لیا تھا، مگر کسی وجہ
۔۔اس وقت چھپ نہیں سکا، اب 'گفتگو' میں ان کا وہ مضمون انیس سال بعد شائع ہوا ہے۔

اس پوری بحث کا خلاصہ، جیسا کہ احمد عباس صاحب نے لکھا ہے، یہ ہے کہ انھوں نے ترقی پسند ہوتے
۔۔بھی کمیونسٹ نظریات کو سو فیصدی قبول نہیں کیا تھا اور ان کے خیال میں ان پر عتاب کی یہی وجہ
۔۔یہاں بنیادی سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا کسی ادیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی بندھے ٹکے سیاسی
۔۔۔ہو، اور کیا کسی ادیب سے اس کا مطالبہ کرنا جائز ہوگا؟ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ادیب
۔۔سے آزاد ہونا چاہیئے، البتہ یہ ضرور ہونا چاہیئے کہ اس کی تحریروں سے ترقی، ذہنی روشنی،
۔۔بیداری، انسان دوستی اور شریفانہ جذبات کو بڑھاوا ملے۔ ادب برائے انقلاب اور ادب

پیدائے زندگی میں بڑا فرق ہے، یہ ضروری نہیں کہ ہر انقلاب بہتر زندگی کا نقیب ہی ہو، ایسا بھی ہوا ہے کہ انقلابات بڑی نیک نیتی اور خوش آیند آرزوؤں کے ساتھ برپا کیے گئے لیکن وہی آگے چل کر انسانی آزادی اور مساوات کے حق میں سم قاتل بن گئے، مارکس نے انقلاب فرانس کا تجزیہ اسی طرح کے حقائق کی روشنی میں کیا تھا۔ پائدار ادب اپنی پوری گمبھیرتا کے ساتھ بہتر سماجی نظام کے لئے ذہنوں کو تیار کرتا ہے، ہر طرح کے ناقص اور مضر سماجی اور معاشی نظام کی خرابیوں کو اجاگر کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ انسان کے دل و دماغ کی تربیت بھی کرتا ہے کہ وہ نیکی اور بدی، حق اور ناحق، خود غرضی اور بے غرضی، انصاف اور ناانصافی، نفرت اور محبت کے بنیادی فرق کا احساس و ادراک کر سکے اور خود پہلے اپنے نفس سے جہاد کر لے تاکہ روحانی اور اخلاقی طور پر جہاد زندگی کے لئے تیار ہو سکے، دنیا کے بڑے ادیبوں نے جنھوں نے کہ اب کلاسکی مرتبہ حاصل کر لیا ہے، انقلاب کا انتظار نہیں کیا بلکہ انھوں نے انقلاب، یا دوسرے لفظوں میں بہتر زندگی کے لئے، ذہن انسانی کو تیار کیا، ایسے تمام ادیب ترقی پسند تھے اور مہذب دنیا اُن کی خدمات کی معترف ہے۔

یہ بات خوشی کی ہے کہ ہمارے وہ ترقی پسند ادیب جو پہلے محض انقلاب کی باتیں کرتے تھے، اب ادب اور زندگی کے اس راز کو پا گئے ہیں اور بڑے سلیقے سے اس کی تشریح کرتے ہیں، ۱۹۴۸ء کی "انقلاب بردوش فضا" میں غالباً یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی ترقی پسند ادیب کبیر داس کا نام لے اور رجعت پرستی کے الزام سے بچ جائے لیکن آج یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ایک سینئر اور مشہور ترقی پسند ادیب اپنے موقف کی تائید کے لئے کبیر کی خالص متصوفانہ پکار کا سہارا لیتا ہے، اور انسانوں کی ذہنی و روحانی تبدیلی کو ضروری قرار دیتے ہوئے کبیر داس کے یہ الفاظ اعتماد اور یقین کے ساتھ دہراتا ہے: "جسم و جان کے رن میں گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے، ہوس، غصہ، غرور اور لالچ مقابلے پر کھڑے ہیں، صبر، قناعت اور صداقت کی بادشاہت میں شمشیر کا نام بلند ہو رہا ہے ...... صداقت کے متلاشی کی جد و جہد بہت دشوار ہے، سورما کی لڑائی دو چار گھنٹے چلتی ہے ..... لیکن صداقت کا متلاشی دن رات جنگ کرتا ہے، اس کی لڑائی زندگی کے آخری لمحہ تک جاری رہتی ہے۔"

ضیاء الحسن فاروقی

ژاں ژاک روسو

(۱۷۱۲ء—۱۷۷۸ء)

روسو سے متعلق متضاد رائیں بیان کی گئی ہیں، کوئی اُسے فلسفی کہتا ہے اور کوئی محض آوارہ منش اور منتشر المزاج شخص جس نے اپنے ذاتی مصائب کے ردعمل کے طور پر اپنے عہد کی ہر چیز کی نفی کی، ان دونوں رایوں میں افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے، اٹھارویں صدی میں 'فلسفی' کا لفظ جس مفہوم میں استعمال کیا جاتا تھا، اُس لحاظ سے تو اُسے فلسفی کہہ سکتے ہیں لیکن آج کے معیار پر اسے کسی طرح فلسفی نہیں کہا جا سکتا، پھر بھی اس نے جو کچھ لکھا اس بنیاد پر اُسے محض منتشر المزاج بھی نہیں کہا جا سکتا، اس کی تحریروں کا اثر ہوا اور اتنا اثر ہوا کہ اُس کا شمار انقلاب فرانس (۱۷۸۹ء) کے ارکان ثلاثہ میں ہوتا ہے، اپنے خیالات و افکار کی بنا پر وہ بلاشبہ اپنے عہد کی ایک دور آفریں سماجی طاقت بن گیا تھا۔ اس کی تحریروں کے اثر سے جرمنی، فرانس اور انگلینڈ میں نئی سیاسی اور ادبی تحریکوں نے جنم لیا،

ایک مرتبہ ایک مجلس میں انگریزی علم و ادب کا غیر معمولی انسان اور انقلاب فرانس کا سب سے بہتر نقاد [illegible] کارلائل موجود تھا، لوگ فلسفیوں کی خیالی نقش آرائیوں پر بحث کر رہے تھے۔ ایک شخص [illegible] اجتماع و معاشرت کے انقلابات کے نقشے ایک دل خوش کن تخیل سے زیادہ نہیں [illegible] کی بھنک کارلائل کے کانوں میں پڑی، اس نے مجمع کو مخاطب

کہ کہا — حضرات، کچھ عرصہ گذرا اس دنیا میں ایک شخص تھا، روسو، اس نے ایک کتاب لکھی تھی جب یہ کتاب شائع ہوئی تو بہت سے آدمیوں نے اس کی ہنسی اڑائی، لیکن جب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس کی جلد باندھنے کے لئے ان ہی لوگوں کے جسم کا چمڑا استعمال کیا گیا جنھوں نے اس کی ہنسی اڑائی تھی" قطع نظر اس کے کہ اس واقعہ میں کتنی حقیقت ہے، اس سے روسو کی تحریروں کی اثر آفرینی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اُس نے کیا کہا اور کیا لکھا یہ جاننے سے پہلے ضروری ہے کہ اُس کے حالات زندگی پر ایک نظر ڈال لی جائے کہ اِس سے اُس خمیر کا پتہ چل جائے گا جس سے اس کا نظام فکر، اگر ہم اسے نظام فکر کہہ سکیں، تیار ہوا تھا۔

روسو[1] ۱۷۱۲ء میں سوئستان کے شہر جنیوا میں پیدا ہوا، اُس کا باپ آئزک روسو ایک غریب گھڑی ساز تھا، بعد میں اس نے عورتوں کو ناچ سکھانے کا پیشہ اختیار کر لیا تھا، اس کی ماں ایک شریف عورت تھی لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ وہ اِس نیک خاتون کی آغوش محبت میں پرورش پائے، چنانچہ ابھی وہ بچہ ہی تھا کہ ماں کا انتقال ہو گیا، اُس کا باپ کیل وِنی چرچ کا ماننے والا تھا، اسی لئے اس مسلک پر اُس کی تعلیم بھی ہوئی، چھ سال کی عمر میں اُس نے پڑھنا شروع کیا، ساتھ ہی باپ اُسے افسانے اور خیالی قصے پڑھ کر سناتا۔ اس کا نانا ایک تعلیم یافتہ پادری تھا اور اُس کی ذاتی لائبریری میں تاریخ اور ادب کی اچھی کتابیں تھیں، اس نے "اعترافات" میں ایسی کئی اچھی کتابوں کا ذکر کیا ہے، جن میں پلوٹارک

۱۔ روسو نے اپنی زندگی کے حالات اپنی خود نوشت سوانح حیات "اعترافات" میں بڑی تفصیل سے لکھے ہیں، لیکن اس نے بہت سی باتیں صحیح نہیں لکھی ہیں، اُسے اس بات میں لطف آتا تھا کہ اپنے آپ کو بڑا گنہگار ثابت کرے، لیکن خارجی شواہد بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ معمولی نیکی اور اخلاق سے بھی عاری تھا اور اس سے وہ کبھی پریشان اور نادم نہیں ہوا، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس کے دل میں بڑا سوز و گداز ہے، یہ اور بات ہے کہ اپنے بہترین دوستوں کو بھی وہ اپنی چھوٹی حرکتوں سے نہیں بخشتا تھا۔

کی 'مشاہیر کی سوانح حیات' کا خاص طور سے ذکر ہے، پلوٹارک اُسے بہت پسند تھا، اس کے سوانح نگار
جان مورلے نے لکھا ہے کہ اپنی عمر کے آخری دنوں میں بھی جب کہ اُس نے مطالعہ تقریباً ترک کر دیا تھا وہ
پلوٹارک کو پڑھا کرتا تھا، اُس نے کہا ہے کہ غالباً وہی ایک مصنف ہے جس سے اس نے ہمیشہ استفادہ کیا
ہے۔ لیکن باپ کے ساتھ موم بتی کی روشنی میں ناول اور افسانے پڑھنے کے سبب بچپن ہی سے اس میں
تخیل پرستی رچ بس گئی اور اُس کی سیرت کا توازن بگڑ گیا، ابھی وہ دس سال ہی کا تھا کہ اس کا باپ
اُسے چھوڑ کر فرار ہو گیا ۔ اب اس کی
پرورش اور دیکھ بھال اور پڑوسیوں کے ذمہ تھی، روسو کے ایک چچا تھے برنارڈ، انہوں نے
اُسے اپنے بیٹے کے ساتھ بوسی نام کے گاؤں میں ایک پروٹسٹنٹ پادری کے پاس حصول تعلیم کے لئے
بھیجا۔ وہ وہاں سے زیادہ دن نہیں سکا، جن حالات میں اس نے بوسی کو چھوڑا وہ اسے
بھولے نہیں۔ 'اعترافات' میں اس نے اس کا ذکر کیا ہے، اور اس سلسلہ میں جن خیالات کا اظہار
کیا ہے ان سے اس کی جذباتی طبیعت کے ہیجان کا اندازہ ہوتا ہے، بوسی کے قیام کے دوران پادری
کی بہن نے اس پر کنگھا توڑنے کا الزام لگایا، حالانکہ اس کے کہنے کے مطابق وہ بے قصور تھا، اس
کی بہت پٹائی ہوئی، سختیاں کی گئیں اور اس کی اطلاع اس کے چچا کو بھی کی گئی، لیکن اس نے برابر انکار کیا،
وہ لکھتا ہے: "اس واقعہ پر تقریباً پچاس سال گذر گئے اور اب مجھے اس کا خطرہ بھی
نہیں رہا کہ میں اس کے لئے سزا کا مستحق ٹھہرایا جاؤں گا، اس کے باوجود میں خدا کے سامنے یہ بات کہتا
ہوں کہ میں بالکل بے قصور تھا، میں نے تو کنگھے کو چھوا تک نہ تھا، مجھے کچھ معلوم بھی نہیں تھا، مجھ سے یہ
پوچھنا کہ نقصان کیسے ہوا بیکار تھا، میں نہیں جانتا، میں سمجھ بھی نہیں سکتا، میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ
اس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا" ۔ اب ذرا اس بچے کا تصور کیجئے جو شرمیلا اور فرمانبردار تھا لیکن
آتشیں اور سرکش جذبات رکھتا تھا، ایسا بچہ جو معقولیت اور شریفانہ اور منصفانہ برتاؤ کا عادی تھا، اور
جو اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اُن لوگوں کے ہاتھوں ایسی خوفناک ناانصافی کا شکار ہوا تھا جن سے وہ محبت
کرتا تھا اور جن کے ساتھ ہمیشہ انتہائی ادب سے پیش آتا تھا ــــ خیالات کا وہ ہیجان، جذبات

[illegible]

لوگ زندگی کے لفظ سے بھی آشنا نہیں ہوتے، یہی عالم تھا کہ ایک دن جب وہ شہر کے باہر گیا اور [illegible] میں اتنی دیر کردی کہ شہر کے دروازے بند ہو گئے تو اُس نے شہر پناہ پر حسرت کی ایک نگاہ ڈالی، [illegible] کو الوداع کہا اور دنیا کی سیر کو نکل پڑا، نہ معلوم وہ کون سی گھڑی تھی کہ اُس دن کے بعد پھر اُسے کہیں

[illegible]

[illegible] اسے نکل کر وہ سَوائے (Savoie) پہونچا اس حالت میں کہ اُس کے پاس زندگی گذارنے کا کوئی سامان نہ تھا، مجبور ہو کر وہ ایک کیتھولک پادری کے پاس پہونچتا ہے اور اس سے درخواست کرتا ہے کہ اُسے کیتھولک چرچ میں داخل کرلیا جائے۔ اس طرح اُس نے اپنا آبائی مسلک ترک کردیا، اُس [illegible] کہ تبدیلی مذہب کے بارے میں اس کی نیت میں اخلاص نہیں تھا۔ "میں یہ خیال اپنے ذہن سے [illegible] مقدس کام جو میں کرنے والا تھا، دراصل ایک لٹیرے کا کام تھا" لیکن یہ بات اس نے اُس وقت کہی جب اُس نے پھر پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کرلیا تھا، بہرحال کیتھولک مذہب اختیار [illegible] بعد وہ اَن سی کے چرچ میں بھیجدیا گیا، چرچ کی انچارج ایک خاتون مادام دے وراں تھیں، ر[illegible] اعترافات" میں مادام کے حسن، ذہانت اور مہذب طور طریقے کی بڑی تعریف کی ہے، اُس نے [illegible] میں نے انھیں دیکھا اور بس انھیں کا ہوگیا، میں نے سوچا کہ جس مذہب کی تبلیغ اتنی حسین شخصیت [illegible] وہ مذہب یقیناً جنت کی بشارت دیتا ہوگا"، کوئی نو دس سال وہ اس خاتون کے ساتھ [illegible] بے آسودگی اور اطمینان سے گذرا، یہاں کے قیام کے دوران اسے ہر طرح کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا، ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، عالم بھی اور فنکار بھی، معالج بھی اور بیمار بھی، مذہبی اشخاص بھی اور لامذہب بھی، اور اس نے ہر شخص سے کچھ نہ کچھ ضرور سیکھا، یہیں اس نے دینیات کے سبق پڑھے، موسیقی کا علم حاصل کیا اور لاطینی زبان میں دستگاہ بہم پہنچائی، سیاسی اور سماجی مسئلے اُس کی توجہ کا مرکز بنے اور اپنی بعض تصنیفوں کا ابتدائی خاکہ بھی اس نے یہیں اپنے ذہن میں جمایا ــــ

اور آخرکار ایک دن مادام دے وراں کی بے وفائیوں سے تنگ آکر امید و بیم کی نئی جولانگاہ کی تلاش میں [illegible] ہوا۔ اس کے بعد وہ تین چار سال تک اِدھر اُدھر آوارہ گردی کرتا رہا، لیاں میں اُس کا

…پر نظر پڑتے ہی میری دنیا بدل گئی، اچانک کائنات کھل کر میرے سامنے آگئی۔
… وجدان کوئی چیز ہے تو اس کا احساس مجھے اسی لمحہ ہوا جب میری نظر ان الفاظ پر پڑی،
میرا ذہن روشنی سے معمور ہو گیا، خیالات کا ایک سیلاب تھا کہ رکنے کا نام نہ لیتا تھا، یہ
سیلاب اتنا تند اور ہنگامہ خیز تھا کہ ذہنی طور پر میں ایک ایسے ہیجان میں مبتلا ہو گیا جسے
میں بیان نہیں کر سکتا، مجھ پر خمار کی سی کیفیت طاری ہو گئی، میرا دل دھڑکنے لگا اور میں درخت
… لیٹ گیا، کوئی آدھ گھنٹے بعد اس کیفیت کا نشہ جب اترا تو میں نے اپنے کوٹ
… آنسوؤں سے تر پایا، یہ آنسو کب نکلے اس کی مجھے خبر بھی نہیں، میں نے اس درخت
… محسوس کیا اگر میں اس کا چوتھائی حصہ بھی قلمبند کر سکتا تو میں کس خوبی اور صفائی
… اپنے سماجی نظام کے متضاد اور متصادم عناصر کا بھانڈا پھوڑتا! کتنے زوردار
انداز میں اپنے اداروں کی غلط کاریوں اور مضرت رسانیوں کا پردہ چاک کرتا! اور
کتنی سادگی سے دنیا کو بتاتا کہ آدمی فطری طور پر نیک ہے اور یہ ہمارے ادارے ہیں
جنہوں نے اسے بدطینت اور بدکار بنا دیا ہے۔"

… مقالہ لکھا اور مخالفت میں لکھا لیکن اسے پہلا انعام ملا، یہ ۱۷۴۹ء کا واقعہ ہے۔ اب
… شہرت کا دروازہ کھل گیا اور جلد ہی وہ اپنے زمانے کا ممتاز عالم تسلیم کر لیا گیا، لیکن اس سے
یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس کی زندگی کی مصیبتیں بھی ختم ہو گئیں۔

… زمانے میں وہ مادام دیوپاں کا سکریٹری تھا، اُسے کچھ عرصہ کے لئے وینس میں فرانسیسی سفیر
کے … سے کام کرنے کا موقع ملا، لیکن سفیر سے کسی معاملہ میں اختلاف ہو گیا اور پیرس واپس
… میں اُس نے قیام کیا اس کی مالکہ آرلیاں کی رہنے والی تھی، وہ اپنی مدد کے
لئے ایک لڑکی لائی تھی جس کا نام تھریسی تھا، تھریسی کا تعلق ایک معزز خاندان سے تھا لیکن
بعد میں اس خاندان پر مصیبت آئی اور تھریسی کو مجبوراً پیرس آنا پڑا۔ روسو نے جب اس لڑکی کو دیکھا
تو اپنے دل میں اس کے لئے ایک کشش محسوس کی، پھر اسے اس کی مظلوم جوانی پر بھی ترس آیا …

محسوس کیا کہ وہ مجھے جلد ہی ایک تماشا بنا دیں گے، میرے نزدیک اس سے بڑھ کر بے رحم اور تباہ کن محکومی اور کوئی نہیں، اس لئے میرے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں کسی کا لحاظ کئے بغیر چھوٹے بڑے تمام ہدیے واپس کر دوں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تحفے تحائف کی بارش شروع ہو گئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ میری مزاحمتی صلاحیتوں پر قابو پانا چاہتے تھے، لیکن جب انھیں مایوسی ہوئی تو پھر وہ میرے انکار کو نمود و نمائش اور غرور و نخوت سے تعبیر کرنے لگے۔

۱۷۵۲ میں روسو نے Devin du village ایک غنائی تمثیل لکھی، اس تمثیل کا منظر عام پر آنا تھا کہ سارے پیرس میں اس کی دھوم مچ گئی، لیکن یہ شہرت اُس کے لئے مصیبت بن گئی، دوسرے ادیب اور تمثیل نگار اس سے حسد کرنے اور اس کے خلاف سازشوں کا جال بننے لگے، اس کی یہ تمثیل شاہی دربار میں بھی اسٹیج کی گئی اور بہت پسند کی گئی، خاص طور سے میوزک کی فنکارانہ ترتیب نے ناظرین کا دل موہ لیا۔ روسو اس موقع پر خود موجود تھا، اُسی دن اُسے یہ پیغام ملا کہ آسے کل گیارہ بجے بادشاہ کے حضور حاضر ہونا ہے، پیغام دینے والے نے یہ بھی کہا کہ بادشاہ غالباً اس کے لئے وظیفہ کا اعلان کریں گے، روسو نے تمام رات آنے والی اس آزمائش کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ وہ بادشاہ کے سامنے نہیں جائے گا، پیرس کا خوشامد پسند طبقہ اس کی اس ’حرکت‘ پر حیران و ششدر رہ گیا، دشمنوں نے اُسے مغرور و خود بیں قرار دیا اور دوستوں نے اسے احمق کہا، حتیٰ کہ ڈیڈرو بھی اُس کی اس ’حرکت‘ کی علت کو نہ سمجھ سکا۔

۱۷۵۳ میں ڈیژون اکیڈیمی کی طرف سے ایک اور انعامی مضمون کا اعلان کیا گیا جس کا عنوان تھا ”انسانوں میں عدم مساوات کی ابتدا“ بلاشبہ عنوان اہم اور علمی تھا اور اٹھارویں صدی کے جاگیردارانہ

ہیوم نے اپنی کتاب میں اسے معمولی واقعہ کے طور پر ذکر کیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے روسو کے بیان کو مبالغہ تصور کیا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ چونکہ روسو جسمانی طور پر کمزور واقع ہوا تھا اور وہ بادشاہ کے حضور دماغ اور جسم کی ہیجانی کیفیات پر قابو نہیں رکھ سکتا تھا اس لئے اس نے نہ جانے کا فیصلہ کیا۔

[illegible]

وہ اپنے وطن کا شہری نہیں ہو سکتا محض اس لئے کہ اُس نے اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ دیا تھا، یہ احساسِ ندامت اتنا قوی ثابت ہوا کہ اس نے پروٹسٹنٹ مذہب اختیار اور جنیوا میں مستقل قیام کا فیصلہ کر لیا، روسو جیسے مزاج کے شخص کے نزدیک یہ بات بڑی عجیب وغریب تھی کہ ایک مذہب کے ماننے والے مختلف گروہوں میں تقسیم ہو کر اس مذہب کی مختلف شکلیں بنا لیں اور ہر گروہ اپنی بنائی ہوئی شکل ہی کو سچے مذہب سے تعبیر کرے، اس کا خیال تھا کہ عیسائیت پر اُن لوگوں نے جو اسے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اختلافات کے دبیز پردے ڈال دیئے ہیں، اس لئے ہر ملک کے ساورین (مقتدر اعلیٰ) کو یہ حق ہونا چاہئے کہ وہ تمام شہریوں [illegible] پرستش کا ایک ہی طریقہ متعین کر دے اور پھر ہر شہری کو چاہئے کہ وہ قانون کے آگے سر جھکا دے، جنیوا میں چار مہینے قیام کر کے وہ پیرس واپس آیا اور چونکہ وہ بعض اسباب کی بنا پر فوراً پیرس کو چھوڑ نہیں سکتا تھا، اس نے حسب معمول اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں، اس وقت 'عدم مساوات' متعلق اس کا مقالہ ہالینڈ میں چھپ رہا تھا اور وہ اس کے پروف پڑھنے میں منہمک تھا، اس مقالے کا انتساب اس نے جنیوا کی 'ری پبلک' کے نام کیا تھا، اُسے اندیشہ تھا کہ وہاں کی کونسل اس انتساب سے اچھا اثر نہیں لے گی، اس لئے اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ مستقل قیام کی غرض سے جنیوا جانے سے پہلے اس کا انتظار کرے کہ جنیوا کا ردعمل اس انتساب کے بارے میں کیا ہوتا ہے، روسو کا اندیشہ صحیح ثابت ہوا، کچھ اس وجہ سے اور کچھ اس لئے بھی کہ والٹیر نے جنیوا کے قریب مکان بنا کر مستقل قیام کا انتظام کر لیا تھا اس نے جنیوا میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ بدل دیا۔

۱۷۵۶ء میں مادام دے پینے نے جو روسو کی بڑی معتقد تھیں پیرس سے کچھ فاصلے پر موں موں رانسی کے جنگل میں اس کے لئے ایک گوشۂ تنہائی کا انتظام کر دیا، مادام اس کی طبیعت سے [illegible] واقف تھیں اور چند روز پہلے جب وہ ان کے ساتھ پیرس سے باہر تفریح کے لئے گیا تھا، تو اس نے ایک مکان کو جسے 'خانقاہ' (L'Ermitage) کہتے تھے، بہت پسند کیا تھا اور کہا تھا کہ 'یہ مقام میرے لئے بہترین پناہ گاہ ہے' مادام نے ضروری انتظام کر کے یہ مکان اُسے ہدیۃً پیش کر دیا، اور وہ وہاں منتقل ہو گیا، لیکن تھوڑے عرصہ بعد جب مادام سے اُس کے معاملات

بگڑ گئے تو اُس نے یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا جہاں وہ تقریباً پانچ [illegible]
[illegible] سول سول رانسی کے جنگل میں اُس نے جو مدت گذاری وہ تصنیفی و تخلیقی اعتبار سے بڑی اہم
[illegible] رہے، اس جنگل میں آسے فطرت کا قرب، سکون اور بے فکری حاصل تھی، اسی زمانے میں اس
[illegible] مشہور کتابیں "امیل" (Emile)، "لانوول الوائیس" (La Novella Heloise)
[illegible] کنترات سوشیال" (Le Contrat Sociala) لکھیں، "امیل" میں اُس نے فطری
اصولوں کے مطابق تعلیم کے موضوع پر لکھا ہے، اس کتاب پر اس کی کوئی گرفت نہ ہوتی اگر اس میں
[illegible]، جیسا کہ وہ سمجھا تھا، فطری مذہب کے اصولوں پر خیال آرائی نہ کی ہوتی، معاہدۂ عمرانی (لے کنترات
سوشیال) اس سے زیادہ باغیانہ تھی کہ اس میں جمہوریت کی تبلیغ تھی اور بادشاہوں کے خداداد حق فرمانروائی
سے انکار کیا گیا تھا۔ ان دونوں کتابوں سے اُسے اور شہرت ملی لیکن سیاست اور مذہب کے اجارہ دار
اور حکمراں طبقہ، سب نے روسو کے خلاف محاذ بنا لیا[1]، اور اسے فرانس کی سرزمین چھوڑنی پڑی، جینیوا
وہ نہیں جا سکتا تھا، برن نے پناہ دینے سے انکار کر دیا، آخر کار پروشیا کے بادشاہ فریڈرک اعظم
کو اس پر ترس آیا اور اُس نے آسے جرمنی کے اُس علاقے میں آجانے کی دعوت دی جو اُس کی قلمرو میں
شامل تھا، یہاں وہ موٹیرلس نامی گاؤں میں قیام پذیر ہو گیا، اس گاؤں میں وہ تقریباً تین سال رہا، لیکن
۱۷۶۵ء میں اُسے انگلینڈ بھاگنا پڑا، انگلینڈ میں شروع شروع میں معاملات ٹھیک رہے، اس کی قدر
کی گئی اور جارج سوم نے اس کی پنشن مقرر کر دی، برک سے وہ تقریباً روز ملتا لیکن جلد ہی دونوں میں
ناچاقی ہو گئی، ہیوم سے بھی اس کی دوستی تھی لیکن اب چونکہ روسو کو ہر طرف دشمن ہی نظر آتے تھے
اس لئے ہیوم پر بھی اسے شبہ ہونے لگا اور اس طرح دونوں کے اختلافات بڑھتے گئے، غرض کہ اس

۱۔ جینیوا کی کونسل نے فرمان صادر کیا کہ دونوں کتابیں جلا دی جائیں اور اگر روسو جینیوا آئے تو فوراً گرفتار
کر لیا جائے۔ فرانس کی حکومت نے بھی اس کی گرفتاری کے احکامات صادر کئے۔ سوربان اور پیرس کی پارلیمنٹ
نے "امیل" پر پابندی لگا دی۔

کی اپنی روشنیٔ طبع اس کے لئے بلا بن گئی، اس کے انقلابی خیالات نے یورپ کے سارے اہل کلیسا اور اہل [illegible] کو اس کا مخالف بنا دیا تھا، اُسے کہیں چین نہ ملا، جہاں جاتا تھا وہیں مردود و مقہور ٹھہرتا تھا، آخر [illegible] سات آٹھ سال کی جہاں گردی کے بعد وہ پھر پیرس واپس آگیا اور ایک بوسیدہ مکان میں ایک کمرہ کرایے پر لے کر زندگی کے دن گذارنے لگا، آخر کے یہ چند سال اس پر بڑے سخت گذرے، [illegible] دنوں میں اُس نے اپنی مشہور تصنیف "اعترافات" (Confessions) مرتب کی اور ایک رسالہ لکھا جس کا نام تھا "تنہا گھومنے والے کی اُدھیڑ بُن" (Reveries du Promeneur Solitaire) - یہ دونوں کتابیں اُس کے مرنے کے بعد شائع ہوئیں[1]۔ اس کی [illegible] مفلوک الحالی کی حالت میں ۱۷۷۸ء میں ہوئی، کہا جاتا ہے کہ حالات سے تنگ آکر اُس نے خودکشی کر لی تھی۔

(باقی)

1۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، فرانسیسی ادب، انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۶۲ء، صفحہ ۲۳۹

رؔوش صدیقی

مسندِ گل

طفلیٔ خیال کو ہوش میں کوئی لائے کیوں
شعلۂ طور ہی سہی ہم سے نظر ملائے کیوں

ہم سے کچھ اور ہی کہا، ان سے کچھ اور کہدیا
بادِ صبا یہ کیا کیا، تونے یہ گل کھلائے کیوں

قیس کا حاصلِ جنوں، ناقہ و محمل و حجاب
لیلیٔ نجد آشنا، خلوتِ دل میں آئے کیوں

عقل حریصِ خار و خس صورتِ شعلۂ ہوس
دولتِ سوزِ جاوداں عقل کے ہاتھ آئے کیوں

گردشِ مہر و ماہ بھی گردشِ جام بن گئی
صبح نہ لڑکھڑائے کیوں، شام نہ جھوم جائے کیوں

طالبِ حجلۂ بہار دشت طلب ہے خارزار
وقت کسی کی راہ میں مسندِ گل بچھائے کیوں

حشر میں حسن سے رؔوش! شکوۂ روبرو غلط
روزِ ازل کی بات ہے آج ہی یاد آئے کیوں

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

یا۔ بلاشبہ زور ان لوگوں میں شامل ہیں جو ادب کو فنون لطیفہ کی ایک شاخ سمجھتے ہیں اس
ساتھ اپنے نظریہ پر اصرار نہ کرنا ہی زور کی بزرگی کے بھرم کو قائم رکھنے میں معاون ثابت ہوا۔ میں
[illegible] کوئی نقاد ایسا بھی ہے جس نے اپنے طور پر کوئی نظریہ پیش کیا ہو سبھی نقاد [illegible]
[illegible] اردو میں پیش کئے گئے ہیں وہ مغربی ذہن کی پیداوار ہیں۔ اس لئے مشرقی فضا میں
[illegible] ان کی آبیاری ممکن نہ ہو سکی۔ میں ادبی نظریہ یا ادبی عقیدہ کو مغرب و مشرق کے خانوں میں بانٹنے کا
[illegible] ہوں، میرا ایقان تو انسانی وحدت پر ہے۔ لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مغربی نظریہ چونکہ صرف
مغربی ہے اس لئے وہ محدود ہے وہ انسانی زندگی پر کسی بھی طرح محیط نہیں ہو سکتا اس لئے وہ مشرق میں
پنپ نہیں سکتا۔ یہی کچھ حال مشرقی افکار و اذکار کا ہے۔ دراصل ہمیں تنقید کے لئے ایک ایسے عقیدہ کو
بنیاد بنانا ہوگا جو ہمہ گیر بھی ہو اور ابدی بھی۔ اور یہ نظریہ کسی عالمگیر نظریہ حیات کا رہین منت ہو سکتا ہے۔ [illegible]
[illegible] حیات کو معراج کی طرف لے جاتا ہے۔ اور ایک اعلیٰ و ارفع عقیدہ کو اختیار کرنے کے لئے ہمیں قصہ
جدید و قدیم میں الجھنے کی ضرورت نہیں صداقتیں نئی بھی ہو سکتی ہیں اور ہزارہا سال پرانی بھی۔ سورج کی روشنی
پر سال و ماہ نظر انداز نہیں ہوا کرتے۔ اس وجہ سے انسانیت کی ارتقا کے لئے اس نظریہ کو اختیار کر لینا چاہئے
جو انسانی وحدت اور آزادی کی ضمانت دیتا ہے اور جس کی وجہ سے دنیا دارالامن بن جاتی ہے۔ میں تنقید
کی نظریاتی بحث میں نہیں جاؤں گا۔ یہ بات کسی اور محفل میں بھی ہو سکتی ہے۔ دراصل یہاں میں یہ کہنا چاہتا ہوں
کہ ڈاکٹر زور پر یہ اعتراض ہے کہ انھوں نے اپنا کوئی نظریہ پیش نہیں کیا۔ ہ واقعی ڈاکٹر زور کوئی نظ[illegible]
رکھتے بھی تھے یا نہیں، روح تنقید کے پیش نظر پھر میں وہی بات کہوں گا کہ یہاں وہ مفسر ہیں یا مبصر۔
نقاد نہیں ہیں۔ تاہم میں اپنی بات کو دہراؤں گا کہ ڈاکٹر زور ا[illegible] کو فنون لطیفہ کی شاخ سمجھتے ہیں یہی بات
[illegible] نے بھی کہی ہے۔ لیکن انہوں نے اس نظریہ کا اظہار واضح طور پر نہیں کیا ہے۔ یہ تو ایک بات ہوئی۔ دوسری
بات یہ کہ خود ان نقادوں کے یہاں تنقید کا کوئی اپنا نظریہ بھی ہے؟ سوائے اس کے کہ ان لوگوں نے جگالی کی
ہے۔ مارکسی نظریہ کے علمبردار ہوں یا لسانی اصولوں کے حاملین، یا پھر وہ لوگ جو رومانویت میں اپنا ایقان
رکھتے ہیں۔ ان سبھوں کی حیثیت ان بازاری چھوکروں کی [illegible] ایک جلوس کو جاتے ہوئے دیکھ کر اس کے

[illegible] یہ بھی نہیں پیچھے ہو لیتے ہیں اور جلوس والوں کے ساتھ زندہ باد و مردہ باد کے نعرے لگانے [illegible]
جانتے کہ یہ جلوس کہاں سے نکلا ہے اور کہاں [illegible] ہے؟ ظاہر ہے زور، اس جلوس میں شریک تو نہیں ہو سکتے
تھے البتہ دور کھڑے انھوں نے نظارہ [illegible] والوں کے ارمانوں [illegible] کے ذریعہ اردو ادب میں
محفوظ کر دیا۔ [illegible] کسی تخلیقی تنقید کی تو نہیں ہے بلکہ اس ٹیپ ریکارڈ کی سی ہے جس میں منظر
[illegible] کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔ ویسے [illegible] تنقید ڈاکٹر زور کی شاہکار تصنیف
[illegible] تنقید کی عظمت میں فرق آجائے۔ لیکن یہ اپنے وقت اور موضوع کی وجہ سے آج
[illegible]۔ دراصل "روح تنقید" ہے تو بڑھیا کے چراغ کی طرح۔۔۔ کم مایہ اور بے بساط [illegible]
جس کی [illegible] کی سیاہی میں راہوں کو اجاگر کیا۔ ادب و تنقید کی پر پیچ راہوں میں جبکہ چاروں طرف
[illegible] "روح تنقید" کا چراغ جلایا۔ اور اس چراغ کی روشنی میں جانے کتنے مسافر
[illegible] میا تو اب اپنی جھونپڑی میں موجود نہیں لیکن چراغ آج بھی سر راہ روشن ہے
[illegible] بھی اندھیروں میں گم ہے اس وجہ سے اس چراغ کی اہمیت باقی ہے اور جب تک
[illegible] چراغ یوں ہی جلتا رہے گا۔



عبداللطیف اعظمی

مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر

پروفیسر عبدالعلیم

مسلم یونیورسٹی کے ایک سینیر پروفیسر جناب ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کے وائس چانسلر ہونے کا جب اعلان کیا گیا تو لوگوں کو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ چار حضرات کا جو پینل حکومت ہند کو بھیجا گیا تھا اس میں ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کا نام آخر میں تھا، اس کے علاوہ تین بزرگوں کے مقابلے میں کم عمر بھی ہیں اور زیادہ معروف بھی نہیں۔

دوسرے دلی یونیورسٹی کے علاوہ جہاں کچھ ہی عرصہ ہوا اس کے ایک سینیر پروفیسر ڈاکٹر گنگولی صاحب کو وائس چانسلر مقرر کیا گیا ہے، ورنہ عام طور پر ابھی یہ روایت قائم نہیں ہوئی ہے کہ کسی یونیورسٹی کا سربراہ خود اسی کے کسی استاد کو بنایا جائے۔ اس طرح کی تجاویز تعلیمی حلقوں میں ضرور ہیں کہ صرف انھیں لوگوں کو وائس چانسلر مقرر کیا جائے جو تعلیمی میدان میں مصروف کار ہیں لیکن جو لوگ ایسی رائے رکھتے ہیں ان کا بھی خیال ہے کہ ایک یونیورسٹی کا پروفیسر دوسری یونیورسٹی میں مقرر کیا جائے تاکہ وہ مقامی اثرات سے آزاد ہو۔ دلی یونیورسٹی کی جس مثال کا میں نے ذکر کیا ہے وہ بھی پوری طرح مسلم یونیورسٹی کے نئے انتخابات پر صادق نہیں آتی۔ ایک تو دلی یونیورسٹی میں اتنے اختلافات نہیں ہیں جتنے مسلم یونیورسٹی میں دوسرے ڈاکٹر گنگولی وہاں کے پرو وائس چانسلر تھے۔ ان حالات میں جب ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کے نام کا اعلان ہوا تو حیرت ہونی ہی چاہئے تھی۔ خوشی اس لئے کہ ان کے نام پر ہر خیال کے لوگوں کو عام طور پر اتفاق ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ خود یونیورسٹی کے لوگ اس تقرر پر خوش اور مطمئن ہیں۔ جب حکومت کے سامنے پینل زیر غور تھا اور آخر میں یہ مشہور تھا کہ ڈاکٹر علیم صاحب کے علاوہ کوئی امیدوار میدان [illegible] رہ گیا ہے تو اس زمانے میں میں علی گڑھ گیا تھا اور مختلف حلقوں کی رائیں معلوم کرنے کا موقع ملا تھا۔ یونیورسٹی کے اندرونی حالات کے

پیشِ نظر، جن سے لوگ ناواقف نہیں ہیں، مجھے تعجب ہوا کہ میں جس سے بھی ملا وہ ان کے نام پر مطمئن اور
خوش تھا۔ ڈاکٹر عبد العلیم صاحب ایک ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے معروف ہیں اور معارف کی نظر میں [illegible]
کمیونسٹ ہیں، مگر حیرت تھی کہ وہ لوگ [illegible] کا ہم خیال سمجھا جاتا ہے، اس تقرر سے متفق
تھے۔ بات یہ ہے کہ شعبۂ عربی کے صدر، ادارۂ علوم اسلامیہ کے ڈائرکٹر اور مجلس تعلیمی اور مجلس منتظمہ کے رکن کی
[illegible] داری اور انصاف پسندی کا ثبوت دیا ہے، اس کی وجہ سے وہ [illegible]
مقبول اور ہر دلعزیز ہیں۔ ان میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ کم گو ہیں، مختلف فیہ مسائل میں، چاہے وہ مذہبی
[illegible] سیاسی [illegible] دخل نہیں دیتے، مزاج میں شگفتگی اور گفتگو میں نرمی ہے، مسائل کے تصفیہ میں [illegible]
سے زیادہ غیر جانبداری سے کام لیتے ہیں اور علمی مسائل میں معروضی انداز ان کی خصوصیات میں داخل ہے [illegible]
[illegible] یہی وجہ ہے، جہاں تک میرا خیال ہے، ان کا تقرر عمل میں آیا ہے اور ان کی ان ہی خصوصیات
کی [illegible] کے اس تقرر کا ہر حلقہ میں پرجوش خیر مقدم کیا گیا ہے۔

[illegible] ہندوستان کا پہلا تعلیمی ادارہ ہے، جس میں شروع سے شیخ الجامعہ اساتذہ میں سے ہی مقرر کئے
جاتے ہیں، اس کی وجہ سے جامعہ ان مسائل سے اب تک محفوظ رہی ہے، جن سے دوسری یونیورسٹیاں دوچار ہیں۔
[illegible] باوجود جامعہ کی اہم روایات اور قدیم خصوصیات بڑی حد تک باقی ہیں تو اس کا اہم سبب
یہ ہے کہ یہاں ایسے لوگ وائس چانسلر مقرر نہیں کئے گئے جو باہر کے ہوں یا تعلیم سے ان کا گہرا تعلق نہ ہو۔ اب
[illegible] یونیورسٹی میں بھی ایک ایسا شخص وائس چانسلر مقرر ہوا ہے، جس کی عمر تعلیم کی خدمت میں بسر ہوئی ہے اور
جو ایک طویل عرصے سے یونیورسٹی کی خدمت میں مشغول ہے۔ ڈاکٹر عبد العلیم کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ وہ
[illegible] قدیم طالب علم ہیں اور ان کی تعلیم و تربیت ایسے ماحول میں ہوئی ہے، جس میں اسلامی تہذیب
[illegible] میں تضاد نہیں سمجھا جاتا، جہاں طالب علم کو چاہے وہ کسی مذہب اور علاقے سے تعلق
[illegible]، ایک اکائی سمجھا جاتا ہے اور جہاں چھوٹی وفاداریوں پر بڑی وفاداریوں کو قربان نہیں کیا جاتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ پچھلے چند برسوں سے مسلم یونیورسٹی بڑے نازک دور سے گذر رہی ہے۔ اس سے
قبل ایک ایسے ہی نازک دور میں جامعہ کے وائس چانسلر اور مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائے جناب ڈاکٹر ذاکر حسین

[illegible] صاحب جس [illegible] میں چانسلر مقرر ہوئے تھے [illegible] تھی، ان [illegible]
نہ صرف یہ کہ مسلم یونیورسٹی کو تباہ ہونے سے بچا لیا بلکہ اس کو ترقی دے کر ہندوستان کی ممتاز یونیورسٹیوں کی
[illegible] ڈاکٹر علیم صاحب جن حالات میں اس کے وائس چانسلر مقرر ہوئے ہیں، اس [illegible]
نہیں کہ ان حالات سے بڑی حد تک مختلف ہیں، مگر نزاکت اور اہمیت کے لحاظ سے قریب قریب ویسے ہی ہیں
جیسے ذاکر صاحب کے تقرر کے وقت تھے، فرق اس قدر ہے کہ اس وقت اتر پردیش کی حکومت کو کچھ شبہات تھے اور یونیورسٹی کو خطرہ ریاستی حکومت سے تھا، اس وقت شبہات مسلمانوں کو ہیں اور خطرہ ان کی بے اعتمادی اور غلط فہمیوں سے ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کو مسلم یونیورسٹی کے بارے میں جو خدشات اور غلط فہمیاں ہیں وہ صحیح ہیں، مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنا اور ان کا اعتماد حاصل کرنا بہت ضروری اور مقدم ترین کام ہے۔ یہ کام یقیناً بہت مشکل ہے، ایک طرف مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنا، دوسری طرف ان میں بدلے ہوئے حالات کا احساس پیدا کرنا اور نئے ماحول میں انھیں نئے انداز سے سوچنے کی دعوت دینا ایک دوسرے کی ضد ہیں، مگر ان ہی متضاد فضا اور ماحول میں مطابقت پیدا کرنے پر کامیابی کا انحصار ہے۔

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے، وہ موجودہ حالات کا تقاضا ہے، ورنہ اس سے زیادہ اہم کام یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں صحیح تعلیمی فضا پیدا کی جائے، اس کے طالب علموں میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ انھیں دوسری یونیورسٹیوں کی طرف دیکھنے اور ان کی غلط مثالوں کو دلیل راہ بنانے کے بجائے، ہندوستانی مسلمانوں کی عزت اور وقار کی خاطر نظم و ضبط کا بہترین ثبوت دینا ہے اور اپنی خاطر اور اپنے مستقبل کی خاطر تعلیمی معیار کو بلند سے بلند تر کرنا ہے۔ ملک کی ایک اقلیت کی حیثیت سے وہ اقلیت کے خدشات کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں، اس لیے مسلم یونیورسٹی کی اقلیت کے ساتھ ان کا سلوک اور رویہ ایسا ہونا چاہیے کہ مثال کے طور پر بیان کیا جاسکے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب جس ادارے کے سربراہ مقرر ہوئے ہیں، وہ سرسید کی یادگار ہے۔ سرسید نے نہایت مشکل دور میں تعلیمی میدان میں مسلمانوں کی رہنمائی کی۔ شروع شروع میں ان کی قوم نے

ان کی باتوں کو سننے سے انکار کردیا اور ان کی مخالفت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس وقت بھی وائس چانسلر کی راہ خطرات سے پُر ہے، لیکن سرسید کی میراث کو اگر تباہی سے بچانا ہے اور بدلے ہوئے حالات میں ملک کے لئے اور مسلمانوں کے لئے مفید بنانا ہے تو حکومت اور اکثریت کے شبہات کو بھی دور کرنا ہوگا اور قوم کی مخالفت کو بھی جھیلنا ہوگا اور ان دونوں مشکلات کے باوجود صحیح راہ پر قائم رہنا اصلی اور حقیقی کامیابی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر ان دونوں مشکل راہوں سے کامیابی کے ساتھ گذر جائیں گے اور مسلم یونیورسٹی میں ایسی صالح روایت کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب ہوں گے جو یونیورسٹی کے نام کو روشن کرنے کا باعث ہوگی اور وہاں سے جو طالب علم نکلیں گے وہ سچے مسلمان اور سچے ہندو اور سکھ ہوتے ہوئے سچے ہندوستانی ثابت ہوں گے۔

صدر جمہوریہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے، جب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے تو اس وقت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد جب علی گڑھ تشریف لائے تھے تو فرمایا تھا:

"ہندوستانی تدبر اور ہندوستانی تعلیم دونوں کا بنیادی کام ہے یعنی ایک سیکولر جمہوری ریاست میں قوم کی تعمیر کا کام۔ اس کی زندگی میں ۴ کروڑ مسلمان شہریوں کا حصہ اور مقام۔ کتنا بڑا اہم ہے اور کیسا دلکش کام، یہ مختلف تمدنی و تہذیبی عناصر کو باہم سمو کر ایک متوازن اور ہم آہنگ زندگی کی تعمیر کا کام، جس میں ہر جزو دوسرے جزو کی رونق کو چمکائے اور ایک حسین وجمیل کل کی صورت بندے۔ ماضی کے سارے خزانوں کو چاہے کہیں سے آئے ہوں ہر ہندوستانی کی مشترک میراث بنا دینا کہ سب ہمارے ہی گم شدہ لعل ہیں، سب کو ایک مشترک ماضی سے مالا مال کر کے سب کو مستقبل میں ایک جدوجہد کا ولولہ بخشنا کوئی چھوٹا کام ہے؟ اس عزیز وطن کے ہر مسلمان شہری کے ذہن میں یہ یقین رچا دینا کہ ان کا دین اور ہندوستانی زندگی کو صالح زندگی بنانے میں ان کا مخصوص منصب، یہ ان پر ذمے داری کا ایک اور بوجھ ڈالتے ہیں اور ساتھ ہی موقع پیش کرتے ہیں، یہ بے وفائی یا بے اعتنائی کا بہانا نہیں ہیں۔ کچھ چھوٹا کام ہے یہ؟"

صالحہ عابد حسین

[illegible]

میں اسے بچپن سے جانتا تھا جب وہ چھوٹی سی الھڑ لڑکی تھی جو بال بکھرائے، اقبال کے شعر گنگناتی، [illegible] دوڑتی بھاگتی پھرتی تھی، تب بھی میری اس کی دوستی تھی اور آج جب وہ بہت بڑی فن کار بن [illegible] لوں میں ویسی ہی بے تکلفی تھی۔ وہ ایک ایسے گھرانے کی لڑکی تھی جس میں علم و مذہب [illegible] کی روایت مدت سے چلی آتی تھی اور بزرگوں سے یہی ورثہ اس نے بھی پایا تھا۔ [illegible] کا اسے بے حد شوق تھا۔ بے سمجھے بھی اقبال، غالب، حالی، نذیر احمد اور پریم چند [illegible] جب لوگ مذاق اڑاتے تو آنکھوں میں بھرے آنسو پی کر کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ اقبال کا یہ شعر وہ اپنی چھوٹی سی سریلی آواز میں لہک لہک کر گایا کرتی تھی ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

میں ہنس کر اس سے اس شعر کا مطلب پوچھتا اور اس کی اماں بھرائی آواز میں کہتیں "میری بچی ــ تو ابھی کیا جانے کہ یہ خودی کیا چیز ہے ــــ" تو وہ حیران ہو کر ان کو دیکھنے لگتی اور میں سر جھکا لیتا کہ جانتا تھا کہ صبر و قناعت، خودداری و عالی ظرفی کی اس دیوی نے شوہر کی وفات کے بعد کیسی کیسی کٹھنائیاں جھیلیں [illegible] اپنے بچوں کی پرورش اور تعلیم میں کسی قریبی سے قریبی عزیز کا احسان اٹھانا گوارا نہیں کیا۔ انھیں [illegible] کے وقار اور عزتِ نفس کا بڑا پاس تھا۔ بیٹی کو اپنے مرحوم باپ سے بڑی عقیدت تھی، وہ انھیں [illegible] سے افضل اور عام انسانوں سے بلند کوئی ہستی سمجھتی جنھیں اس نے دیکھا تو نہ تھا مگر ان کے علم و ادب کے خزانے کو پڑھا تھا اور بہت کچھ سنا تھا۔ بھائی بڑے تھے اور تعلیم کی خاطر ماں سے دور رہتے تھے۔ اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے وہ بچپن ہی سے ماں کی دوست اور مشیر بھی

بن گئی تھی ۔ آج اس دیوی کی وفات کے برسوں بعد بھی جب ان کا ذکر آتا اس کے چہرے پر عقیدت کا وہ گہرا رنگ اور آنکھوں میں محبت کے آنسوؤں کی دمک پیدا ہو جاتی ۔ آج بھی ماں اس کے خیالوں اور [illegible] تھیں ۔ خودداری وقناعت کچھ اسے ماں کی تربیت سے، کچھ باپ سے ورثے میں ملی تھی اور [illegible] کی صحبت سے حاصل کی تھی ۔۔۔ اور ان سب کا ملا جلا اثر یہ تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ حساس اور خوددار تھی جس کا لازمی نتیجہ نازک مزاجی تھی ۔ قناعت اور جفاکشی اس کی سیرت کے جوہر تھے ۔ بڑی سے بڑی مصیبت اور کٹھنائی میں بھی اس کی آنکھوں میں چاہے آنسو ہوں مگر ہونٹوں پہ مسکراہٹ کھیلتی آپ دیکھ سکتے تھے ۔

میری اور اس کی عمر میں بارہ پندرہ برس کا فرق ہوتے ہوئے بھی بہت دوستی تھی ۔ جب اس چھوٹی سی لڑکی کی کہانیوں اور شعروں کا لوگ مذاق اڑاتے تب بھی میں بڑی سنجیدگی سے ان پر بحث مباحثہ کرتا رہتا ۔۔۔ دیتا اور کبھی کبھار اصلاح بھی ۔ وہیں سے ہماری دوستی شروع ہوئی ۔ آج وہ بہت سی کتابوں کی مصنف اور ملک کی مانی ہوئی ادیب تھی مگر جب ہم دونوں ملتے تو اسی طرح میں اس کی چیزوں کا مذاق اڑاتا ، وہ مجھ سے جھگڑتی ، میرا مذاق اڑاتی ، میں اس کو چھیڑتا اور پھر ہم دونوں خود اپنے پر اور ایک دوسرے پر فقرے کس کر ہنستے ۔۔۔ ملاقات بہت کم ہوتی مگر جب ہوتی تو اسی فضا میں ۔

بہت دن بعد میں اس سے ملنے گیا تو وہ اپنے چھوٹے سے گھر کے سامنے رنگ برنگے پھولوں اور پتوں کے درمیان بید کی کرسی پر نیم دراز تھی اور گود میں کھلی ہوئی کتاب پڑی تھی ۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور پپوٹوں کی سرخی چغلی کھا رہی تھی کہ وہ روتی رہی ہے اور چہرہ بھرا بھرا اور سوجے ہوئے تھے ۔۔۔ الٰہی ۔۔۔ آج وہ کس سے لڑی ہے ؟

میں نے پاس بیٹھ کر چائے کی فرمائش کی ۔ وہ اٹھی ۔ چائے بنا کر لائی اور ہم دونوں چائے پینے لگے ۔ آسمان پہ بادل گھر آئے تھے ، ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی ، دلی کی سڑی گرمی نے اس وقت بڑے خوشگوار موسم کا روپ دھار لیا تھا ۔ دور سے کوئل کی شیریں آواز کانوں میں جیسے رس گھول

"بڑا سہانا موسم ہے"

"[illegible] ہے بہت موزوں"

"[illegible] آئیڈیل"

"[illegible] پلنگ پر سوئی ہو ــــ یا کسی سے لڑی ہو ــــ آج کل تو وہ بھی موجود نہیں
جن سے [illegible] تم اپنا پیدائشی حق سمجھتی ہو"

"[illegible] کے لئے یہ چہلیں اس وقت رہنے دیجئے" اس نے بیزاری سے کہا

"[illegible]؟"

"اُف ــــ یہ دنیا والے کتنے بے درد ہوتے ہیں"

"تعریف کا شکریہ" میں نے جھکتے ہوئے کہا "ورنہ ہم کس قابل ہیں"

"آپ لوگ جانتے ہی نہیں کہ ایک فنکار کا دل کتنا حساس ہوتا ہے..."

"[illegible] بیچارے دنیا والوں کو گالیاں دی جا رہی ہیں" میں نے آج کل کے لوگوں کی زبان میں "ملامت" کو "گالی" جان کر کہا کہ وہ بیچ ٹوکے اور بگڑے مگر وہاں تو حال ہی اور تھا.....

"یہ میری، میرے بزرگوں اور میرے ساتھی کی ہتک ہے۔" اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

"[illegible]، ان کی ہتک کرنے کی کس کی مجال ہے ــــ ساری دنیا اُن کی عزت کرتی ہے"

"[illegible] ساری دنیا !! دنیا نے تو ہمیشہ فن کاروں کو رلایا، غریبوں کو ستایا ہے ــــ وہ جن میں اقبال کے مردِ فقیر کا جلوہ نظر آتا ہے، جو خودی، خودداری، جفاکشی، خدمت اور محبت کی تفسیر [illegible] کاروں کو لیا ہے ــــ وہ ہر ایک کی ہتک کر سکتے ہیں۔" وہ اپنی رو میں کہے جا رہی تھی۔ میں جانتا

تھا ان دونوں میں گہری دوستی، رفاقت اور قربت ہے ـــــ ایک جان دو قالب میاں بیوی شاذ و نادر دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان دونوں کو میں اسی زمرے میں شمار کرتا تھا ـــــ سوچا کس نے شاید ان کی تحقیر کی ہے جس سے وہ اتنی برہم ہے مگر وہ بات کھل کر نہیں بتا رہی تھی۔

"دولت کی یہ ہمت کہ وہ فن کی تحقیر کرے ـــــ" اس کی آواز میں جلال تھا۔ اس کی نازک مزاجی اور حساس طبیعت کو میں جانتا تھا۔ چھوٹی سی کوئی بات اس کی راتوں کی نیند اڑانے کو کافی ہوتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اس کا یہ اثر مذاق کی باتوں میں دل سے دور کر دوں۔ ہنس کر میں نے کہا "دولت نے ہمیشہ علم اور فن کی سرپرستی کی ہے۔"

"فن کا ہمیشہ دولت سے بلند مقام رہا ہے ـــــ اور علم کا مقام تو ان دونوں سے بلند تر ہے میری نگاہ میں ـــــ دولت ان کی بارگاہ میں نذرانہ پیش کر سکتی ہے مگر خرید نہیں سکتی ـــــ سرپرستی ـــ اُنہہ ـــ"

میں نے پھر چھیڑا ـــــ اس چھیڑنے میں میرے خیالات کا عکس بھی تھا تھوڑا سا ـــــ "مگر ہم نے تو بڑے بڑے فن کاروں، بڑے بڑے صاحبانِ علم کو دولت کے سامنے جھکتے دیکھا ہے۔"

"بس بس بس ـــ اگر ایسا ہوا ہے۔ ہوتا ہے ـــ تو یہ بات شرم ناک ہے، روح فرسا ہے علم اور فن کی تحقیر ہے ـــ اس سماج اور معاشرے کی ذلت ہے جہاں فن اور علم کو خریدا اور بیچا جائے میں جب ایسی کوئی بات سنتی یا پڑھتی ہوں تو لرز جاتی ہوں۔ کیا گزرتی ہوگی ان حساس، خوددار فن کاروں پر جنھیں مجبور ہو کر دولت کے سامنے جھکنا یا اس سے مانگنا پڑتا ہوگا" وہ سچ مچ کانپ رہی تھی۔

"تم غرور اور خود پرستی کو خودداری اور قناعت کہتی ہو، مگر ہر ایک ایسا نہیں سمجھتا۔"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا جیسے اندازہ لگا رہی ہو کہ کیا واقعی میں اسے خود پرست اور انانیت پرست سمجھتا ہوں یا محض چھیڑ رہا ہوں۔ پھر وہ عجیب انداز سے مسکرائی۔ ایک اداس دلکش مسکراہٹ جو اس کی شخصیت کا جزو تھی۔

"فن کار سبھی حساس، خوددار اور انانیت پرست ہوتے ہیں میرے دوست ـــــ مگر آپ

لوگ یہ کیا جانیں ۔۔ اقبال کے وہ شعر تو آپ نے کاہے کو پڑھے ہوں گے

"کون سے شعر؟"

جو انہوں نے ایک بڑی پیش کش کو ٹھکرا کر کہے تھے ۔۔ اسی وقت جب ان کو روپے کی

مجھے ... کیا مگر اسے چھیڑنے میں اب لطف آ رہا تھا ۔۔ "میں نے تو نہیں پڑھے۔"

"تو اب سنئے ۔" اور وہ آہستہ آہستہ اقبال کے یہ شعر پڑھنے لگی ۔۔ ... کرسننے

کے لئے مجھے اس کی طرف اور زیادہ جھکنا پڑا ۔

تھا یہ فرمانِ الٰہی کہ شکوہِ پرویز
دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات

مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حُسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات

میں تو اس بارِ امانت کو اٹھاتا سرِ دوش
کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکاۃ

پھر وہ چپ ہو کر کسی سوچ میں کھو گئی ۔ میں نے خاموشی کو توڑا ۔

"... نے بھی کسی نہ کسی کا احسان اٹھایا ہی تھا۔"

وہ تڑپ اٹھی ۔ "وہ مدد یا خیرات نہ تھی ۔ دوستانہ پیش کش تھی ۔ نذرانہ تھا ۔ علم و فن کی بارگاہ

میں قدر دان کا ۔ اور شاید یہ آپ بھول گئے کہ وہ بھی انھوں نے ایک بڑا کام انجام دینے کے

معاوضے کے طور پر قبول کیا تھا۔"

"اور وہ تمھارے غالب صاحب جو ہر کسی سے مدد مانگا کرتے تھے۔"

ایسا لگا جیسے کسی نے دکھتی رگ کو چھیڑ دیا ہو۔

"... بے درد ہیں آپ ؟ یوں کیوں سوچتے ہیں ۔ ؟ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ یہ کتنی بڑی ٹریجیڈی تھی

جس عظیم فن کار کے قدموں میں دولت کے ڈھیر لگائے جانے چاہئے تھے ۔۔ آج جسے ہم اپنی قوم کا سب

سے بڑا شاعر مانتے ہیں ، وہ کتنا مجبور ، بے بس اور پریشان حال تھا کہ اپنی گزر بسر کے لئے دیسی رئیسوں اور بدیسی

حاکموں سے مدد مانگتا تھا۔ کیا کرب گذرتا ہوگا اس پر۔ اُف۔ مگر یہ دنیا تو مردہ پرست ہے۔ آج کس کو
الب ہے۔ اور تب ۔۔۔!"
"سمجھتی ہو کہ فن کار کو بھی دولت کی ضرورت ہے اُسے معاوضہ لے خاطر خواہ
لینا تم بھی برا نہیں سمجھتیں مگر۔"
"مگر کیا؟"
"مگر خلوص سے کی گئی پیش کش کو تم یا تمہارے اقبال ہتک کیوں سمجھتے ہیں؟"
"یہ اپنا اپنا مزاج ہے دوست۔"
تم مجھے ایک ہی آدمی کا نام بتا دو جس نے پاس آئی ہوئی دولت کو ٹھکرایا ہو، شہرت اور حکومت
کا سے منہ موڑا ہو...... یا ۔"
"مجھے اس کے لئے بہت دور نہ جانا پڑے گا۔ ایسے آدمی کو دیکھنا ہو تو میرے ساتھی کو دیکھ لو
۔ مگر نہیں تمھیں ان کی یہ صفات کہاں نظر آئیں گی ۔۔۔ تم انہیں کیا جانو۔"
"میں تم سے پہلے سے انھیں جانتا ہوں۔" میں نے کچھ ندامت سے کہا
"نہیں جانتے۔ اور جانتے ہو تو پہچانتے نہیں۔ ورنہ یہ نہ کہتے کہ ایسا ایک آدمی ہی دکھا دو۔
ایک کیا بہت سے ہوں گے۔ پر میں ایک ہی کو جانتی ہوں۔ جس نے جوانی میں دیس کی خدمت کا جو عہد
کیا، علم و ادب کی دلیری سے جو پیمانِ وفا باندھا تھا۔ آج تک وہ پوری وفاداری دل کی آمادگی کے
ساتھ اسے نباہ رہا ہے!۔ اور اس نے بھی ملک و قوم کی خدمت کی ہے۔ علم و ادب کے لئے زندگیاں نچھاور
کی ہیں۔ مگر شاید ان کی طرح نہیں ۔۔۔ زندگی میں کیسے کیسے سخت وقت گزر گئے۔ کیسے کیسے مقام آئے
جب ہر ایک کا پاؤں ڈگ سکتا تھا۔ مگر وہ کٹھنائیاں جھیلتے رہے، مگر جس راستے کو اپنایا تھا اس سے قدم
نہ ہٹایا۔ مگر خاموش اور بے غرض خدمت کسے نظر آتی ہے۔ ان کی شخصیت میں وہ چکا چوند کرنے والی بجلیاں
چھپی ہیں نا؟" اس کے لہجے میں درد تھا، شکایت تھی مگر ساتھ ہی ناز تھا۔ غرور تھا!
"میری عزیز۔ جب تم ان کی تعریف کرتی ہو تو لگتا ہے اپنے منہ میاں مٹھو بن رہی ہو۔ اپنی ہی تعریف
کر رہی ہو۔"

میں۔ میں ان تک کہاں پہنچ سکتی ہوں ۔ یں ان کی زندگی میں آئی تو میں نے دیکھا میں ایک اونچے پہاڑ کے سامنے کھڑی ہوں جس کی چوٹی پر دو ... میں ڈر گئی کہ ان تک کیسے پہنچوں گی۔ کیسے اس عزت اور محبت کی حقدار بنوں گی جو بے مانگے مجھے مل رہی ہے ۔ بڑی کڑی منزلیں تھیں، کٹھن مرحلے تھے۔ جو میں نے طے کئے ہیں آن تک پہنچنے کے لئے

اس میں کیا شک ہے ۔ اور لوگ نہ جانیں پر میں جانتا ہوں ۔"

... نہیں جانتے ۔ دوسرے سمجھ بھی کہاں سکتے ہیں ان محرومیوں کو جو میرا دل محسوس کرتا تھا۔ دنیا کی آسائشیں، اپنی طرف کھینچتی تھیں اور آن کے آدرش اپنی اُور۔ لیکن میں سر سکھ اور عیش سے منہ موڑ کر ... تک پہنچنے کی جدوجہد میں لگی رہی، ہاں ہاں تمناؤں کے کانٹے دل میں چبھتے رہے، آرزو ... رہی، کٹھنائیوں کی خاردار جھاڑیاں دامن پکڑتی رہیں۔ آرام و آسائش کی زندگی دور سے جلوے دکھا کر للچاتی رہی، مگر سب سے دامن بچاتی، اپنے ساتھی کے کندھے سے کندھا، قدم سے قدم ملائے ... چلتی رہی، تلووں کے کانٹے چنتی، پھولوں سے دامن بھرتی ... ... وہ مجھ سے نہیں خود اپنے سے مخاطب تھی۔

"میرا دوست مجھے سہارا دیتا رہا، جب لڑکھڑائی اس نے سنبھال لیا، جب دل برداشتہ ہوئی اس نے ہمت بڑھائی ۔ میں نے دولت سے حاصل شدہ عیش و مسرت کی جگہ فن سے ملنے والی راحت کو تلاش کیا۔ جس نے مجھے غریبی میں بھی خوش رہنا سکھا دیا۔ احساس کمتری اور نفسیاتی بیماریوں کے جنگل سے بچا لیا ۔ میرا جسم اکثر بیماریوں اور مصیبتوں سے ہار مان گیا۔ مگر میرا ارادہ، دماغ اور ذہن نہ جسمانی بیماریوں سے ... ذہنی امراض کا شکار بن سکا ۔ میں نہ دولت سے مرعوب ہوئی نہ حکومت و اقتدار سے مغلوب ۔ خود غرضی اور حسد کی مہلک بیماریوں سے بہت دور میں اپنے مرد فقیر کی محبت اور دوستی پر ... اپنے فن پر قانع اور مسرور رہوں ۔ میرے پاس تو وہ دولت ہے جس سے بڑے بڑے صاحبانِ دولت ... صاحبانِ اقتدار محروم ہیں، دوست ۔ محنت میں جو راحت ملتی ہے، اپنے فن میں ... فکر و خیال کی مسرت اور اس کو کاغذ پر منتقل کر کے جو بے پناہ خوشی حاصل ہوتی ہے اسے کوئی کیا سمجھ سکتا ہے ... کیا سمجھ سکتا ہے ۔" اس کی آواز اب سرگوشی کی حد تک دھیمی ہو چکی تھی۔ میں دیر تک خاموش بیٹھا اس کے چہرے

ایک کتاب ... شاید بھول چکی تھی کہ میں اس کے پاس بیٹھا ہوں۔

"ایک بات پوچھوں برا نہ ماننا۔" آج تک میں نے کبھی اس کی پروا نہ کی تھی کہ وہ میری کسی بات کا برا مان سکتی ہے مگر آج واقعی مجھے ڈر لگ رہا تھا کہیں وہ مجھ سے بھی خفا نہ ہو جائے۔ اُف یہ فن کار ... کتنے نازک مزاج ہوتے ہیں ___ یا بنتے ہیں۔ کون جانے۔؟

... ___ "آہستہ سے اس نے جواب دیا۔

"فن کی عظمت پیسہ کمانے سے کم نہیں ہو جاتی ___ یہ تم بھی مانتی ہو۔ آخر تم لوگ بھی تو اپنے علم و فن کا معاوضہ لیتے ہو، تم لوگ بھی پیسے سے بے نیاز نہیں۔"

"پیسے سے بے نیاز کون ہو سکتا ہے؟ ہم بھی نہیں ہیں۔ ہمیں بھی اس دنیا میں زندہ رہنا ہے، اپنی ضرورتیں پوری کرنی ہیں .... لیکن اصولوں کو قربان کر کے، آدرشوں کو چھوڑ کر پیسہ کی پوجا یا غلامی کو بے شک ہم نے برا جانا ہے۔ اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے محنت سے جو پیسہ ملتا ہے وہ ہمارے لئے خوشی اور اطمینان کا باعث ہوتا ہے۔ ہم اس سے صرف اپنی زندگی کی ضروریات ہی پوری نہیں کرتے بلکہ وہ چھوٹی چھوٹی آرزوئیں، وہ ننھی ننھی تمنائیں بھی پوری کی جاتی ہیں جن سے زندگی میں رس اور نکھار پیدا ہوتا ہے، حسن اور دلکشی ابھرتی ہے ___ ہم پیسہ کماتے ہیں کہ کسی کا احسان نہ اٹھانا پڑے، ہم اپنے فرائض ادا کر سکیں، دوسروں کی مدد کر سکیں کہ اس سے ہمیں سکون ملتا ہے لیکن ضرورت سے زیادہ پیسہ اگر کبھی ہو ___ تو شاید میری روح کچل جائے ___ اس کا بار میں برداشت نہ کر سکوں، شاید تم اور تم جیسے لوگ اس پر یقین نہ کرو ___ پر مجھے زیادہ روپیہ کا تصور بھی دہلا دیتا ہے!"

میں جل گیا ___ انسان کیسے کیسے دھوکے دیتا ہے اپنے آپ کو ___ اس نے عمر بھر دکھ اٹھائے اور یہ سمجھتی رہی کہ بڑے سکھ سے ہے ___ لوگ اُسے ہمیشہ اس کی حیثیت سے زیادہ پیسے والا سمجھتے رہے ___ دوسرے لوگ مہنگائی کا، پیسہ کی کمی کا، اخراجات کی زیادتی کا رونا روتے، عورتیں شکایتوں کے طومار باندھتیں اور وہ بیٹھی مسکرایا اور ان سے ہمدردی کیا کرتی! جیسے خود اسے کوئی اس قسم کی مشکل درپیش ہی نہیں ___

"تم نے عمر بھر دھوکے کھائے میری دوست ـــــ اپنی محرومی اور مشکلوں کو قناعت، ایثار اور عالی ظرفی سمجھ کر دل ہی دل میں ناز کرتی رہیں ـــــ اپنی غریبی کو سادگی اور استغنا کا نام دیتی رہیں ـــــ اور غریبی میں ڈھل گئیں کر تم نے کتنے دکھ اٹھائے ہیں اور اٹھا رہی ہو ـــــ تمہارے عزیز اور دوست اور ساتھی عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں مگر تم نے اپنے شوہر سے کبھی یہ نہ کہا کہ وہ ان بڑے بڑے عہدوں کو کیوں ٹھکراتا ہے۔ کیوں تمھیں غریبی اور کم مائگی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ آخر انھیں کیا حق تھا کہ ایک خوشحال گھرانے کی لڑکی کو ان مشکلوں میں پھنسائے رکھیں عمر بھر ـــــ" جو باتیں آج تک میں نے نہ کہی تھیں جانے کیسے [illegible] نکل گئیں ـــــ [illegible] عجیب نظروں سے مجھے دیکھا جس میں حقارت تھی [illegible] شکایت تھی۔

"میں کم مایہ ہوں؟ مفلس ہوں؟ جس کی جھولی قدرت نے اپنی بے بہا نعمتوں سے بھر رکھی ہے ـــــ جسے فن کی دولت ملی ہے؟ جسے سچی محبت کا انمول موتی میسر ہے؟ جسے قناعت، خودداری اور ہر دل عزیزی کے جواہر نصیب ہیں وہ غریب ہے؟ نہیں ـــــ تم سمجھ نہیں سکتے ـــــ کوئی بھی کچھ نہیں سکتا ـــــ میں سمجھانا چاہتی بھی نہیں ـــــ مگر میرے احساسات پر تم تو ضرب نہ لگاؤ ـــــ پہلی ہی چوٹ کی ٹیسیں ابھی تک اٹھ رہی ہیں ـــــ" اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"عزیز دوست تم تو سچ مچ ناراض ہو گئیں۔ تم جانتی ہو، مذاق میں یا شاید تمہاری محبت میں یہ باتیں منہ سے نکل گئیں ـــــ لیکن آخر بات کیا ہے؟ تم اتنی دل برداشتہ کیوں ہو؟ اگر مجبوراً کسی کا احسان لینا پڑا ہے تو کیا بات ہے ـــــ تم بدلہ اتارنے میں بڑی تیز ہو ـــــ اتار دینا بدلہ یا قرضہ ـــــ" میری کچھ عقل کام نہیں کر رہی تھی ـــــ یہی خیال آیا کہ کسی سے اس نے کچھ مانگا یا لیا ہے اور کوئی دل شکن بات قرض دینے والے نے کہہ دی ہے۔

"آپ سمجھتے ہیں کہ جب میرے دوست کے ساتھی، عزیز اور دوست لمبی لمبی کاروں میں گھومتے ہیں اور وہ پیدل اور بسوں میں پھرتا ہے تو مجھے ذلت کا احساس ہوتا ہے؟ جب وہ عہدے، حکومت و اقتدار کی گدیاں سنبھالے شہرت کی بلندیوں پر پہنچے ہوئے ہیں تو مجھے ان پر رشک آتا ہے اور اپنے شوہر سے دل ہی دل میں گلہ پیدا ہوتا ہے؟ ـــــ نہیں میرے دوست نہیں ـــــ وہ آج بڑے آدمی ہوتے، پیسہ والے، کہیں کے وزیر، سفیر، تو کیا میرے دل میں ان کی ایسی ہی عقیدت و محبت ہوتی ـــــ؟ ان کو میں اپنے دل کے اسی اونچے سنگھاسن پر بٹھا سکتی؟ اور میں کیا ـــــ شاید اور لوگوں کے دل میں بھی ان کی وہ گہری

عزت اور قدر نہ ہوتی جو آ[illegible] آہ اسی مرد فقیر کی ساتھی کی تحقیر لیا تو وہ اس کی تحقیر نہیں ہے ؟" اس احساس سے جیسے اس کا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔

"آج تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ اس طرح کی باتیں تو آج تک تم [illegible] نہیں۔ اپنے شوہر کی برائی کرنے اور شعر [illegible] نے کی تو تمھاری عادت تھی ہی نہیں۔ تم تو خود [illegible] گتی ہو، تعریف سے گھبراتی [illegible] ہو ___ آج یہ کیسی الٹی گنگا بہہ رہی ہے ___ تم تو میرے ساتھ مل کر اپنا اور [illegible] فقیر تک کا مذاق اڑانے سے نہیں چوکتی تھیں ___ مگر آج ___ آج ___"

[illegible] نے میری بات کاٹ دی۔

"آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے ___ آج پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ یہ سب دل بہلاوے [illegible] تھے دو چار لوگوں کو چھوڑ کر، لوگ نہ علم کی قدر و قیمت جانتے ہیں نہ فن کا احترام کرنا ___ آج میں نے پوری طرح سمجھا ہے کہ جن بیچارے فن کاروں کو دولت کے سامنے جھکنا پڑتا ہوگا ان پر کیا گزر جاتی ہوگی، آج مجھے پہلی بار اس دولت کا اندازہ ہوا جو قدرت نے ہمیں بخشی ہے۔ کتنی بڑی دولت جس نے ہمیں کم ظرفوں کے سامنے جھکنے پر مجبور نہیں کیا ___ شاید سچی عقیدت سے آج ہی میرا سر اپنے معبود کے سامنے جھکا ہے ___"

"تو پھر اس قدر تلملائی ہوئی کیوں ہو ؟" میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"تم میری جگہ ہوتے تو اور زیادہ تلملاتے ___ ہاں ہاں میں معاوضہ لیتی ہوں کبھی کبھی اپنی کہانیوں اور مضمونوں کا ___ کتابوں کی رائلٹی بھی لیتی ہوں۔ مگر خیرات نہیں ___ میں نے فن کو کبھی فروخت نہیں کیا ___ دوستوں، عزیزوں، پڑوسیوں، مداحوں کی فرمائش اور اصرار پر کتنے جلسوں، محفلوں اور مجلسوں میں تقریریں کی ہیں، مضمون پڑھے ہیں، نظمیں سنائی ہیں، کہانیاں پڑھی ہیں...."

"جانتا ہوں بھئی جانتا ہوں کہ آج تم ہماری بہت بڑی، بہت مشہور، بہت محبوب فن کار ہو ___"

"بہت بڑی، بہت مشہور تو نہیں ___ ہاں کسی حد تک محبوب ضرور ہوں ___ ہاں میرے دوست، مجھے اپنے فن کا بڑا انمول معاوضہ ملتا ہے ___ جو صرف ایک محبوب فن کار ہی کو مل سکتا ہے ___ قدر دانوں اور چاہنے والوں کی محبت اور عقیدت ___ معاوضہ کی صرف یہ دولت ہے جو میں نے سر جھکا کر قبول کی ہے مگر دل میں مسرت اور سر میں غرور کا جذبہ بھی ابھرا ہے ___ اس سے میری عزت نفس پر چوٹ نہیں پڑتی اس کو غذا ملتی ہے اور اور بہتر ___ اور بہتر لکھنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے ___ ان قدر دانوں اور چاہنے والوں کے لئے۔"

"تم آخر ہو آ کیا؟"

"کچھ نہیں ـــ ایک عزیز کے اصرار پر ان کے ایک [illegible] ہاں کی ایک محفل میں شرکت کی تھی۔"

"کون لوگ ہیں؟ کیا پڑھا تھا تم نے [illegible] کیا کیا انہوں [illegible]؟" میں نے بے چین ہو کر سوالوں کی بوچھاڑ کر ڈالی۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ـــ بہرحال میں وہاں گئی ـــ بہت بڑا مجمع تھا، سب نے میری [illegible]ستائش ـــ بہت سے لوگ، جن میں سے اکثر کو میں جانتی پہچانتی بھی نہ تھی، میرے پاس آئے، [illegible] بہت خوش، بہت نازاں اپنے گھر واپس آ گئی۔ صاحب خانہ دونوں بہت مصروف تھے، وہ خود میرا شکریہ ادا نہ کر سکے مگر مجھے یہ پیام ملا کہ وہ دونوں کسی دن میرے گھر [illegible] شکریہ ادا کریں گے۔ میں نے [illegible] کو کوئی اہمیت بھی نہیں دی ـــ دولت مندوں [illegible] مشاغل سے اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھیں۔ [illegible] عزیز کی فرمائش پر وہاں گئی تھی۔ کچھ پاس دوستی کا تھا، کچھ عقیدے کی لگن تھی ـــ ورنہ تم جانتے ہو، میں دولت مندوں سے گھبراتی ہوں ...."

"پھر ـــ پھر لگا رکھی ہے؟ کیا میں کہانی کہہ رہی ہوں" وہ بھڑک اٹھی۔ میں چپ ہو گیا۔ ذرا دیر بعد پھر اس نے بات شروع کی مگر لہجے میں تلوار کی سی کاٹ تھی۔

"پھر فن کار کا شکریہ ادا کیا گیا ـــ ایک دوسری صورت میں جس کا وہ اس غریب کو مستحق سمجھتے تھے ـــ پھر ـــ دولت نے فن کی تحقیر کی ـــ روپیہ نے عقیدت کو خریدنا چاہا ـــ نمود و نمائش نے خلوص کا منہ چڑایا، پھر ـــ پھر قلندر کو شکوہ پرویز کی رشوت پیش کی گئی ـــ مگر ـــ میرے دوست [illegible] کے اس اونچے مقام پر نہیں پہنچ سکی ـــ کبھی نہیں پہنچ سکتی جہاں ہر تلخ شیریں بن جاتا [illegible] میرے لئے تلخ ہے اور رہے گی ـــ" میں چپ چاپ بیٹھا اس کی طرف دیکھ

[illegible] نوٹوں کی شکل میں شکریہ اور تعریف نہ پہلے میں نے قبول کی تھی نہ اب کر سکتی [illegible] میرے [illegible] کو خود آنے کی فرصت نہ تھی ـــ اور روپیہ دے کر وہ میرے احسان کا بدلہ اتار رہے تھے ـــ پھر آنے کی ضرورت ہی کیا تھی ـــ" اس کا چہرہ سرخ تھا، آنکھوں میں آنسوؤں نے غیر معمولی چمک پیدا کر دی تھی۔ میں نے مذاق میں کہا

"لے لیتیں ـــ ہم بھی آدھے کے حصہ دار بن جاتے ـــ خوب چیزیں خریدتے ـــ سیر کر[illegible]

"نہیں نہیں — یہ نہ کہو۔ میں مذاق میں بھی یہ نہیں سن سکتی ۔ دولت کبھی میری خودداری، میری نفس نہیں خرید سکتی — کبھی نہیں —"

"[illegible] پر ایسے ذلت یا ہتک نہیں سمجھا جاتا ۔ شاعر، واعظ، مقرر، اکثر معاوضہ لیتے ہیں، کیا اس سے ان کی ذلت ہوتی ہے ؟"

"نہیں نہیں میرا یہ مطلب نہیں — مگر ان کی بات اور ہے — وہ ایک قاعدہ ہے —"

"ان لوگوں کا مقصد ہرگز تمہاری ہتک کرنا نہ ہوگا — وہ — وہ کسی طرح تمہاری مدد کرنا چاہتے ہوں گے — احسان اتارنا چاہتے ہوں گے —"

"مدد — احسان" اس نے طنز سے کہا "مدد تو میں صرف اپنی آپ کرتی ہوں — اور احسان صرف [illegible] کا اٹھاتی ہوں — ویسے تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو — ان کا مقصد میری انسلٹ کرنا نہ تھا۔ مگر — اس کی جرأت انہیں اس لئے ہوئی نہ کہ وہ مجھے جانتے ہیں، نہ میرے خاندان کو، نہ میرے ساتھی کے رتبہ سے واقف ہیں وہ — سوچتی ہوں جب ان کو میرے انکار کی خبر ملی ہوگی تو — تو میرے 'محسنوں' کو غصہ آیا ہوگا — حیرت ہوئی ہوگی — رحم بھی آیا ہو شاید ایسے مغرور فن کار پر ہنسی بھی آئی ہوگی —"

"ہاں بھئی، ہر کوئی اتنا حساس کہاں ہوتا ہے کہ دوسرے کے جذبات کو سمجھ سکے ۔"

"وہ بیچارے کیا جان سکتے ہیں خوددار انسان کے جذبات ؟ وہ غریب سمجھ ہی کہاں سکتے ہیں کہ کوئی کم حیثیت روپیہ کو ٹھکرا بھی سکتا ہے — روپیہ — جو ان دولت مندوں کا خدا ہے — اور فن کار کے پیروں کی خاک —" اس نے زور سے زمین پر ٹھوکر ماری ۔ دو تین کنکر اچٹ کر دور جا پڑے ۔

میں اپنے آنسو چھپانے کی کوشش بڑی دیر سے کر رہا تھا مگر اب ناکام ہو چکا تھا۔ آنسو جن میں عقیدت تھی، محبت تھی، مسرت تھی — میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر پہلے اپنی بھیگی آنکھوں سے لگائے اور پھر ان کو چوم لیا۔ آج وہ میری چھوٹی سی شاگرد مجھے اپنے سے بہت بڑی — بہت بڑی معلوم ہو رہی تھی ۔

اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ساری تلخی، بیزاری اور غصہ جیسے ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ آنکھوں میں غرور و مسرت کی دمک اور ہونٹوں پر وہی اداس دلکش مسکراہٹ کھل اٹھی — بادل چھٹ گئے ۔ آفتاب پھر نکل آیا ۔

سعید انصاری

رفتار تعلیم

طلبا کے مسایل اور ان کے اسباب :

شری ہیر سنگھ، اسسٹنٹ پروفیسر پوسٹ گریجویٹ بیسک ٹریننگ کالج گوالیار نے طلبا سے متعلق مسایل کی ایک تحقیقات کی [illegible] انھوں نے ۸۵ زیر تربیت استادوں سے اس عنوان پر مقالہ لکھنے کے لئے کہا: "[illegible] مسایل حل کرنے کی میں نے کوشش کی"۔ یہ سب ایسے استاد تھے جو مدھیہ پردیش اور اتر پردیش میں [illegible] پڑھانے کا کام کر چکے تھے اور یہ سب کے سب مختلف درجہ کے اسکولوں سے متعلق تھے [illegible] ان [illegible] پرائمری اسکول کے تھے، ۴۸ مڈل اسکولوں کے، ۲۲ ہایر سکینڈری اسکولوں کے اور ۵ انٹرمیجیٹ کالج کے۔ [illegible] تحقیقات میں ہر منزل کے طلبا شامل تھے۔ مندرجہ بالا مقالوں میں ان کے جوابات حسب ذیل حصوں میں تقسیم کئے گئے :

۱. طلبا کے مسایل کے اہم اسباب اور کتنے نیصد طلبا میں یہ اسباب پائے گئے۔؟

۲. [illegible] پیشہ کی بنیاد پر کتنے نیصد اسباب تھے ؟

[illegible] اسباب کی بنیاد پر یہ مسایل پیدا ہوئے اور ان میں فیصد طلبا کی تعداد :

۱. باپ کا انتقال ہو گیا ہے : ۲۲ فیصد

[illegible] بچہ اپنے باپ ماں کا اکیلا بچہ ہے : ۲۲ فیصد

[illegible] ابھی اسکول یا جماعت میں نیا آیا ہے : ۲۰ فیصد

[illegible] والدین بچہ کی دلچسپیوں اور ان کی مادی ضرورتوں کا کوئی خیال [illegible] رکھتے ہیں ۱۴ فیصد

...دین یا سرپرست بچوں سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں ۱۴ فیصد

...گھر پر والدین کی نگرانی کی کمی ۱۲ فیصد

...خراب بچوں کی صحبت ۱۲ فیصد

...ملازمت یا کاروبار کی وجہ سے والدین کا کسی اور جگہ قیام [illegible] فیصد

...بچہ کا شہری مدرسہ سے دیہی مدرسہ یا دیہی سے شہری مدرسے میں تبادلہ [illegible] فیصد

۱۰۔ والدین یا سرپرست کی ہمت افزائی [illegible] فیصد

...۔ بچہ کی ماں کا انتقال [illegible] فیصد

...۔ بچہ کی امتحان میں دو سال کی مسلسل ناکامی [illegible] فیصد

اس تمام تحقیقات کا خلاصہ یہ نکلا کہ

۱۔ کسی بچے کے مسایل کے لئے کوئی ایک سبب نہیں بلکہ بہت سے اسباب ہوتے ہیں۔

۲۔ [illegible] فیصد سے زیادہ اسباب گھر کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

۳۔ تقریباً ۵۴ فیصدی اسباب گھر سے باہر کی زندگی کا نتیجہ ہوتے ہیں، ۲۵ فیصدی مدرسہ کے حالات کی بنیاد پر اور ۸ فیصدی پڑھانے والے استادوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

۴۔ ۸ فیصد اسباب بچہ کے گرد و پیش کے مجموعی حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

۵۔ تقریباً ۶۰ فیصدی بچے ایسے ہوتے ہیں جن کے والدین یا تو تجارتی کاروبار یا کھیتی باڑی کے کاموں میں معروف ہوتے ہیں۔

ایک گاؤں کے مدرسہ کی رفتار تعلیم:

گلومب، مہاراشٹر کے ضلع ستارا میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس کی آبادی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۲۰۶۰ تھی۔ اس گاؤں کی آبادی میں دو بڑی جاتیاں رہتی ہیں: ایک مراٹھے جن کی تعداد کوئی ۸۰ فیصدی ہے اور دوسرے مہار جو اچھوت جاتی سے تعلق رکھتے ہیں، اور ان کی آبادی ۱۰ فیصد ہے۔ بقیہ ۱۰ فیصد میں دوسری جاتیاں ہیں۔ گاؤں کے لوگوں کا سب سے بڑا ذریعۂ معاش کاشتکاری اور مزدوری ہے۔ آبادی کا

ایک حصہ بمبئی شہر میں جاکر کام کرتا ہے۔

اس گاؤں میں تعلیم کی ابتداء، اس طرح ہوئی کہ لارڈ رپن کے زما[illegible] ۱۸ تک ہندوستان کے گورنر جنرل تھے۔ یہاں سب سے پہلے ضلع بورڈ اور میونسپلٹیاں قائم ہوئیں، جن میں ہندوستانیوں کو بشمول دوسرے اختیارات کے ابتدائی تعلیم بھی دی گئی ا[illegible] سلسلے میں غالباً سب سے پہلا پرائمری اسکول اس گاؤں میں ۱۸۸۷ء [illegible] سے پہلے بھی پرانے طرز کے ابتدائی مدرسے رہے ہوں، جس وقت یہ مدرسہ قائم ہوا، اس وقت پرائمری اسکول میں ۷ جماعتیں تھیں: ایک رُڈیمنٹ کلاس اور بقیہ ۱ سے ۶ تک ابتدائی جماعتیں [illegible] اضافہ ۲-۱۹۰۱ء میں ہوا اور اس طرح کل آٹھ جماعتوں کا یہ ایک ابتدائی مدرسہ بن گیا۔ مدرسہ کے کاغذات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں طلبا کی تعداد نہ تو کچھ بہت زیادہ تھی اور نہ تعلیم کی حالت بہت [illegible] بھی آس پاس کے ایسے دیہاتوں سے بچے آتے تھے جہاں کوئی مدرسہ [illegible]

[illegible] کے سالوں میں جب لوگوں کے اندر تعلیم کا احساس پیدا ہوا اور گوکھلے نے لازم اور مفت تعلیم کا [illegible] آمد پیش کر کے ایک ہلچل پیدا کر دی، پھر بھی اس اسکول کی عددی اور تعلیمی حالت میں کوئی [illegible] اور یہ کیفیت ۱۹۲۰ء تک جاری رہی بلکہ حالت اور بدتر ہوتی گئی۔ ۱۹۲۱ء میں مونٹیگ چیمسفرڈ [illegible] اور ان کی رو سے تعلیم ایک صوبائی محکمہ بن گیا اور ۱۹۲۳ء میں ایک بڑا جامع پرائمری ایجوکیشن [illegible] پاس ہوا، جس سے ستارا ضلع اور آس پاس کے علاقوں میں تعلیم کا پھیلاؤ تو ہوا، پھر بھی لازمی تعلیم کا نفاذ ستارا کے دیہاتی علاقوں میں اب بھی نہ ہو سکا۔ ۱۹۴۷ء سے البتہ حکومت کی پالیسی میں کچھ تبدیلی واقع ہوئی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ گلوسپ کے اس اسکول میں بھی ایک سے دو استاد ہو گئے اور بچوں کی تعداد [illegible] ہوگیا، خاص طور سے اچھوت جاتی بچے بھی کافی تعداد میں آنے لگے۔ اچھوت بچوں کا داخلہ یوں تو ۱۸۹۲ء [illegible] شروع ہوگیا تھا، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہوتی تھی اور ۱۹۳۰ء تک وہ عام بچوں سے بالکل الگ تھلگ بٹھائے جاتے تھے۔ یہ علیحدگی کم تو ہو گئی لیکن ۱۹۴۷ء میں آزادی ملنے سے پہلے بالکل ختم نہ [illegible]

[illegible] اسکول کی زندگی میں سب سے بڑا انقلاب انگیز سال معلوم ہوتا ہے، اس لئے اس کے بعد سے کا دور [illegible]

والوں کی بیحد دلچسپی اسکول سے شروع ہوئی ہے جنھوں نے اسکول کے لئے ۵۶۹۵ مربع فٹ زمین کے سکنڈلے پر ۸ کروں کی ایک عمارت بنوائی اور ۱۰۲۸ مربع فیٹ زمین برآمدوں کے لئے چھوڑی۔ اس کے بعد سے استادوں، بچوں اور جماعتوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ ۳۵-۱۹۳۴ء میں گورنر بمبئی نے اس اسکول کا معائنہ کیا، جس کے لئے گاوروں والوں نے کئی سڑکیں بنوائیں جس سے اس گاؤں کا دوسرے گاوروں سے تعلق قائم ہوگیا۔ اور اب اس اسکول میں چھ جماعتیں ہوگئیں اور استادوں کی تعداد ۴ اور بچوں کی ۱۵۱ ہوگئی۔

۱۹۳۶ء کے بعد سے اسکول کی حالت روز بروز بہتر ہوتی گئی۔ ۱۹۴۰ء میں ساتویں جماعت کا اور اضافہ ہوگیا اور اس طرح یہ ایک مکمل پرایمری اسکول بن گیا۔ اب تک ساتویں جماعت کے ختم پر بچوں کو آخری امتحان کے لئے باہر جانا پڑتا تھا اب اسی اسکول میں اس کا انتظام ہوگیا۔ اسکول کے استادوں میں بھی یہ عجیب بات تھی کہ ایک برہمن تھا، دوسرا مراہٹہ، تیسرا مسلمان اور چوتھا عیسائی، لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو گلومب کا رہنے والا ہو۔ سب آس پاس کے علاقوں سے آتے تھے۔

یہ ایک چھوٹے سے گاؤں کی رفتار تعلیم پیش کی گئی ہے جس نے بہ حیثیت مجموعی یہاں کی زندگی پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔ اسی مدرسہ کی بدولت نہ صرف بچے بلکہ جوان اور بوڑھے بھی پڑھے لکھے بن گئے، مردوں کے سوا عورتیں بھی خاص تعلیم یافتہ نظر آنے لگیں۔ بستی کے باہمی تعلقات پر بھی نہایت خوشگوار اثر پڑا ہے اور لوگوں کے عام طرز زندگی میں بھی بڑی تبدیلیاں آگئی ہیں۔

ماہنامہ جامعہ کی روانگی میں تاخیر

ماہنامہ جامعہ کی تجدید رجسٹری میں، بعض قانونی دشواریوں کی وجہ سے تاخیر ہوئی، جس کی وجہ سے اکتوبر سے جنوری تک کے شماروں کی روانگی میں باقاعدگی نہیں برتی جاسکی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب تجدید ہوگئی ہے اور آئندہ سے حسب معمول، رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں خریداروں کو مل جایا کرے گا۔

[illegible]

کو تپش اور شبوں کے گداز سے آشنا کیا ہے۔ یہ انتساب مرتب کے اس ادارے سے تعلق اور فیض یابی کا بھی اظہار ہے۔

[illegible] مرتب نے ہی ذاکر صاحب کے کچھ خاندانی حالات بھی لکھے ہیں جن سے اس تہذیبی ماحول کا علم ہوتا ہے جس نے ان کی شخصیت کو ایک طرح کی شریف کج کلہی اور البیلے پن سے آشنا کیا ہے۔ اسلامیہ اسکول اٹاوہ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیمی زندگی کے بہت سے معنی خیز نقوش پروفیسر حبیب الرحمٰن نے جو ذاکر صاحب کے ہم سبق تھے، بڑی ہی چابکدستی سے ابھارے ہیں اور ان کی زندگی کے تشکیلی مراحل کی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین نے اپنے مخصوص سنجیدہ، علمی اور تجزیاتی انداز میں تقریباً ان تمام عناصر کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ذاکر صاحب کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں حصہ لیا ہے۔ عابد صاحب نے ان آدرشوں اور قدروں کا بھی تجزیہ کیا ہے جن کی تخلیق خود ذاکر صاحب ہیں اور جن کی ترویج کے لئے وہ کوشاں بھی رہے ہیں۔ میری نظر میں یہ واحد مضمون ہے جس میں وہ خیرہ نگاہی نہیں جس کے بہت سے مضمون نگار شکار ہوگئے ہیں۔ ذاکر صاحب کی شخصیت انتہائی دیوپیکر اور اثر انگیز ہے، ان کے سامنے عموماً لوگوں کو اپنی کوتاہیٔ قد کا احساس ہونے لگتا ہے اور اکثر لوگ یوں محسوس کرتے ہیں گویا وہ سطحِ زمین سے قطب مینار کو دیکھ رہے ہوں اور ان کا سر چکرا رہا ہو۔ ان کی شخصیت پر لکھنے والے اکثر مقالہ نگار اسی کیفیت کا شکار محسوس ہوتے ہیں۔ کسی کی بھی شخصیت پر 'پیرِ رومیؔ' اور 'مریدِ ہندیؔ' کے موڈ میں لکھنے والے موضوع کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ اس کام میں لکھنے والے کے اندر 'قرب آفریں معروضیت' ہونی چاہیئے ورنہ حالیؔ کی حیاتِ جاوید جیسا کارنامہ جنم لے گا۔ عابد حسین صاحب کے مقالے میں ایک خاص معروضی انداز ہے جس کی وجہ سے ان کا مقالہ اس مجموعے کا بہترین مقالہ بن گیا ہے اور ذاکر صاحب کی شخصیت کی معتبر کلید۔ پروفیسر محمد مجیب نے ذاکر صاحب کا قلمی چہرہ انتہائی جاندار اور شگفتہ انداز میں لکھا ہے۔ صرف چند رنگوں کی مدد سے انھوں نے ذاکر صاحب کی شخصیت کے خارجی اور باطنی خدوخال نمایاں کئے ہیں اور اس خوشگوار معمے کی طرف اشارہ بھی کیا ہے جس سے ان کی شخصیت عبارت ہے۔ موصوف نے کتنے پتے کی بات کہی ہے:

"میں ذاکر حسین صاحب کو ۲۳ء سے جانتا ہوں اور بائیس برس ان کے ساتھ کام کر چکا ہوں۔ ان

کو مجھ سے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ میں ان سے ملتا نہیں ہوں، مگر میں کیا کرتا، تصویر کو بہت قریب [illegible]
[illegible] کو پیچھے ہٹ کر اور اس طرح کہ روشنی تصویر پر پڑے [illegible]
شخصیت کو بھی کچھ ایسے ہی دور رہ کر، پیچھے ہٹ کر دیکھنا چاہئے۔ لیکن ہماری قومی عادت ہے کہ
[illegible] ہے اتنا ہی زیادہ گھیرتے اور قریب سے دیکھتے ہیں۔

یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جس سے ہر شخصیت نگار کو واقف ہونا چاہئے اگر وہ کامیابی کا خواہاں ہے۔ اس مجموعے میں [illegible] مقالہ نگاروں نے "قریب سے دیکھنے" کی کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں ایک طرح کی [illegible] ہے۔ جس نے جتنی بھی اور جس قدر بھی معروضیت پیدا کی ہے اتنا ہی کامیاب ہوا ہے [illegible] صدیقی صاحب کا مضمون اپنے تیکھے پن اور شاداب و شگفتہ انداز نگارش کی وجہ سے خاصے کی چیز ہے [illegible] شکایت کروں وہ ذاکر صاحب پر جو ایک زمانے سے ان کے مرشد ہیں، ایسے ہی لکھتے اور اسی [illegible] کے ساتھ۔ خواجہ غلام السیدین کا مقالہ تفصیلی اور بھرپور ہے مگر اس میں مجھے پر شکوہ اقبالیاتی [illegible] انی کھٹکتی ہے۔ ہم لفظوں اور اصطلاحات کے اسراف سے گریز کر کے بھی کسی کی عظمت کی تصویر کشی [illegible]

[illegible] کتاب میں جہاں ایک طرف ایسے مقالے ہیں جن سے ذاکر صاحب کی تعلیمی اور قومی سرگرمیوں پر روشنی پڑتی ہے وہیں دوسری طرف کچھ ایسے مضامین بھی شامل ہیں جن میں ان کی ادبی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ذاکر صاحب کا اپنا ایک مخصوص انداز اور لب و لہجہ ہے جس کی وجہ سے وہ آسانی سے پہچان لیے جاتے ہیں۔ یہ بڑی بات ہے، مگر عام طور پر بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے کہ ذاکر صاحب کے اندر [illegible] سے پیدا ہو گئی ہے۔ یہ ان کی فعال اور پرسوز شخصیت کا اعجاز ہے۔ یہ کہنا مبالغہ ہے کہ ان کے [illegible] کے کئی رنگ ہیں اور مختلف انداز۔ ان کا صرف ایک انداز ہے جس میں جملوں کی تیز رفتاری ہے، جذبہ اور ایک طرح کا خطیبانہ خروش۔ یہ انداز افلاطون کی ریاست کے ترجمے میں بھی ہے اور تعلیمی خطبات [illegible] انداز سے بولتے ہیں اسی انداز میں لکھتے ہیں۔ جن لوگوں نے ذاکر صاحب کو بولتے سنا ہے انہیں [illegible] سیماب کس تیزی سے متحرک رہتا ہے۔ اس اضطراب کے پیچھے ان کی اپنی شخصیت

ہے جو تیز رفتار جملوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے خواہ وہ لکھ رہے ہوں یا بول رہے ہوں۔ ان کے تحریری لفظوں (WRITTEN WORDS) میں بھی تقریری لفظوں (SPOKEN WORDS) کا آہنگ ہوتا ہے۔ ان دونوں کا قرب ان کے اسلوب کی امتیازی خصوصیت ہے۔ مجھے ان کی تحریریں پڑھ کر اکثر یہ محسوس ہوا ہے گویا وہ لفظوں کو لکھنے کے ساتھ سنتے بھی ہیں یہ ایک ایسی خوبی یا خصوصیت ہے جو بہت کم لکھنے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔ ان کی تحریروں میں مجھے اکثر اقبال کی شاعری کا آہنگ اور اس کی شوکت محسوس ہوئی ہے، بالخصوص ان کے خطبات میں خطیبانہ انداز میں ایک خامی یہ ہوتی کہ لکھنے والا برتر انداز میں دوسروں کو مخاطب کرتا ہے۔ برتری کا یہ احساس بولنے یا لکھنے والے کے قد و قامت کو خواہ کتنا ہی بالا کیوں نہ بناتا ہو مگر نثر اس سے بری طرح متاثر ہوتی ہے اور مختلف حالات میں اثر انگیزی سے محروم۔ ذاکر صاحب کی تحریروں کی خطابت صرف اس وجہ سے خوشگوار ہے کہ ان میں نہ کہیں برتری کا احساس ہے اور نہ خشونت ہے۔ وہ پوری شدت کے ساتھ سامع یا قاری کے احساس کو چھوتے یا اس سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ ان کا احساس ان کے خیال کی طرح واضح اور شفاف ہوتا ہے۔ ان کے اسلوب میں شوکت ہے مگر ابہام نہیں۔ مشہور انگریزی نقاد لوکس LUCAS نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "ابہام شعر یا شعری نثر کو طوفان ابر و رعد یا ابر آلود قلۂ کوہ کی طرح ایک پُر اسرار وسعت بخش دے تو بخش دے، لیکن میرے خیال میں نثر تو اسی وقت بہترین ہوتی ہے جب وہ موسم بہار کے دنوں کی فضا کی طرح شفاف ہو۔" یہ شفاف فضا ان کی اکثر نثری تحریروں میں موجود ہے اور متوجہ کرتی ہے۔

ذاکر صاحب کے اسلوب یا ادبی مرتبہ و مقام پر اس کتاب میں جو بھی مضامین شامل ہیں وہ غیر تشفی بخش ہیں۔ ان میں نام اور کام کا تذکرہ ہے اور بس۔ ان کے اسلوب یا ان کی انفرادیت کا تجزیہ نہیں کیا گیا ہے۔ آل احمد سرور صاحب سے اس کام کی امید تھی مگر انھوں نے بھی سرسری انداز میں بعض خصوصیات کی طرف صرف اشارے کیے ہیں۔ پروفیسر محمد سرور کا مقالہ بہت پہلے لکھا گیا تھا جب اچھی نثر یا نثری اسلوب کی ہمارے یہاں معیار بندی نہیں ہوئی تھی۔ غالباً اسی وجہ سے آج یہ مضمون انتہائی تشنہ اور بے رنگ محسوس ہوتا ہے۔ عبداللہ ولی بخش قادری کا مضمون تعلیمی نقطۂ نظر سے ان کہانیوں کو دیکھنے اور پرکھنے کی ایک اچھی اور کامیاب کوشش ہے جو ذاکر صاحب نے ایک زمانے میں بچوں کے لیے لکھی تھیں۔ ہمارے ادبی ناقدوں کو چاہیے کہ وہ ذاکر صاحب کے اسلوب

کا بھرپور اور تفصیلی تجزیہ کریں۔ اعظمی صاحب نے اس کتاب میں ذاکر صاحب کی نثر کے مختلف [illegible] کیے ہیں جن سے [illegible] کے مزاج کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کی کامیابی یہ ہے کہ اس میں ذاکر صاحب کی ہمہ جہت شخصیت پر جو کچھ آج تک لکھا گیا ہے انتخاب کر کے پیش کر دیا گیا ہے ——— اور وہ بھی بڑے سلیقے سے۔ اس گراں بہا کام کے لئے جناب عبداللطیف اعظمی ہماری طرف سے خصوصی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مکتبہ جامعہ نے یہ کتاب خاصے اہتمام اور خوش [illegible] سے شائع کی ہے۔

گفت و شنید

مرتب : ظفر ادیب

[illegible] : قصرِ اردو، اردو بازار، دہلی ۶ قیمت : چھ روپے

[illegible] اردو کے جانے پہچانے صحافی ہیں۔ "گفت و شنید" ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ [illegible] ان مضامین کی ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ جدید ادبی سرگرمیوں کے نقوش ابھار دے۔ اس جائزے میں تجریدی رنگ پیدا ہو جانے کے خطرے سے بچنے کی خاطر ظفر ادیب صاحب نے زبان و ادب کے مختلف شعبوں میں کام کرنے والے [illegible] ادیبوں کو منتخب کر لیا ہے اور پھر ان کی خدمات کے منہج یا سمت کی نشاندہی کی ہے اور یہ کام کچھ اس طرح انجام دیا ہے کہ اردو ادب کے تخلیقی سفر کی مختلف منزلوں یا مرحلوں کا قاری کو احساس ہو جاتا ہے اور وہ اس رنگارنگی اور تنوع سے بھی آگاہ ہو جاتا ہے جو آج کے اردو ادب کی خصوصیت ہے۔ غالباً مصنف کی غایت بھی یہی ہے۔ ویسے اس طرح کے جائزوں میں کچھ خطرے بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ جن لوگوں کو مصنف نمایندگی کا درجہ دیتا ہے وہ بہت سے [illegible] نہ ہوں۔ میرے خیال میں اس طرح کا اختلاف اس جائزے میں بھی ممکن ہے۔ جائزے کے نظری ہونے کی صورت میں اس طرح کے اختلاف کی گنجائش نہیں [illegible] کے لئے ضروری ہے کہ خود جائزہ لینے والا ادبی اقدار کے کسی نہ کسی نظام

ماننے والا ہو اور وہ ادبی کارناموں کو انھیں معیاروں کی روشنی میں پرکھے۔ ظفر ادیب صاحب کی خوبی یا خامی یہی ہے کہ انھوں نے طے شدہ معیاروں یا مفروضوں کے بغیر یہ مضامین لکھے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے مضامین کا لہجہ کہیں بھی ادعائی نہیں ہے۔ وہ ادیبوں کو انھیں کے معیاروں پر پرکھتے ہیں اور اس طرح تضیۂ زمین برسرِ زمین کا انداز ان کے تقریباً سبھی مضامین میں محسوس ہوتا ہے۔ ادبی معیاروں کے اخذ کرنے کا انھوں نے طریقہ یہ رکھا ہے کہ پہلے وہ ادیب کی مختلف تحریروں سے اس کے نقطۂ نظر کا تعین کرتے ہیں پھر اسی نقطۂ نظر کو بنیاد بنا کر اس ادیب کے جملہ ادبی کارناموں کا جائزہ لیتے ہیں۔ تشریحی تنقید میں داخلی شہادت پر اسی طرح بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ میری نظر میں "گفت و شنید" تشریحی تنقید کے زمرے میں آتی ہے۔ آج کی عالمی تنقید نگاری میں سب سے غالب رجحان یا رویّہ یہی ہے۔ یہ الگ بحث ہے کہ تشریحی تنقید اعلیٰ تنقید ہے یا اسفل۔ اس مجموعے میں ممتاز شیریں، قرۃ العین حیدر اور راجندر سنگھ بیدی پر اچھے مضامین شامل ہیں۔ غالباً ظفر ادیب صاحب کو شعری ادب سے زیادہ افسانوی ادب سے دلچسپی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانوی ادب سے متعلق ان کے مضامین شعری ادب سے متعلق مضامین کے مقابلے میں کہیں زیادہ تشفی بخش ہیں اور یوں بھی احسان دانش اور ساحر لدھیانوی کو جدید شاعری کی نمائندگی کا اعزاز بخشنا کم از کم ۶۸ء میں اعلیٰ تربیت یافتہ ذوق کا ثبوت نہیں ہے۔ تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ ہر لحاظ سے اس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔

دکنی رباعیاں

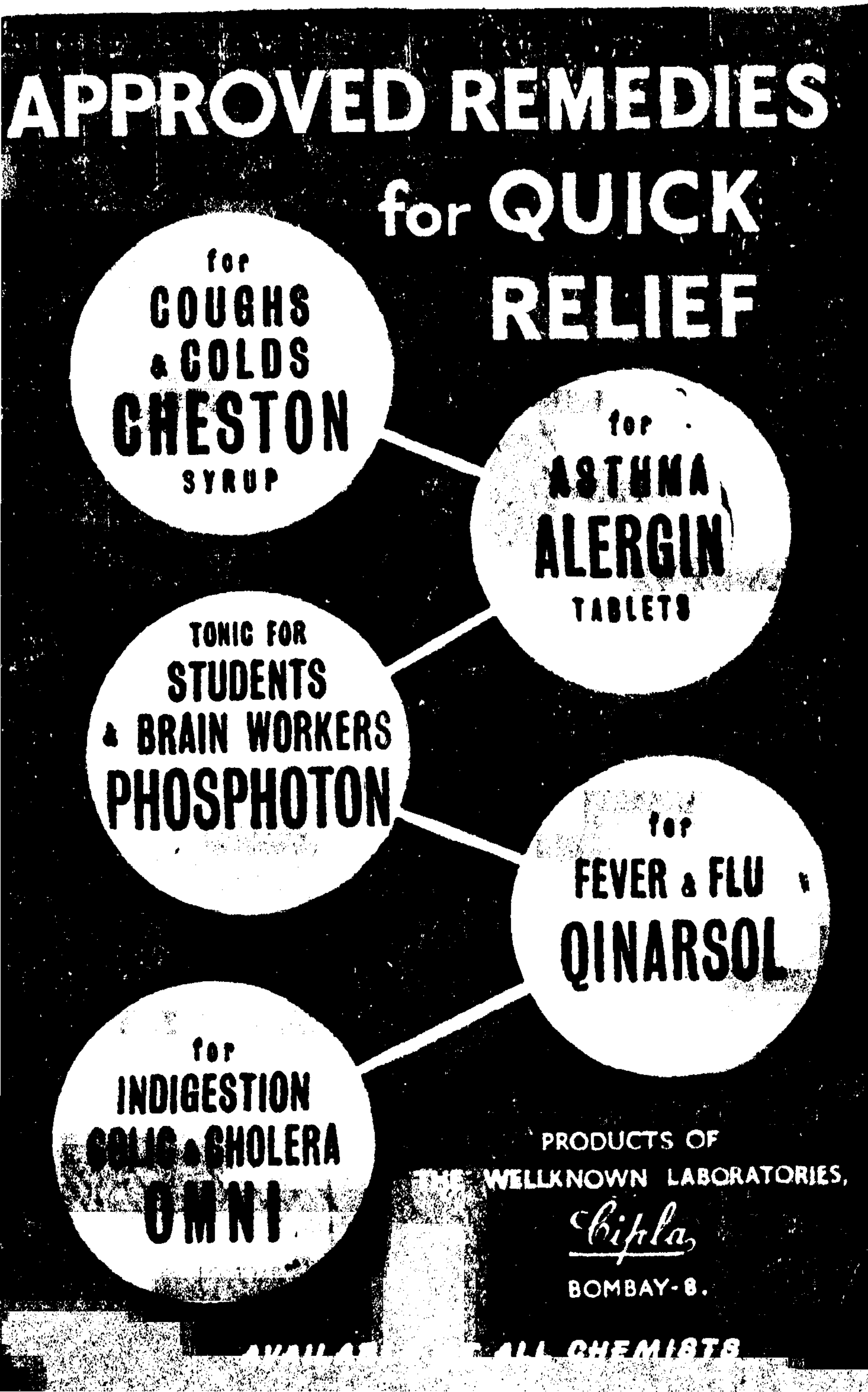
مرتبہ: ڈاکٹر سیدہ جعفر

قیمت: چھ روپے ، ملنے کا پتہ: آندھرا پردیش ساہتیہ اکاڈمی، حیدرآباد

ڈاکٹر سیدہ جعفر ہمارے ادبی اور تحقیقی حلقے میں خاصی معروف و ممتاز ہیں۔ ادبی تحقیق کے رمز شناس ان کے کارناموں کی داد دیتے رہے ہیں۔ جس رفتار سے ان کی کتابیں شائع ہوئی ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنی توجہ اور کتنی لگن سے علمی کاموں میں لگی رہتی ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں اب تک شائع

VALUE JUDGEMENT


شربت نزلہ
معمولی بخار
کھانسی ، زکام
اور نزلہ کے لیئے
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ


APPROVED REMEDIES
for QUICK
RELIEF
for
COUGHS
& COLDS
CHESTON
SYRUP
for
ASTHMA
ALERGIN
TABLETS
TONIC FOR
STUDENTS
& BRAIN WORKERS
PHOSPHOTON
for
FEVER & FLU
QINARSOL
for
INDIGESTION
COLIC & CHOLERA
OMNI
PRODUCTS OF
THE WELLKNOWN LABORATORIES,
Cipla
BOMBAY-8.

جامعہ

سالانہ چندہ چھ روپے — قیمت فی پرچہ پچاس پیسے

جلد ۵۷	بابت ماہ مارچ ۱۹۶۸ء	شمارہ ۳

فہرست مضامین

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

شذرات

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو ہوا تھا، اس کے بعد ہر سال اُن کی یاد میں جلسے ہوتے ہیں اور تقریریں کی جاتی ہیں، امسال ۲۲ فروری کو اُن کی دسویں برسی منائی گئی، یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا، ایک رسم کے طور پر ایک ڈھرّا بن کر، مگر کیا اس سے مولانا مرحوم کی روح کو سکون [illegible] کہ جیسے جب وہ زندہ تھے تو تنہا تھے، بالکل اسی طرح مرنے کے بعد اُن کے [illegible] اداس، بے یار و مددگار، یوسف بے کارواں بن کر صحرا صحرا، بستی بستی پھر رہے ہیں، اور کوئی [illegible] نہیں ملتا، حقیقت یہ ہے کہ ہم نے مولانا کو بھلا دیا ہے، اُن کے افکار و خیالات کو بھلا دیا [illegible] روایتی مزاج نے اُن کے نام کے ساتھ ایک مبہم، بے جان اور بے نام عقیدت [illegible]، اور وہ بھی ہم میں ایسے کتنے ہیں اور آنے والی نسلوں میں کتنے رہ جائیں گے،

پنڈت جواہر لال نہرو نے جامع مسجد کے جوار میں اُن کی آخری آرام گاہ کا انتظام کیا۔ خیال تھا کہ یہی جگہ مناسب ہے کہ مسلمان ہر روز نہیں تو کم از کم جمعہ جمعہ، عیدین اور جمعۃ الوداع کے موقعوں پر مولانا کے مزار پر [illegible] گے، لیکن آج جو منظر یہاں دیکھنے میں آتا ہے وہ بڑا دلخراش اور حوصلہ شکن ہے، [illegible] مولانا عمر بھر غریب الدیار رہے، آج بھی وہی غربت کا عالم ہے، کس سے کہئے اور [illegible]

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور تصنیفی کارناموں پر تحقیق کی جائے گی، اُن کی کتابیں چھپیں

چاہتے تھے، یہی خوبی وہ چاہتے تھے کہ علماء میں بھی ہو، لیکن جدید تعلیم یافتہ قسم کے پڑھے لکھے مسلمانوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اُن کی باتوں کو ... اعتنا نہیں سمجھا، جدید تعلیم یافتہ طبقے کا ایک بڑا حصہ اُن کے سیاسی خیالات کو پسند نہیں کرتا تھا، اور طبقۂ علماء میں شاید ایک عالم بھی ایسا نہیں ہے جو ان کے مذہبی خیالات سے اتفاق کرتا ہو۔ مولانا نے اپنے مذہبی خیالات کے اظہار میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے، لیکن اس احتیاط کے باوجود "مہدی" کی ایک معمولی رمق بھی قابل قبول نہیں سمجھی گئی، برصغیر ہندوپاک کے کروڑوں مسلمانوں کا اس سے بڑھ کر المیہ اور کیا ہو سکتا ہے،

... اور سیکولرزم کے حامی تھے، اُن کے خیال میں ہندوستان کی نجات، ایک بڑے اور باوقار ملک کی حیثیت سے جمہوری اور سیکولر اصولوں کی پیروی ہی میں ہے، لیکن خود آج اُن کے ہم وطن، بلکہ ... جماعت کے با اثر افراد جس کے وہ تمام عمر رکن رکین رہے، ان اصولوں پر دیانتداری کے ساتھ کہاں تک عمل پیرا ہیں، کیا ... اپنے ہیروز کو خراج عقیدت پیش کرتی ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ... قوم آج انہیں یا اُن جیسے دوسرے مرحوم قومی رہنماؤں کو خلوص کے ساتھ اپنا ہیرو مانتی ہے؟

مولانا آزاد ملک کی تقسیم کے شدید مخالف تھے، گاندھی جی اور پنڈت نہرو نے بھی جب تقسیم کو مان لیا تو بھی وہ انکاری ہی رہے، کیونکہ وہ اصولاً اسے مُضر اور مہلک سمجھتے تھے، اُن کا خیال تھا کہ اس کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے اُن تمام سیاسی اور اخلاقی قدروں کے گلے پر چھری پھیری جائے جن کے لئے ملک نے مصیبتیں جھیلی تھیں اور قربانیاں دی تھیں، لیکن ہوا وہی جو ہونا تھا، مولانا پھر آدمیوں کے جنگل میں ... گئے ـــــ تنہا، غریب الدیار، سناٹے کی آواز ـــــ اور آج بھی جب کبھی مجھے جامع مسجد کے علاقے میں آدمیوں کے ہجوم سے گذر کر مولانا کے مزار پر جانے کی توفیق ہوتی ہے تو تنہائی سرگوشیاں کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے "میں مولانا کے لئے تھی اور مولانا میرے لئے"،

مولانا ابوالکلام آزاد نے علی گڑھ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

تفاوت ست میان شنیدن من و تو

تو بستن در و من فتح باب می شنوم

عرصہ کے بعد، امسال جے پرکاش نرائن نے یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں علی گڑھ سے خطاب کرتے ہوئے جو

باتیں کہی ہیں اُن سے مولانا کی وہ بات، نئے سیاق و سباق کے ساتھ، ایک بار پھر تازہ ہو گئی، اس وقت ملک میں ایک ہنگامہ بپا ہے، انتشار اور اختلاف کی طاقتیں زور پکڑ گئی ہیں، بھائی بھائی کا دشمن اور انسان انسان کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے، ان حالات میں جمہوریت، سیکولرزم اور تمام شریفانہ اصولوں کو خطرہ لاحق ہے، اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امید اور حوصلے کے تمام دروازے بند ہو گئے ہیں، لیکن آدمی میں اگر ہمت اور دوربینی ہو تو دروازہ کھلنے کی آواز بھی سنائی دے گی، اسی طرف، اپنے مخصوص لب و لہجہ میں، جے پرکاش نرائن نے علی گڑھ کے طلباء اور اساتذہ کی توجہ مبذول کرائی ہے، دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان اگر ہوں تو کہا جا سکتا ہے کہ نئے ہندوستان میں، خصوصاً آج کے حالات میں، علی گڑھ جمہوریت، سیکولرزم اور قومی یکجہتی کا ایک مستحکم ستون بن سکتا ہے، علی گڑھ اگر ہمت، روشن ضمیری اور استقلال و استقامت سے کام لے تو مسلمان اس ملک کی آبرو بن سکتے ہیں، یہ امکانات اس یونیورسٹی کے لئے کھلنے والے دروازے کا حکم رکھتے ہیں اور میں اُس عالم میں کہ جب اس کے نونہالوں کو بظاہر اپنے لئے تمام دروازے بند ہوتے ہوئے نظر آ رہے ہوں۔

شری جے پرکاش نرائن نے کہا کہ "اس یونیورسٹی اور اس کے عظیم بانی نے کس طرح ماضی کے اندھیرے اور ظلمت پسندی کی چہار دیواریوں کو توڑنے کے لئے انقلابی رول ادا کیا ہے"۔ بالکل اسی طرح آج بھی جب ملک میں "نور و ظلمت" کی آویزش شباب پر ہے، یہ یونیورسٹی انقلابی رول ادا کر سکتی ہے، بشرطیکہ یہاں کے تعلیم دینے والے اور تعلیم پانے والے اپنے حصار، اپنی "خود پرستی اور خود آسودگی" کی غیر حقیقی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آئیں اور اس میدان کارزار میں کود پڑیں جہاں سیکولر جمہوریت اور ایسے سماجی نظام کی جنگ لڑی جا رہی ہے جو معاشی خوشحالی کی ضامن ہوگی۔

کہا جا سکتا ہے کہ یہ کام آسان نہیں ہے، بے شک یہ کام مشکل ہے، لیکن مُسلم یونیورسٹی کا کام ہمیشہ مشکل ہی رہا ہے، سرسید مرحوم نے جن حالات میں کام کیا وہ کچھ کم مشکل نہیں تھے، اصلاح و تجدید کے جو نقشے انھوں نے پیش کئے اُن کی شدید مخالفت کی گئی، لیکن آخر کار وہ ایک طرح نو ڈالنے میں کامیاب ہو گئے، کچھ اسی طرح کا کام علی گڑھ والوں کو آج کرنا ہے، پہلے اپنے ذہن کو جمود، اپنے دل کو خوف اور اپنی طبیعت کو اضمحلال سے پاک کرنا ہے اور پھر وہ مضبوط قدم اٹھانا ہے جس سے جمہوری اور سیکولر طاقتوں کے ہاتھ مضبوط ہوں اور ملک ترقی و اصلاح کی طرف بڑھے، پہلے اپنی زنجیریں توڑنی ہیں جبھی ظلمت پسندی کے دوسرے قیدیوں کی رہائی کا سامان ہوگا۔

ضیاء الحسن فاروقی

ژاں ژاک روسو

(۱۷۱۲ء — ۱۷۷۸ء)

(۲)

روسو کا پہلا قابلِ قدر علمی کارنامہ، جیسا کہ اس کی سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے، اس کا وہ مقالہ [illegible] میں دیژون اکیڈمی کے انعامی مقابلے کے لئے لکھا تھا اور جس کا عنوان تھا "کیا علوم وفنون کے احیاء سے اخلاق کو ترقی ہوئی ہے یا نہیں" اس مقالے میں اُس نے جو موقف اختیار کیا وہ عنوان کی مخالفت میں تھا اور اسی لئے اس کا چرچا بھی بہت ہوا۔ اپنے عہد کے رائج طور طریقے اور علمی معیار سے ہٹ کر اُس نے اس موضوع پر اخلاقی نقطۂ نظر سے بحث کی اور اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر یہ نتیجہ نکالا کہ جس قدر ہمارے علوم وفنون درجۂ کمال کی طرف بڑھے اسی قدر ہمارے اخلاق بگڑتے گئے۔ لیکن کسی طرح ہمیں یہ نہیں باور کر لینا چاہئے کہ وہ علوم وفنون اور تہذیب و تمدن کا [illegible]۔ ہاں جب وہ اپنے گردوپیش کی دنیا میں عالموں کی خوشامد، عیش پرست اُمراء کی [illegible] ذاتی، مہذب انسانوں کی ریاکاری اور مذہبی گروہ کی دنیاداری اور چالاکیاں [illegible] دیکھتا تھا تو اس کے رومانوی ذہن میں اس انسان کی تصویر ابھرتی تھی جو سادہ [illegible] اور تہذیب وتمدن سے ناآشنا تھا، قوموں کی تاریخ میں ایسی واضح مثالیں بھی موجود تھیں کہ وحشی قبائل نے عظیم الشان سلطنتوں اور تہذیبوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اس کے سامنے ایتھنز کی مثال بھی تھی جسے اپنی شاعری، خطابت، علم وفلسفے، فن اور مہارت فن

[illegible]

نکلے گا کہ اس میں علمی خطابت کے سوا اور کچھ نہیں، معلومات اور مواد کے اعتبار سے اس کی بہت اہمیت نہیں ہے، اس کے متعلق روسو نے خود اعترافات میں اپنی رائے اس طرح لکھی ہے: "بیان کے زور اور جذبے کی گرمی سے بھرپور یہ مقالہ پورے طور پر ترتیب خیال اور منطقی استدلال سے خالی ہے، میری تمام تصنیفوں میں یہی مقالہ دلائل کے اعتبار سے سب سے کمزور اور توازن کے لحاظ سے سب سے [illegible] ہے، کسی انسان میں خواہ کتنی ہی صلاحیت کیوں نہ ہو، لکھنے کا فن اُسے دیر میں آتا ہے۔" یہ بالکل صحیح ہے، اس مقالے میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ یکطرفہ اور بیباکانہ کہی گئی ہیں اور یہ جانبداری اتنی واضح اور سادہ لوح ہے کہ کبھی کبھی یہ گمان گذرتا ہے کہ روسو نے یہ خیالات سنجیدگی کے ساتھ نہیں پیش کئے اور فکر و نظر کے خزانے میں اس سے کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اسی مقالے سے روسو کی شہرت ہوئی اور پیرس کے پڑھے لکھے طبقے میں اس کی دھاک بیٹھ گئی، اس مقالے سے، بہرحال، یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ فطرت کو وہ آئیڈیل قرار دیتا ہے، اور شروع ہی سے یہ خیال اس کے ذہن میں جما ہوا ہے، اور صرف اسی کو وہ اپنے ذہن کی تمام توانائیوں کے ساتھ سارے حدود کو نظر انداز کرتا ہوا، مختلف طریقوں سے پیش کرتا ہے، اس لحاظ سے اس مقالے کو ہم روسو کے ارتقائے فکر کی کنجی کہہ سکتے ہیں، یعنی فکر و خیال کا وہ سفر جو "معاہدۂ عمرانی" پر ختم ہوا، اس کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔

روسو کی دوسری تصنیف "انسانوں میں عدم مساوات کا آغاز" ہے۔ یہ مقالہ بھی اُس نے دیژوں اکیڈیمی کے لئے لکھا تھا، اس مقالے میں اُس نے کئی سیاسی اور عمرانی مسئلوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور خیالات اور اسلوب بیان کے لحاظ سے یہ پہلے مقالے سے بہتر ہے، یعنی اس میں اُس طرح کی انتہاپسندی نہیں ملتی جیسی کہ علوم و فنون والے مقالے میں تھی، یہ ضرور ہے کہ انسان کی "فطری حالت" اور "سماجی حالت" میں جو نمایاں فرق پہلے تھا، وہ اس مقالے میں بھی موجود ہے، لیکن اب وہ اپنے نظریوں کو جذبے کی شدت اور خطابت کی گرمی کے بجائے عقلی دلائل سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اسے بھی مانتا ہے کہ کچھ نہ کچھ اس کے موقف کے

خلاف بھی کہا جا سکتا ہے، مزید براں "فطری حالت" کے متعلق بھی اُس کے خیال میں تبدیلی اور ترقی کا احساس ہوتا ہے، اب یہ سماج کی برائیوں کے مقابلے میں محض ایک خالی خو[illegible] نہیں ہے۔ اس خیال کے کچھ مثبت پہلو بھی سامنے آتے ہیں [illegible] دوسرا مقالہ اُس کے ذہنی سفر کی د[illegible] کہا جا سکتا ہے۔

[illegible] کے کا اصل موضوع اس نے یہ بتایا ہے کہ تاریخ انسانی میں "وہ وقت معین کیا جائے [illegible] اور [illegible] کا دور دورہ ہو گیا اور خود فطرت انسانی قانون کے ماتحت کر دی [illegible] یہ بتایا جائے کہ کن "معجزوں" کے نتیجہ میں طاقت وروں نے کمزوروں کو اپنی اطاعت [illegible] نے بھی سچی خوشی کے بدلے ایک فرضی سلامتی خرید لی۔" روسو نے ان [illegible] اور مفکروں پر تنقید کی ہے جنھوں نے انسان کی فطری حالت کا نقشہ غلط خطوط پر کھینچا اور انسان کی [illegible] رہے، انھوں نے فطری زندگی کو اس انداز سے بیان کیا گویا وہ ایک تاریخی حقیقت ہے، حالانکہ ان کی رائے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ انھوں نے اپنے معاشرہ کے [illegible] کمزوریوں کو فطری انسان کے سر منڈھ دیا، اس سلسلہ میں اُس نے چبھتی ہوئی ایک بات [illegible] مصنف اور مفکر "ذکر کرتے ہیں وحشی کا اور تصویر بناتے ہیں مہذب آدمی کی۔" اُس نے انسان کی فطری حالت کا جو خاکہ پیش کیا ہے وہ اس طرح ہے کہ ہر انسان، فطری حالت میں، اپنی [illegible] تھا، یعنی اس پر کوئی اخلاقی اور سماجی پابندی نہیں تھی، اس لئے اگر وہ اچھا نہیں تھا [illegible] جبلت کی بنا پر جو ضرورتیں ہوتی تھیں، انھیں وہ آزادی سے پورا کرتا تھا اور پھر [illegible] تا تھا، یہ دنیا خود اس کے لئے پُراسرار تھی، پھر آج کوئی کیسے اس پر حکم لگا سکتا [illegible] ابھی انسانی عقل خود عہد طفولیت میں تھی، نہ معلوم کتنے عہد [illegible] تب کہیں عقل و شعور نے ترقی کر کے انسان کو اس قابل بنایا کہ وہ گرد و پیش کے دوسرے محرکات میں تال میل قائم کر کے اپنے ارادے اور قوت ایجاد سے اپنی زندگی میں تغیر پیدا کر سکے، اسی چیز نے اس پر باہمی امداد کی سود مندیاں واضح کیں، اُس نے اپنی بیوی اور بچے کو پہچانا، خاندان [illegible]

اور پھر ملکیت کا تصور ابھرا۔ روسو نے اس سلسلہ میں اپنے مقالے کے دوسرے حصہ کو اس جملہ سے شروع کیا ہے: "معاشرہ کا اصل بانی وہ پہلا شخص تھا جس نے زمین کے ایک ٹکڑے کے چاروں طرف باڑھ لگا کر یہ کہنے کی ہمت کی کہ یہ میرا ہے، اور جسے ایسے سادہ لوح لوگ مل گئے کہ انھوں نے اس کی بات مان لی۔ کوئی بھی شخص اگر اس وقت اس باڑھ کی خندق اور نشانات مٹا دیتا اور اپنے ساتھیوں سے کہتا اس جھوٹے دعویدار سے ہوشیار رہو، تم کہیں کے نہ رہوگے اگر تم نے یہ بات بھلا دی کہ زمین کی ہر چیز ہم سب کی ہے اور خود زمین کسی کی ملکیت نہیں ہے، تو وہ انسانیت کا کتنا بڑا محسن ہوتا کہ اس کی وجہ سے نوعِ انسانی بے شمار جرائم، لڑائیوں، قتل و غارت گری، خوفناک تباہیوں اور مصیبتوں سے محفوظ ہو گئی ہوتی" لیکن روسو جذبہ کی شدت سے جلد ہی اپنے آپ کو آزاد کر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ شاید اس واقعہ سے پہلے ہی صورت حال اتنی بدل چکی تھی کہ انسان اپنی اصلی حالت میں نہیں رہ سکتا تھا، اور وہ اس صورت حال پر آنسو بھی نہیں بہاتا کیونکہ وہ اسے ناگزیر سمجھتا ہے، اور باوجود اس کے کہ خرابیاں پیدا ہو چلی تھیں، وہ انسانی ارتقاء کی اس منزل کو 'دنیا کے شباب کا زمانہ' کہتا ہے،

اس موقع پر یہ بات اپنے ذہن میں صاف کر لینی چاہیئے کہ روسو 'فطری انسان' کو محض ایک معیار قرار دیتا ہے، اور یہ معیار محض ایک شدید ذہنی ردِعمل کا ترجمان ہے، اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ فطری انسان کو اُن تمام خوبیوں اور خصوصیتوں کے ساتھ جن کا وہ ذکر کرتا ہے، کوئی تاریخی حقیقت تصور کرتا ہے، ہوبز، اسپنوزا اور لوک نے انسان کی فطری حالت کے بیان میں بڑی افراط و تفریط سے کام لیا تھا اور روسو کا بھی الزام ہے ان مفکروں پر۔ لیکن روسو خود بھی مبالغہ سے بالکل دامن نہیں بچا سکا ہے، اُس کا فطری انسان بھی محض اُس کے تصور کی ایجاد ہے، انسان جب جانوروں کی سی زندگی گذارتا تھا تو یقیناً وہ ان تفکرات اور الجھنوں سے آزاد تھا جو ترقی[1]، تہذیب اور تمدن

---

[1] یہاں 'ترقی' کا لفظ بڑے وسیع اور بلیغ مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے، اس میں شعور کی وہ بیداری بھی شامل ہے جس کے طفیل انسان کو خود شناسی اور خدا شناسی کا جوہر ملا۔

زندگی ہیں، کوئی ٹیکس نہیں لگانا چاہیئے، اس کے برخلاف تعیشات پر بھاری محصول عائد کرنا چاہیئے، ظاہر ہے یہ خیالات ایک پختہ ذہن کے ہی ہو سکتے ہیں، اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاہدہ عمرانی کی تاریخ تصنیف سے [illegible] رومانی طرز فکر سے بڑی حد تک آزاد ہو چکا تھا۔

روسو کی سب سے زیادہ مکمل سیاسی تصنیف 'معاہدۂ عمرانی' ہے جو ۱۷۶۲ء میں "امیل" کے ساتھ شائع ہوئی، اس طرح ہم ۱۷۶۲ء کو اس کے ذہنی سفر کی آخری منزل کہہ سکتے ہیں، اب تک اس نے جو کچھ لکھا تھا، اس میں ایک طرح سے مناظرانہ پہلو غالب تھا، لیکن اب اس کے نظریے پختہ ہو چکے تھے اور ان کے تمام پہلو اس کے سامنے تھے، اور یہی وجہ ہے کہ ۱۷۶۲ء میں وہ سیاسیات اور تعلیم کے بنیادی مسئلوں پر اپنے غور و فکر کا نچوڑ دنیا کو پیش کرتا ہے، پہلے کی تحریروں میں اس کا مقصد تخریبی معلوم ہوتا ہے، 'معاہدۂ عمرانی' میں اس کی نظر تعمیر پر ہے، اور یہ صحیح ہے کہ نئی تعمیر کے لئے تخریب ضروری ہوتی ہے،

'معاہدۂ عمرانی' کے مطالعہ کے لئے یہ بہتر ہوگا اگر اس سے پہلے کے مقالے بھی پڑھ لئے جائیں ویسے یہ کتاب خود اپنی جگہ مکمل ہے، اس کتاب میں روسو نے مون ٹسکیو کی طرح یہ نہیں کیا ہے کہ موجود ریاستوں کے اداروں پر بحث کرے، بلکہ اس نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ بنیادی اور ضروری اصول پیش کرے جو ہر جائز اور قانونی ہیئت اجتماعی کی اساس بن جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ معاہدۂ عمرانی میں وہ جذباتیت مفقود ہے جو روسو کی اکثر تحریروں کی خصوصیت ہے، اس میں جو اصول بیان کئے گئے ہیں ان سے اگرچہ جمہوری نظام کی کسی قدر تائید ہوتی ہے لیکن دراصل اجتماعی آمریت کے جواز کا پہلو زیادہ نکلتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شہری جمہوریت کے حق میں تو تھا لیکن بڑے ملکوں میں جمہوریت کو مناسب اور ممکن نہیں تصور کرتا تھا، ایک جگہ تو اس نے کھل کر یہ بات کہدی ہے کہ چھوٹی ریاستوں کے لئے جمہوریت، اوسط درجہ کی ریاستوں کے لئے اشرافیہ اور بڑی ریاستوں کے لئے بادشاہت ہی سب سے زیادہ موزوں نظام حکومت ہے، جمہوریت سے اس کی مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ نظام حکومت جس میں ہر شہری براہ راست

شریک ہو سکے، نمائندہ حکومت کو وہ "انتخابی اشرافیہ" کہتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ شہری ریاست کے لئے اُس کے دل میں بڑی جگہ تھی اور یونانیوں کا اسی وجہ سے وہ بڑا مدّاح تھا، روسو کے سیاسی فلسفے کے اس پہلو پر عام طور پر بہت کم زور دیا گیا [illegible]

[illegible] طرح کتاب میں خطابت بھی بہت کم ہے، لیکن پہلے باب کا آغاز بڑے [illegible] خطیبانہ انداز میں کیا گیا ہے، مثلاً وہ کہتا ہے کہ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا [illegible] آپ کو دوسروں کا آقا سمجھتے ہیں، لیکن اصل میں ان سے بھی بڑھ کر غلام ہوتے [illegible] تبدیلی کیسے ہوئی؟ مجھے نہیں معلوم۔ یہ حق بجانب کیونکر ثابت کی جا سکتی ہے؟ [illegible] مسئلہ کو حل کر سکتا ہوں۔" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روسو نے آزادی کو اپنی فکری کاوشوں کا موضوع برائے نام بنایا ہے، در اصل وہ مساوات کو زیادہ اہم قرار دیتا ہے، مساوات کو وہ حریت پر، آزادی کی قیمت دے کر بھی حاصل کرنے کا آرزومند ہے۔

[illegible] بات کہ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے" ہر لحاظ سے صحیح نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی [illegible] حالت میں بھی وہ آزاد نہیں تھا، فطری حالت سے ترقی کرتے کرتے جب وہ وقت [illegible] اپنی "ابتدائی آزادی" کے زمانے میں (یہ ابتدائی آزادی جیسی کچھ بھی رہی ہو) اپنے آپ کو قائم نہیں رکھ سکتا تھا، تو یہ ضروری ہو گیا کہ وہ دوسروں سے مل کر معاشرہ کی بنیاد ڈالے [illegible] نے اس معاشرہ اور پھر بعد میں سیاسی نظام کو برحق ثابت کیا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسان [illegible] جکڑا ہوا ہے، لیکن یہ زنجیریں خود اس کی بنائی ہوئی ہیں، اور یہ در اصل [illegible] نظری، خود غرضی اور نفس پرستی نے ڈھالی ہیں، ورنہ سچی آزادی ایک ایسے معاشرہ [illegible] حاصل ہو سکتی ہے جہاں صحیح اور صالح قسم کے سیاسی اصولوں کی کار فرمائی ہو،

روسو کے نزدیک سیاسی معاشرہ کی بنیاد نہ تو ظلم پر قائم ہے اور نہ خوف پر، بلکہ یہ قائم [illegible] افراد کی رضامندی اور ارادہ سے اور اسی لئے اس کی ایک اخلاقی بنیاد ہوتی ہے، جہاں رضامندی اور ارادہ کو دخل ہوگا وہاں اجتماعی معاہدہ میں اخلاقی شعور کی کار فرمائی ہوگی، لیکن

کے اجتماعی معاہدہ کے نظریے پر بحث کرنے سے پہلے ہم یہ دیکھ لیں تو اچھا ہوگا کہ کس طرح فطرتی آزادی اور "فطری حالت" میں انسان کی مسرت، آسودگی اور بے فکری کا گن گانے والا یہ مفکر سیاسی معاشرے کو، اس کی تمام پابندیوں کے باوجود، انسان کے لئے نعمت غیر مترقبہ تصور کرتا ہے۔ معاہدۂ عمرانی کے [illegible]ھویں باب کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے، وہ کہتا ہے:

"فطری حالت سے گذر کر سیاسی نظام میں داخل ہونے سے انسان میں ایک حیرت انگیز تبدیلی ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے عمل میں جبلت کی جگہ انصاف کا معیار کارفرما ہو جاتا ہے اور اس کے افعال میں وہ اخلاقی صفت پیدا ہو جاتی ہے جو پہلے موجود نہ تھی، اس وقت جسمانی خواہش کے بجائے فرض کا احساس، ہوس کی جگہ حق کا احساس، انسان کے عمل کا محرک بن جاتا ہے اور انسان جو اب تک اپنے سوا کسی اور کا خیال نہیں کرتا تھا، خود کو دوسرے اصولوں کے مطابق چلنے پر مجبور پاتا ہے اور اُسے نفس کا کہنا ماننے سے پہلے عقل کے مشورے پر چلنا پڑتا ہے۔ اگرچہ اس حالت میں وہ بہت سے اختیارات کھو بیٹھتا ہے جو اسے فطرت کی طرف سے عطا ہوئے ہیں، لیکن ان کے بدلے میں اُسے اتنے ہی بڑے فوائد بھی پہونچتے ہیں، اس کے قوٰی استعمال میں آتے ہیں، اس کے خیالات وسیع، اس کے احساسات لطیف اور اعلیٰ ہو جاتے ہیں، اس کی ساری شخصیت بلندی کے اس درجہ پر پہونچ جاتی ہے کہ اگر اس نئی حالت میں خود اس کی زیادتیاں اور دستور کی بُرائیاں اسے اس کی قدیم حالت سے بھی زیادہ نیچے نہ کر دیتیں، تو اس کا فرض ہو جاتا کہ ہمیشہ اس مبارک لمحے کو دعا دیتا رہے جب وہ فطری زندگی کی قید سے رہا ہوا اور ایک بیوقوف اور جاہل جانور سے، ایک ذی عقل ہستی، ایک انسان بن گیا۔"[1]

اب سوال یہ ہے کہ اس سیاسی معاشرہ کی تشکیل کیسے برحق سمجھی جائے؟ اِسے ردسو نے

---

[1] ترجمہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی کتاب 'تاریخ فلسفۂ سیاسیات' سے لیا گیا۔

[illegible]

کی طرف مائل رہتا ہے اور شہریوں کو صحیح راستے پر چلنے کی ترغیب دیتا رہتا ہے۔ معاہدۂ عمرانی کے چوتھے حصے کے ابتدائی جملوں سے اس مبہم نظریے کی کسی قدر وضاحت ہو جاتی ہے۔

جب تک کہ انسانوں کی ایک متحد جماعت اپنے آپ کو ایک جسم سمجھتی رہے، اس کا عام حفاظت [illegible] ایک ارادہ رہتا ہے، اُس وقت ریاست کے تمام قوی چست اور سادہ ہوتے ہیں اور اس کے سیاسی اصول صاف اور روشن، اس میں اغراض کی پیچیدگیاں اور تضاد نہیں پایا جاتا، عام مفاد حاصل کرنے کی صورت ہر جگہ بالکل واضح ہوتی ہے اور اسے دریافت کرنے کے لئے صرف تھوڑی سی عقل سلیم درکار ہوتی ہے۔

یہاں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ارادۂ عامہ اور اکثریت کا ارادہ ایک ہی چیز نہیں ہے، لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ارادۂ عامہ کے وہ مظاہر کون سے ہیں جنھیں ہم دیکھ سکیں، روسو کے پاس بھی اس کا کوئی جواب نہیں، البتہ اُس کی رائے میں، جسے ہم منفی رائے کہہ سکتے ہیں، ارادۂ عامہ کے اظہار میں عملاً جو چیز مخل ہوتی ہے وہ ریاست میں مختلف انجمنوں کا وجود ہے، ایسی ہر انجمن کا اپنا ایک ارادۂ عامہ ہوگا، جو مجموعی طور پر پوری کمیونٹی کے ارادۂ عامہ سے متصادم ہو سکتا ہے، اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی کمیونٹی میں اتنے ووٹ نہیں ہیں جتنے کہ افراد ہیں بلکہ اتنے ووٹ ہیں جتنی کہ انجمنیں ہیں۔ اس سے ایک اہم نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ "ضروری ہے کہ ریاست کے اندر کوئی اور ریاست نہ ہو اور ہر انسان کے جو خیال ہوں وہ اس کے اپنے ہوں، لی کرگس نے جو نظام قائم کیا تھا اُس کی یہی خوبی تھی۔"

اب اگر اصول کے مطابق ایک نظام قائم کیا جائے تو کیا صورت ہوگی؟ ریاست کا اپنا ایک کلیسا اور مذہب ہوگا اور دوسرے کلیسائں اور مذہبوں، سیاسی جماعتوں، ٹریڈ یونینوں اور دوسری تنظیموں پر پابندی لگا دی جائے گی، اور نتیجہ میں ایک اجتماعی آمریت اُبھرے گی جو فرد کی آزادی کو سلب کر لے گی، بعد میں روسو کو خیال آیا کہ یہ تو آسان کام نہیں ہے کہ انجمنوں اور تنظیموں پر پابندی لگا دی جائے، اس لئے اُس نے یہ تجویز کیا کہ اگر ایسا ناگزیر ہو تو انجمنوں کی تعداد جتنی زیادہ ہو اتنا ہی بہتر ہے تاکہ یہ انجمنیں ایک دوسرے کو بے اثر بنا دیں، بعد میں کتاب کے ایک دوسرے باب میں جب وہ حکومت

اور اس کی ماہیت پر غور کرتا ہے تو اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ انتظامیہ [illegible]
ارادہ ایسا جس کے کچھ اپنے مفاد ہوتے ہیں، یہ ارادہ [illegible] مفاد کمیونٹی کے ارادے اور مفاد سے متصادم
[illegible] ہیں۔ انتظامیہ کے ایک فرد کے پاس تین ارادے ہوتے ہیں: ایک اس کا اپنا ذاتی ارادہ، ایک
حکومت کا [illegible] عامہ، ہونا یہ چاہئے کہ یہ تینوں مل کر کمیونٹی کے ارادۂ عامہ کے تقاضے پورے
[illegible] کہ بتدریج وہ گھٹ کر شخصی ارادہ کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ تمام چیزیں متحد ہو کر
[illegible] آدمی کو عقل [illegible] اس سے محروم کر دینے کی سازش کرتی ہیں جسے دوسروں پر اختیار اور اقتدار
[illegible]

اس طرح ارادہ عامہ جو روسو کے خیال میں کبھی بگڑتا نہیں، ہمیشہ ایک سا اور خالص رہتا ہے، اس بات
کی [illegible] نہیں بن سکتا کہ حکمران ظالم نہیں ہو سکتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ارادۂ عامہ کی ماہیت اور نوعیت
[illegible] مسئلہ کہ ظلم اور جبر سے کیسے بچا جائے، جوں کا توں باقی رہتا ہے۔
[illegible] ساورنٹی) کے متعلق روسو کا نظریہ ہے کہ یہ حق کسی کو دیا نہیں جا سکتا اور نہ تو شہری اس
کو اپنے ارادے سے محدود کر سکتے ہیں، اگر ایسا ہو جائے تو وہ معاہدہ ہی ختم ہو جائے گا جس کے ذریعہ سیاسی معاشرہ
وجود میں آیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ فرمانروائی کی تمام شرطیں شہریوں کو پوری کرنی چاہئیں، فرمانروا کا کام
قانون وضع کرنا، حکومت کا طریقہ متعین کرنا، حاکموں کو مقرر کرنا اور ان کے لئے قاعدے اور ضابطے بنانا
ہے، اصل میں، روسو نے یہ باتیں اس لیے کہی ہیں کہ اسے حاکموں پر بھروسہ نہیں تھا، اور نمائندہ حکومت سے بھی وہ
ڈرتا تھا، پھر بھی وہ اس کی وضاحت نہیں کر سکا ہے کہ قوم اگر فرمانروا ہے تو وہ اپنی اس فرمانروائی کو کس طرح
ظاہر کرے۔ ایک طریقہ اس کے اظہار کا نمائندوں کے ذریعہ ہے، لیکن وہ اسے بھی پسند نہیں کرتا، نمائندوں
کے رواج کو وہ ایک طرح سے جاگیرداری نظام کا ترکہ سمجھتا ہے، اس لئے اسے "انگلستان کا دستور [illegible]
[illegible] اس کی رائے میں انگریز صرف اس تھوڑی سی مدت کے لئے صحیح معنوں میں آزاد ہوتے
ہیں جب وہ اپنے نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں، اور اپنی آزادی کے لمحوں کو وہ جس طرح استعمال کرتے ہیں
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسی قابل ہیں کہ ان کی آزادی چھین لی جائے۔" اس مبالغہ اور انتہا پسندانہ

سعید انصاری

فروبل ـــ کنڈرگارٹن کا بانی

[illegible] میں جرمنی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ کلیسا کا ایک پادری تھا۔ فروبل کی ابتدائی تعلیم بڑی بے تکی اور بے مقصد ہوئی۔ اس نے جو تعلیم بھی حاصل کی، اس [illegible] زندگی کے کاموں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کی نوجوانی کا زمانہ بھی کچھ تو یونیورسٹی کی تعلیم [illegible] کچھ عملی سائنس کے کاموں میں۔ وہ کبھی تو ایک محکمہ جنگلات کے افسر کے ہاں کام کرتا رہا، کبھی [illegible] پر بہ حیثیت محاسب اور ناظر کے کام کیا اور بعد میں ایک میوزیم میں مددگار کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ [illegible] میں کام کرنے سے اس کی زندگی میں دو نتیجے پیدا ہوئے: ایک تو یہ کہ اس میں فطرت سے ایک گہری دلچسپی پیدا ہوگئی اور دوسرے یہ کہ اس نے دیکھا کہ ساری فطرت میں ایک وحدت پائی جاتی ہے جس کا ذکر یونیورسٹی کے فلسفہ میں تو ملتا ہے لیکن تعلیمی کاموں میں کہیں نہیں دکھائی دیتا۔ اسی دوران میں اس کی پیسٹالوزی سے سوئزرلینڈ میں ملاقات ہوگئی اور شاید اسی کے اثر سے اس نے ۲۲ سال کی عمر میں معلمی کا پیشہ اختیار کرلیا اور فرانکفرٹ کے پیسٹالوزین انسٹی ٹیوٹ میں ملازم ہوگیا۔ یہاں دو سال قیام کرنے کے بعد اس نے تین بچوں کی اتالیقی کی اور انھیں لے کر وہ ویردون کے پیسٹالوزین انسٹی ٹیوٹ میں چلا گیا۔ اور اس سے کچھ عرصہ تک بے ضابطہ طور پر وابستہ رہا۔ اس تعلق سے اس کی [illegible] سے دلچسپی بڑھنے لگی اور وہ باقاعدہ طور پر یونیورسٹی میں داخل ہوگیا۔ لیکن اسی زمانہ میں نپولین کے حملہ نے جرمنی کی قومی زندگی کا شیرازہ بکھیر دیا تھا، اور اس کے حملہ کا مقابلہ کرنے کے لیے فروبل بھی میدان میں کود پڑا، اس لیے کہ اس سے اس کے قومی وحدت کے خیال میں مدد ملتی تھی۔ اس نے

... یم ... وقت ... تعلیمی اصلاح کے کام میں لگ گیا۔ اس نے یہ بات اچھی طرح محسوس کرلی تھی کہ ہماری تعلیمی زندگی میں وحدت اور مقصد کے یگانگت کی کس قدر کمی ہے۔ اس کے ساتھ پیسٹالوزی کے تعلیمی خیالات اور فطرت میں وحدت کے تصور سے اس کے خیالات کو بڑی تقویت پہنچی۔ اس کی سب سے پہلی کوشش اس شکل میں ظاہر ہوئی کہ اس نے ایک کسان کے جھونپڑے میں ۵ بچوں کو لے کر ایک تعلیمی ادارہ کھولا جس میں وہ ایک عرصہ تک پیسٹالوزی کی طرح اپنے خیالات کا تجربہ کرتا رہا لیکن پیسٹالوزی کی طرح اسے بھی صاحبان غرض کے ہاتھوں مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور اگرچہ اس کا یہ ادارہ پیسٹالوزی کے تجربوں سے زیادہ مضبوط بنیادوں پر قایم تھا، لیکن خود فروبل میں بھی عملی کاموں کی صلاحیت اسی قدر کم تھی۔

۱۸۲۶ء میں اس کی مشہور کتاب "انسان کی تعلیم" شایع ہوئی جس میں اس نے بچپن کی تعلیم پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا تھا۔ فروبل کو ہمیشہ سے چھوٹے بچوں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کا شوق تھا اور اس نے جس قدر بچوں کے کھیل اور بیساختہ مشغلوں کی اہمیت پر زور دیا ہے، اتنا اس سے پہلے کسی اور نے کبھی نہیں دیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۲۵ء میں حکومت کی طرف سے ایک انسپکٹر اس بات کے معائنہ کے لئے مقرر ہوا کہ اس ادارے میں کہاں تک انقلاب کی پرورش ہو رہی ہے۔ انسپکٹر جو خلاف رپورٹ دینے کے لئے آیا تھا، اس کی رپورٹ کا ایک حصہ اس ادارے کے بنیادی اصولوں کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"ذہن کی خود عملی اس ادارے کا سب سے پہلا اصول ہے، اس لئے یہاں جس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے، اس سے بچہ کا ذہن کسی مضبوط صندوق کی طرح نہیں بنتا جس میں ہر طرح کے اور مختلف قیمتوں اور شکلوں کے سکّے جو آج کل مروج ہیں، سب بھر دیے جائیں، بلکہ تعلیم بتدریج مسلسل اور متواتر ـــ لیکن ہمیشہ اندرونی طور پر، یعنی اس اصول کے مطابق جو انسانی ذہن کا خاصہ ہے ـــ بغیر کسی داؤ پیچ کے آسان سے مشکل کی طرف، مفرد سے غیر مفرد کے ذریعہ ہوتی رہتی ہے اور وہ بچہ اور اس کی ضرورتوں کے اس قدر مناسب ہوتی ہے کہ وہ پڑھنے

لکھنے کی طرف بھی اسی قدر شوق اور مستعدی سے بڑھتا ہے، جس قدر کہ کھیل کود کی طرف۔"

آٹھ دس سال کے ناکام تجربوں کے بعد فروئبل کے خیالات نے ایک متعین شکل اختیار کرنی شروع کی۔ اس نے بلیکن برگ نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں وہ پہلا ادارہ کھولا، جسے وہ بعد میں کنڈر گارٹن کا نام دیا۔ اور پھر اپنی زندگی کے بقیہ دن اسی کے اصول اور طریقوں کی اشاعت میں صرف کئے۔ اور اسی کے ساتھ اس نے کثرت سے اس موضوع پر لکھنا بھی شروع کیا۔ لیکن بعد میں جرمن حکومت کو ان نئے اداروں میں انقلاب کی بو آنے لگی اور اس نے انھیں سرے سے بند کر دیا۔

باوجود اس کے کہ فروئبل نے اپنے مجرد خیالات کو عملی شکل میں نہایت کامیابی سے پیش کیا، پھر بھی لوزی کی طرح اکثر اس کے خیالات نہایت مبہم اور ناصاف ہوتے تھے۔ اگرچہ اس کے خیالات فلسفیانہ ہوتے، لیکن ان میں اکثر عقل سے زیادہ جذبات کی جھلک نظر آتی تھی۔ اس پر مزید یہ کہ ان خیالات کی حد اکثر جا کر تصوف اور مابعد الطبعیات سے مل جاتی تھی، اس لئے ان کی وضاحت اور تشریح اور بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ فروئبل بڑا سخت مذہبی آدمی تھا، لیکن فلسفہ اور فطرت کی محبت نے اس کی مذہبیت میں وحدت کی بجائے کثرت کا رنگ پیدا کر دیا کہ اس کے خیالات میں ہر جگہ مثالیت نظر آنے لگی جو اس عہد کے فکر کے بالکل منافی تھا۔ اور اس سے نہ صرف فروئبل کے خیالات کو قبول عام حاصل ہونے میں دشواری ہوئی بلکہ اس کی بڑی حد تک مخالفت بھی ہونے لگی۔ پھر بھی آیندہ سطروں میں ہم اس کے بعض بنیادی اصولوں کی وضاحت کرنے کی کوشش کریں گے۔

قانون وحدت تعلیم کی اصل بنیاد:

فروئبل کے علمی خیالات کی بنیاد فلسفہ پر ہے جس کا سلسلہ کانٹ اور ہیگل سے جا کر ملتا ہے۔ اس پوری فلسفیانہ تحریک کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ اصل حقیقت اور اس کی عملی حیثیت زندگی اور وجود یعنی فطرت اور انسان دونوں کی بنیادی وحدت میں ہے۔ وہ ذات مطلق مادہ نہیں روح ہے۔ وہ روح جو خود شعوری ہے اور اسی خود شعوری روح میں وجود یعنی انسان اور فطرت دونوں کے معنی

اور اصلیت پائے جاتے ہیں، اس سے وہ وحدت ملتی ہے جس نے فطرت اور زندگی کی ہمہ جہتی کی تشریح ممکن ہے، اس لئے کہ اصل فرق اس جامع حیثیت وجود کی وحدتوں میں ہے جو ان ظاہری تنوعات کو معنی بخشتا ہے۔ فروبل کے نزدیک یہ روحانی حقیقت تمام زندگی اور وجود کا سرچشمہ ہے اور یہی مقصد تعلیم کا ہے کہ وہ فرد کی زندگی کو اتنی وسعت دے کہ وہ اس ہمہ گیر روح میں شامل ہو کر اس وجود کو اپنے اندر سمولے۔ یہی اندرونی تعلق تمام حقیقت کی اصل ہے، جو فرد کی زندگی میں تعلیم کا اصل مقصد ہے۔ فروبل نے اپنی کتاب "انسان کی تعلیم" کا آغاز ان لفظوں سے کیا ہے:

"تمام اشیاء میں ایک ابدی قانون کی فرمانروائی ہے۔ یہ ہمہ گیر قانون مبنی ہے ایک ہمہ گیر، زندہ، باشعور اور دائمی وحدت پر۔ یہی وحدت خدا ہے۔ تمام چیزیں اسی وحدت الوہی یعنی خدا سے وجود میں آئی ہیں، اور ان سب کا اصل سرچشمہ وہی وحدت الوہی یعنی تنہا ذات خداوندی ہے۔ خدا ہی تمام چیزوں کا سرچشمہ ہے۔ تمام اشیاء میں اسی وحدت الوہی یعنی ذات خداوندی کی حکومت ہے۔ تمام اشیاء کی زندگی اور وجود اسی وحدت الوہی یعنی ذات خداوندی کے ذریعہ سے ہے۔ تمام کائنات اسی سرچشمہ الوہی کی بدولت رواں دواں ہیں۔ وہ سرچشمہ الوہی جو ہر شے میں پایا جاتا ہے، وہی ہر شے کا جوہر ہے۔"

فروبل کے خیال کے مطابق ہر شے اور ہر فرد اس "ہمہ گیر شعوری وحدت" میں شریک ہے جو اس شے اور فرد کو معنی بخشتا ہے۔ اس وحدت کو پانا، اس اندرونی رشتہ کو نشوونما دینا، آفاقیت کے اس جذبہ کو جو ہر ایک فرد میں موجود ہوتا ہے، وسعت دینا اور اس "جوہر الوہی" کو ترقی دینا یہاں تک کہ فرد اپنے منتہا کو پہنچ جائے ــــ اسی کا نام تعلیم ہے۔ اس نے کہیں اور بھی یہ کہا ہے کہ "تمام اشیاء کی زندگی کا حاصل اور مقدر یہ ہے کہ وہ اپنے جوہر یعنی وجود الوہی کو کھولے۔" فروبل کی تمام تحریروں میں اسی قسم کا مذہبی جذبہ ملتا ہے۔ یہ کوئی خارجی شے نہیں ہے بلکہ یہ اس کے نظام کی اصل روح ہے۔ ہر شے اس روح میں شریک ہے اور اس حد تک وہ اسے پانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس بنیاد پر فطرت کی ہر شے سے خدا کا جلوہ ظاہر ہو سکتا ہے۔ تعلیم کا کام اس صلاحیت کو ابھارنا ہے کہ وہ جوہر اس ذات مطلق

کے ساتھ مل کر ایک ہوجائے اس کا قول تھا کہ فطرت اور تمام موجودات اس جلوۂ الوہی کا مظہر ہیں۔ ہر وجود [illegible] اظہار ہے۔ تمام اشیاء کا وجود جوہر الوہی کی بدولت اور اس کے ذریعہ ہوتا ہے [illegible] نے بار بار اور مختلف طریقوں سے اس خیال کو پیش کیا ہے جو اس کے فلسفہ [illegible] جزو ہے۔ اس کا یہی عقیدہ اصل میں اس کا وہی قانون وحدت ہے جو اس کے تعلیمی نظریہ کا تمام تر [illegible]

[illegible] نے اپنی کتاب "انسان کی تعلیم" میں اپنے بنیادی خیالات اور اصول پیش کئے ہیں اس طرح اس نے اپنی دوسری کتاب "تعلیم نمو کے ذریعہ" میں بھی انھیں کی تشریح اور تفسیر بیان کی ہے۔ [illegible] نے اپنے اسی بنیادی خیال جسے وہ "قانون وحدت" کہتا ہے اور جس کی اوپر کی سطروں [illegible]، اس کے مزید اسباب و وجوہ بیان کئے ہیں، جن کا خلاصہ ہم نمبروار ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ اس قانون کے ذریعہ ہم صحیح طور پر بچہ کی فطرت کو سمجھ سکتے ہیں۔

۲۔ اس کے ذریعہ بچہ زندگی کے تمام رشتوں کی مرکزی کڑی تسلیم کیا جاتا ہے۔

۳۔ اسی کے ذریعہ ہمیں تعلیم کا صحیح اور واضح مقصد ملتا ہے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے مناسب ذریعہ اور طریقہ حاصل ہوتا ہے۔

۴۔ جو تعلیم اس قانون پر مبنی ہو، وہ عملی ہوتی ہے، اس لئے یہ پوری تکمیل اور استعمال کی متقضی ہوتی ہے۔

۵۔ ایسی تعلیم ایک ایسے عملی زمانہ کے لئے بہت موزوں ہے جو ان اعلیٰ ترین تصورات کو جو تجربہ سے مرتب ہوتے ہیں، زندگی میں کمل ہوتے دیکھنا چاہتی ہے۔

۶۔ ایسی تعلیم زندگی کی ہر منزل میں اپنے آپ کو اس منزل کے تقاضوں کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ [illegible] وحدت کی یہ تعلیم ایک ایسے زمانہ کے لئے خاص طور پر موزوں ہے، جو انتشار، اختلاف اور انفرادیت [illegible]

ایسی تعلیم اعلیٰ ترین فلسفیانہ اور اخلاقی خیالات کو زندگی میں واضح اور حقیقت سے قریب تر کرے گی۔

۹۔ ایسی تعلیم صنعتی زمانہ کے میکانکی اور مردہ کن اثرات کو اور مزدوروں کی روز افزوں خرابیوں کو روکے گی، اس لیے کہ یہ بچہ کی طاقت کو ابھارتی، مضبوط بناتی اور ترقی دیتی ہے، تاآں کہ وہ ایک آزاد شخصیت پیدا کرسکے، اس لئے کہ یہ اس بات کی تعلیم دیتی ہے کہ کسی چیز کے ساتھ اس کے مزاج کے مطابق کس طرح برتاؤ کیا جائے، کام کو بہ حیثیت ایک تخلیقی عمل کے اونچا درجہ دیتی ہے اور خیال، ارادہ اور عمل کی قوتیں پیدا کرتی ہے اور اس طرح سیرت کی ایک صحیح بنیاد تیار کرتی ہے۔

وحدت کی اس حقیقت پر فروبل کو جو اعتقاد تھا، اسی کی بنیاد پر وہ یہ بھی مانتا تھا کہ فطرت بچہ کے سامنے خدا کا جلوہ پیش کرتی ہے۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ چھوٹے بچوں کی تعلیم میں ایک طرف جہاں مظاہر فطرت سے کام لینے اور مطالعہ فطرت پر اس قدر زور دیتا ہے، دوسری طرف اس مواد کے تمثالی طور سے پیش کرنے پر بھی اسی قدر اصرار کرتا ہے۔ اس نے نمو پذیر حیات میں بھی وحدت دیکھی اور اس بنیاد پر وہ نامی اشیاء میں ارتقاء کے نظریہ کا شروع ہی سے حامی تھا۔ اس کی وجہ سے وہ اس بات کا اور بھی قایل ہو گیا کہ بچہ کے لئے مطالعہ فطرت، نباتیات، حیاتیات وغیرہ کا علم بہت ضروری ہے۔ وہ اس بات کا بھی قایل تھا کہ وہی وحدت غیر نامی اشیاء میں بھی پائی جاتی ہے اور اسی سے اسے بچہ کی زندگی اور اس کے خیالات میں اعلیٰ وحدت کا ایک ثبوت مل گیا۔ چنانچہ اس تصور کی بنیاد پر اس نے اپنے کنڈر گارٹن 'بہلاوا' (Gifts) کے نام سے کچھ مشغلے ایجاد کئے۔ اپنے ذاتی جذبہ کی بنا پر اسے تمام غیر نامی اشیاء میں حتیٰ کہ شیشہ کے ٹکڑوں میں بھی ایک عالمگیر وحدت نظر آتی تھی۔ ایک فرد اور اس کی نسل کے درمیان جو ایک واحد نامی زندگی ہے اور مدرسہ جس کا ایک چھوٹا نمونہ ہے، ایک اعلیٰ وحدت پائی جاتی ہے۔ اس طرح مدرسہ بچہ کے لئے ایک ایسا ادارہ بن جاتا ہے جس میں وہ اپنی سماجی زندگی کے تمام مظاہر ایک سادہ ترین اور اعلیٰ نمونہ کی شکل میں پاتا ہے۔ مدرسہ کا اصل کام بہ حیثیت ایک سماجی ترقی کے ادارے کے اور ساتھ ہی ساتھ ایک انفرادی ترقی کے ادارے کے بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔

[illegible]

ان ہدایا (Gifts) اور شغلوں کے اندر ان مقررہ مشغلوں میں بھی پایا جاتا ہے جو اس نے چھوٹے بچوں کی تعلیم کے لئے تجویز کئے ہیں۔ ان دونوں چیزوں کے اندر بنیادی تصور یہی ہے کہ ہر بعد کے آنے والے عمل میں اس سے پہلے گزر جانے والا عمل شامل ہے۔ اس کی مختلف تحریروں میں اس قسم کے بیانات ملتے ہیں کہ ہر شے جو بعد میں آنے والی ہے، وہ اس سے نکلے گی جو اس سے پہلے گزر چکی ہے۔ اس قسم کے بیانات میں گویا ایک سری یا مخفی معنی ہیں جو عام پڑھنے والے کی نظر سے پوشیدہ سمجھے جاتے ہیں۔

اس نے اپنی کتاب "انسان کی تعلیم" میں عام فلسفیانہ خیالات ایک خاص مذہبی انداز میں ظاہر کئے ہیں، مثلاً خدا غیر منقطع تسلسل کے ساتھ تخلیق کرتا ہے اور پیدا کرتا ہے۔ خدا کا ہر خیال ایک کام ہے، ایک عمل ہے، ایک پیداوار ہے اور خدا کا ہر خیال اس تخلیقی قوت کے ساتھ ابدالآباد تک لامتناہی پیدائشی عمل میں جاری رہتا ہے۔ ارتقا اس وحدت یعنی روح کا میلان ہے جو مختلف شکلوں میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے۔ اس طرح تعلیم اس ارتقا کے عام عمل کا صرف ایک پہلو ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس سے فرد اس ہمہ گیر وحدت کو پالیتا ہے جس کا وہ صرف ایک جزو ہے۔ وہ عمل جس سے اس کی زندگی میں ایسی وسعت پیدا ہوتی ہے جو اسے نطرت کے ساتھ ملا دیتی ہے، یہاں تک کہ یہ سماج کے تمام مشغلوں میں ہمدردی کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے اور نسل انسانی کے تمام کارناموں اور انسانیت کی تمام آرزوؤں کی شریک بن جاتی ہے۔

فروبل نے یہ خیالات تمام تر ایک مجرد فلسفیانہ انداز میں ظاہر کئے ہیں اور انہیں کبھی منطقی ترتیب کے ساتھ پیش نہیں کئے۔ اسی کے ساتھ اس نے بچوں کے لئے کچھ مشغلے اور مشقیں بھی مرتب کی ہیں، جو "ہدایا اور شغلوں" کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کا منشا بھی یہی ہے کہ ایک اچھے، باہنر استاد کے ہاتھوں بچہ میں وہی متحدہ نشو ونما پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ ہدایا اور مشغلے نہ صرف استاد اور بچوں کے استفادہ کے لئے ہیں بلکہ جو لوگ فروبل کے فلسفہ کے سمجھنے والے ہیں، وہ ان میں کہیں گہرے معنی پائیں گے، اس لئے کہ یہ نہایت فلسفیانہ دقت نظر کے ساتھ مرتب کئے گئے ہیں، جس سے

کم سے کم بچہ کے ذہن اور روح کی نشو ونما میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اور پھر یہ بات بھی خیال میں رکھنی چاہیے کہ وحدت کی نشو ونما [illegible] ہے اور وہ ان مشغلوں کے استعمال پر موقوف نہیں ہے جو استاد تجویز کرتا ہو یا استاد کی ذات پر مبنی ہے جو زندگی اور حقیقت میں وحدت کو دیکھتا ہے اور خود بچہ کے ذہن پر کہ اس کے اندر یہ وحدت کا جذبہ اور شعور کہاں تک پایا جاتا ہے۔ فروبل کے خیال کے مطابق "ان ہدایا اور مشغلوں" کا استعمال صرف بچہ کو اپنے ماحول سے دلچسپی پیدا کرنے یا اسے اس کا علم دینے یا اس سے وابستہ کرنے کے لئے اپنے اصل مقصد کو پورا نہیں کرتا ہے بلکہ یہ "ہدایا اور مشغلے" اور حقیقت میں مدرسہ کا کوئی مشغلہ بھی ہو، جب تک وہ وحدت کے اس اصول اور نشو ونما کے اس طریقے کے مطابق استعمال نہ کئے جائیں، اس وقت تک ان کی صحیح تعلیمی قدریں حاصل نہیں ہوتی ہیں۔ یہ قدریں خود فروبل کے لفظوں میں اس وقت حاصل ہو سکتی ہیں جب "وہ حقیقت جو کل میں ہے، اس کے چھوٹے سے چھوٹے جزو میں بھی پائی جائے۔ اسی طرح جو حقیقت بہ حیثیت مجموعی انسانیت میں ہے، اس کا اظہار معمولی سے معمولی اور چھوٹے سے چھوٹے بچہ میں بھی ہونا چاہئے اور مزید یہ کہ جو حقیقت بہ حیثیت مجموعی انسانیت کے اندر ہے اور اس کا اظہار بچہ کے اندر بھی ہوتا ہے اور وہ بچہ کے اندر بہ طور روح اور جراثیم کے مخفی ہوتی ہے، وہ پھر اپنی نوعیت کے ادنیٰ سے ادنیٰ جزو کی حیثیت سے ظاہر ہوتی ہے، یقیناً وہ ایک صاف چشم باطن کو نظر بھی آسکتا ہے۔"

خود عملی تعلیم کے عمل کی حیثیت سے :

فروبل نے تعلیم کے عمل کو خود عملی کی حیثیت سے پیش کیا ہے اس کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ اس نے یہ اصول انیسویں صدی کے اوائل حصہ کے افکار و خیالات سے اخذ کیا ہے۔ اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ یہ خیالات جو فلسفہ اور سائنس میں یکساں طور پر کار فرما تھے، اس نے سب سے پہلی بار ان سے تعلیم کے مسائل کے حل کرنے میں کام لیا ہے۔ سائنس کے میدان میں یہ قدیم خیال کہ تمام جاندار مخلوق میں بندھے ٹکے نوع میں منقسم ہے، اس کی بجائے یہ خیال عام ہو چلا تھا کہ تمام مخلوقات ادنیٰ شکل سے ارتقاء پا کر اعلیٰ شکل میں آئی ہیں اور اس طرح تمام انواع میں تسلسل کا ایک رشتہ قائم ہو

یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اس صدی کے شروع میں ایک نیا علم وجود میں آیا جسے 'حیاتیات' یا 'بایولوجی' کہتے ہیں۔ اسی زمانہ میں فرانس کے ایک مشہور فلسفی لامارک نے بھی اپنے خیالات ان عوامل کے متعلق ظاہر کئے ہیں جہاں ادنیٰ شکلوں سے اعلیٰ شکلوں کی نشو و نما میں ظاہر ہوتے ہیں اور اس طرح اس نے ان اصولوں میں کم سے کم ایک اصول کی وضاحت کر دی ہے جو حیات کی تمام شکلوں کو باہم مربوط کئے ہوئے ہے۔ یہ جسم کے کسی حصہ یا عضو کے استعمال یا عدم استعمال سے متعلق ہے جو خود عملی کے اصول کی کارفرمائی پر منحصر ہے۔ اس سے پہلے ارتقاء کا مسئلہ ایسے سائنسدانوں اور فلسفیوں نے پیش کیا تھا جو خارجی موثرات پر اعتقاد رکھتے تھے۔ لامارک کے نزدیک ان تبدیلیوں کا باعث وہ جاندار مخلوق اور وہ جسم نامی خود ہوتا ہے۔ جس طرح انسان کے بازو یا جسم کے کسی اور حصہ کی ان کے مخصوص استعمال سے مخصوص نشو و نما ہوتی ہے، اسی طرح ایک جسم نامی کے اپنے کسی حصہ کی ایک مخصوص جانب استعمال سے اس قسم کی نشو و نما ظہور پذیر ہوگی۔ اسی طرح اس کے عدم استعمال سے اس میں لاغری اور دبلاپن پیدا ہوگا۔ یہ نظریہ آج مختلف شکلوں کی وضاحت میں خواہ کتنا ہی ناقص اور نباتات کی دنیا میں کتنا ہی محدود نظر آتا ہو، لیکن اس زمانہ میں مختلف شکلوں کی اصل وجہ اور ان کی نمو پذیری کے اصول کی حیثیت سے بہت بڑا انکشاف سمجھا جاتا تھا۔ فلسفیانہ افکار میں نظریہ کا یہ نقص کچھ بہت اہمیت نہیں رکھتا تھا، اس لئے کسی حصہ جسم کا ایک جانب استعمال اصولِ عمل کا ایک پہلو تھا جس سے وہ جسم نامی اس ہمہ گیر عمل میں حصہ لیتا تھا جو تمام مادی وجود کو معنی بخشتا ہے۔ اس وقت کا سب سے غالب فلسفیانہ فکریہ تھا جو خود فروئبل نے بھی قبول کر لیا تھا کہ تمام اشیاء میں ایک بنیادی وحدت ہے اور تمام تبدیلیوں اور حیات کی تمام شکلوں کا ایک ہی اصول ہے۔ تمام موجودات میں ایک واحد تعمیری قوت ہے جو خود کو فطرت یعنی خارجی زندگی میں بہ حیثیت ایک قوت کے اور اندرونی زندگی میں بہ حیثیت ایک ذہن کے جلوہ گر کرتی ہے۔ یہ طاقت ایک فرد میں ذہن کی حیثیت سے اپنے لئے اپنی دنیا آپ تعمیر کرتی ہے۔ خود ذات یعنی ذہن میں یہ عمل موجود نہیں ہوتا بلکہ یہ بذاتِ خود عمل ہوتا ہے۔ اس عمل کے ذریعہ یہ خود اپنی تکمیل کرتا ہے، اپنی دنیا آپ تعمیر کرتا ہے۔ اس میں اپنی ذات کا شعور پیدا ہو جاتا ہے اور یہ اپنی تقدیر آپ بناتا ہے۔

(باقی)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ
مترجم: عماد الحسن آزاد فاروقی

قرآن سے متعلق جرمنوں کی خدمات

[illegible] علوم کی خدمت اور ان کی آبیاری میں جرمنوں کا مقام جانا پہچانا ہے۔ اسی طرح علوم قرآن [illegible] کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے، بلکہ پچھلی صدی میں تو اس سلسلہ میں دوسرے اہل مغرب کے مقابلے میں انہیں ایک امتیاز حاصل رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جرمنی میں قرآن کی پہلی طباعت ۱۵۳۰ء میں پاگانینی کی توجہ سے بندقیہ کے شہر میں ہوئی لیکن پوپ الیکساندر ہفتم بہت ناراض ہوا اور تمام نسخے [illegible] دینے کا حکم دیا۔ بہرحال جرمنی کا چھپا ہوا سب سے قدیم نسخہ جو ہم تک پہنچا ہے وہ ابراہم ہنکلمان کا ۱۶۹۴ء کا ہے۔ یہ ہیمبرگ میں جو شمالی جرمنی کا ایک شہر ہے، چھپا تھا۔

قرآن کے حوالوں کی ضرورت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ تخریج آیات کی کتابیں قدیم زمانے سے [illegible] ملتی ہیں۔ لیکن عام طور پر ان مؤلفین نے پاروں اور رکوعات کی طرف اشارہ کر دیا ہے جس سے تلاش کرنے والے کو تقریباً آدھا صفحہ یا کبھی کبھی اس سے بھی زیادہ پڑھنا پڑتا ہے۔ اس میں قطعیت حاصل کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اگر حوالے میں آیت دی جائے تو بہت زیادہ آسانی ہوجاتی ہے۔ کیونکہ آیتیں عام طور سے ایک سطر یا دو سطر سے زیادہ نہیں ہوتیں۔

گستاف فلوگل نے سب سے پہلے تمام آیات کی ابجد کے اعتبار سے فہرست بنائی اور اس کے اشارے میں سورتوں اور آیتوں پر نمبر ڈال کر دئے بلکہ ۱۸۳۴ء میں لایپزگ میں اس نے ایک قرآن بھی طبع کرایا جس میں ہر آیت پر نمبر دئے گئے تھے۔ اہل مغرب جب کوئی دلیل قرآن سے دیتے ہیں تو عام طور سے سورتوں اور آیتوں کا ذکر فلوگل صاحب ہی کے نمبروں کے حساب سے دیتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ

اپنی اپنی زبانوں کے تراجم میں بھی انھوں نے انھیں نمبروں کو استعمال کیا ہے۔ مگر تاہم افسوس امر یہ [illegible]ں صاحب کو مسلمانوں کی آیات شماری کے طریقے کا علم نہیں تھا۔ اس لئے انھوں نے کہیں تو صحیح کیا اور کہیں غلطی بھی کی۔ بعد میں مسلمانوں نے مصر اور مختلف جگہوں پر ایسے قرآن چھاپے جس میں فلوگل صاحب کے نمبروں سے مختلف نمبر ڈالے اور کہیں کہیں تو ان کا فرق چھ چھ آیتوں تک کا ہو جاتا ہے اسی لئے اہل علم اب دونوں نمبروں کا ساتھ ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ بہرحال کچھ بھی ہو پہل کرنے والے کو امتیاز حاصل ہوتا ہے اور یہ فضیلت اس جرمن یعنی فلوگل صاحب ہی کی ہے۔

علوم قرآن مثلاً اس کی تدوین کی تاریخ یا اس کی قراءتوں کے اختلاف پر مسلمانوں نے تو شروع زمانے ہی سے توجہ دی۔ ہاں یورپ میں جرمنوں نے سب سے پہلے اس کا خیال کیا۔ میری مراد تھیوڈور نولڈکے کی 'تاریخ القرآن' سے ہے، جو لایپزگ میں ۱۸۶۰ء میں چھپی۔ اس کے ایک عیسائی شاگرد شوالی نے اس کے دوسرے ایڈیشن کی طرف توجہ دی اور پہلی جلد ۱۹۰۹ء میں اور دوسری ۱۹۱۹ء میں چھاپی۔ پھر دو جرمنوں برگشترلیسر اور برتیسل نے اس میں مزید اضافے کر کے ۱۹۳۸ء میں تیسرا ایڈیشن چھاپا۔ یہ سب کے سب ایڈیشن لایپزگ میں ہی چھپے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب اپنے موضوع سے متعلق معلومات کا خزانہ ہے اور ہر تحقیق کرنے والے کو اس کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے گو ضروری نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ اس سے اتفاق ہی کرے۔

جنوبی جرمنی میں میونخ یونیورسٹی میں خاص قرآنی تحقیقات کا ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران کچھ امریکن بم اس پر گرے اور جو کچھ کام وہاں ہوا تھا وہ اور تمام عملہ سب تباہ ہو گئے۔ پھر بھی وہ قابل ذکر ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ کسی اسلامی ملک کو توفیق دے کہ وہ اس جیسا کوئی ادارہ قائم کر سکے۔ برگشترلیسر اور ان کے بعد برتیسل نے اس ادارہ کی تنظیم میں اپنی عمریں صرف کر دیں۔ حکومت اور یونیورسٹی دونوں نے اس کی نشو و نما اور ترقی پر بہت روپیہ خرچ کیا، یہاں تک کہ وہ ادارہ دنیا بھر میں قرآن کا سب سے بڑا میوزیم بن گیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے

[illegible] ذیل کام کئے:

۱۔ تفسیر، قرأت اور دوسرے علوم قرآن پر جتنی اہم کتابیں، خاص طور پر عربی میں، چھپی [illegible] سب انھوں نے جمع کیں۔

۲۔ مندرجہ بالا موضوعات پر جو کتابیں اب تک نہیں چھپی ہیں ساری دنیا سے ان کے عکس [illegible]

۳۔ ہر زمانے کے قرآن کے نسخوں کے عکس جمع کئے۔ اس کے لئے انھوں نے دنیا کے کونے کونے، اسلامی اور غیر اسلامی شہروں کا سفر کیا اور جو کچھ بھی نسخے انھیں مل سکے یہاں تک کہ ایک یا دو صفحے بھی اگر ملے تو اسے جمع کیا۔ اس طرح ان کے پاس پہلی صدی ہجری سے لے کر موجودہ زمانے تک کے مختلف نسخے جمع ہو گئے، ان کی پہلی غرض تو یہی تھی کہ وہ ان نسخوں کا باہم مقابلہ کریں اور اگر کچھ غلطیاں ہوں تو ان کو جمع کریں۔ (مگر سوائے کتابت کی غلطی کے اور کوئی غلطی انھیں نہیں ملی) لیکن ان نسخوں کے حاصل کر لینے سے ان کے پاس وہ سب کچھ جمع ہو گیا جس کے ذریعہ ایک مورخ عربی رسم الخط، تزئین وتجلید قرآن وغیرہ علوم کی تاریخ لکھ سکتا ہے۔

۴۔ انھوں نے قرآن کی ایک طویل ترین تفسیر شروع کی، اس طرح کہ ہر آیت کا الگ باب بنایا۔ اس میں انھوں نے صحابہ کے زمانے سے لے کر موجودہ زمانے تک کے ہر مفسر کی اس آیت سے متعلق تفسیر درج کی اس کی ترتیب انھوں نے مفسر کے زمانے کے لحاظ سے رکھی۔ اس [illegible] لئے ممکن ہو گیا تھا کہ ہم ہر آیت اور ہر کلمہ کی تفسیر کی نشوونما سے واقف ہو سکیں۔ ابھی یہ کام جاری ہی تھا کہ جو کچھ انھوں نے مکمل کیا تھا سب ضائع ہو گیا۔ اب ممکن ہے کہ کوئی اس کام کو دوبارہ شروع کرے اور اگر وہ چاہے تو اسے بغیر عربی تفسیر کا بھروسہ کئے ہوئے بھی کر سکتا ہے کیونکہ علماء اسلام نے قرآن کی تفسیریں اپنے اپنے یہاں کی زبانوں مثلاً فارسی، ترکی، [illegible] وغیرہ میں کی ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عجمی حضرات اس شعبۂ علم میں عربوں سے کچھ پیچھے رہ گئے ہیں۔

[illegible] علم کی خوش قسمتی سے وہ مخطوطات اب بھی محفوظ ہیں اگرچہ میونخ یونیورسٹی میں ان کے عکس ضائع ہو گئے تھے اور ممکن ہے کوئی صاحب ظرف جس کے پاس مال اور شوق اکٹھا ہو گئے ہوں اس کام کو ویسا ہی بلکہ کچھ اضافے کے ساتھ کر ڈالے۔

تاریخ قرآن:

ساری دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب یقیناً قرآن ہی ہے۔ سبھی مسلمان چاہے وہ عربی جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، اس کی تلاوت کا ثواب حاصل کرنے کے لئے اسے پڑھتے ہیں۔

کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اپنے معاملات میں اپنی دینی کتاب سے مدد لی ہو تاکہ اس کی پوری پوری حفاظت کر سکیں اور یہی سبب ہے کہ ایک مدت گذر جانے کے بعد بھی اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی۔

یہ بات تحقیق شدہ ہے کہ مسلمان قرآن کو انسان کا کلام نہیں سمجھتے بلکہ اس کو خدا کا کلام جانتے ہیں جو کہ اُن کے پیغمبر محمدؐ پر وحی کے ذریعہ نازل ہوا اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ پورا قرآن ایک دم نہیں نازل ہوا بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے ۲۳ سال کے عرصہ میں اُترا۔ اُس وقت عرب میں کسی قسم کا نشر و اشاعت کا سامان نہیں تھا، یہاں تک کہ لکھنا پڑھنا بھی عجوبہ چیزیں تھیں، مؤرخوں کا بیان ہے کہ مکہ میں جو نبیؐ کا مولد ہے صرف ۱۷ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے جبکہ اس وقت مکہ کی آبادی تقریباً دس ہزار تھی، مزید یہ کہ حضورؐ خود بھی اُمّی تھے اور لکھنے پڑھنے سے واقف نہیں تھے جیسا کہ خود قرآن اس کی صراحت کرتا ہے۔ غرض کہ جو بات ایک محقق کو حیرت میں ڈال دیتی ہے وہ یہ ہے کہ آن نبیؐ اُمیؐ نے شروع ہی سے جو وحی ان کے پاس آتی تھی اُس کی حفاظت کی طرف توجہ دی۔ لیس جو لوگ مسلمان ہو گئے تھے ان میں جو لکھنا جانتا تھا اُسے بلوا کر جو کچھ ان پر نازل ہوتا تھا لکھوا دیتے تھے۔ دوسرے لوگ ان کی نقلیں کر کے اُمت کے درمیان پھیلا دیتے تھے۔ پھر دوسری وحی آتی تھی تو حضورؐ لکھوانے کے ساتھ ساتھ پچھلے نسخوں کے درمیان اس کا محل و توع بھی بتا دیتے تھے (اس طرح قرآن برخلاف ترتیب نزول کے، جس حساب سے سورتیں درج کی گئیں، اس اعتبار سے مدوّن کیا گیا ہے) یہ سلسلہ

حضورؐ کی وفات تک چلتا رہا ۔۔۔ [illegible] تو ایک پہلو تھا

دوسرا رخ یہ ہے کہ حضورؐ نے اپنی امت کو حکم دیا کہ قرآن حفظ کرتے رہیں نیز نماز بھی بغیر اس کے کہ تھوڑا سا قرآن پڑھا جائے درست نہیں ہو سکتی۔ باوجود اس کے کہ قرآن کا حجم توریت کا [illegible] ہے قرآن حفظ کیا جاتا رہا ہے اور حفظ کے ذریعہ لکھے ہوئے قرآن کی [illegible] کے ذریعہ حفظ کی تصحیح ہوتی رہی ہے۔

[illegible] یہ ہے کہ حضورؐ نے لوگوں کو صرف اپنے اپنے لکھے ہوئے قرآن پر ہی تکیہ کر لینے کو نہیں کہا بلکہ ضروری قرار دیا کہ وہ اسے شروع سے آخر تک حضورؐ کے پاس پڑھیں یا کسی ایسے شخص کے پاس پڑھیں جس نے حضورؐ سے پڑھا ہو، اسی طرح ہر زمانے میں ہوتا رہا اور آج تک مسلمانوں کے بچے قرآن کو کسی مستند استاد کے پاس پڑھتے ہیں اور وہ ان کے فارغ ہونے کے بعد سند دیتا ہے اور اس میں ذکر کرتا ہے کہ جو قرآن اس بچے نے پڑھا ہے وہ ویسا ہی ہے جیسا کہ اُن استاد نے اپنے استاد اور پھر ان کے استاد نے اپنے استاد سے پڑھا تھا اس طرح تمام استادوں کا ذکر کرتا ہے یہاں تک کہ نبیؐ تک یہ سلسلہ پہنچ جاتا ہے۔

غرض حضورؐ کے زمانے سے ہمارے زمانے تک قرآن کی حفاظت کے تین طریقے چلتے رہے۔
اس وقت سارے عالم میں سینکڑوں ہزاروں حافظ ہیں جن کو پورا قرآن یاد ہے۔ ترکی میں اندازہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً ۲۵ ہزار حفاظ ہیں۔ ان کی تعداد عربی ممالک میں یقیناً اور زیادہ ہوگی۔
حضورؐ کی زندگی میں تو قرآن تھوڑا تھوڑا اترتا ہی رہا لیکن حضورؐ کی وفات کے قریب اس کو کتاب کی صورت میں مدون کیا گیا اس لئے حضورؐ کے زمانے کا کوئی مکمل نسخہ نہیں ملتا۔

مسلمانوں میں اس وقت تاریخ لکھنے کا رواج نہیں تھا اس لئے اوّلین نسخوں کے بارے میں تحقیق سے کچھ نہیں معلوم ہو سکتا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ استنبول کی توپ قاپی سرائے میں جو چند چھوٹی چھوٹی سورتوں پر مشتمل موجود ہے وہ حضورؐ کے زمانے کا ہے کیونکہ اس کے آخر میں [illegible] کہ عثمانؓ ابن عفان کاتب وحی نے لکھا ہے۔ خود کتب خانہ میں قرآن کے بعض

اوراق پائے جاتے ہیں جو حضرت عثمانؓ کی طرف منسوب ہیں۔ جس کے حروف کثرت استعمال سے مٹ گئے تھے تو ان کو دوبارہ لکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کچھ اوراق یا کچھ چھوٹے چھوٹے اجزاء ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب ہیں۔ اس کے علاوہ خدیج بن معونتہ بن سالمۃ الانصاری کا سنہ ۴۲ھ کا اور عقبہ بن عامر کا سنہ ۵۲ھ کا نسخہ بھی ملتا ہے۔ استنبول کے اسلامی میوزیم میں حضرت حسنؓ کے ہاتھ کا بھی ایک ورق ملتا ہے۔ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ایک ورق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خط میں ہے جس پر مغل بادشاہوں کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔ اسی طرح تاشقند میں بھی ایک نسخہ ہے جو حضرت عثمانؓ کی طرف منسوب ہے روسی حکومت نے کمیونسٹ انقلاب سے پہلے اس کا عکس لے کر چھپوایا تھا۔

فنون لطیفہ اور قرآن:

قرآن بہت سے فنون لطیفہ کے آغاز کا باعث ہوا ہے۔ مثلاً تجوید سے تلاوت قرآن جو کہ اسلام کی دینی موسیقی ہے۔ گو وہ ایسی چیز ہے کہ صرف سنی ہی جا سکتی ہے۔ قرآن ہی کی کتابت نے عربی رسم الخط کو واضح شکل دی، اس کے علاوہ قرآن کو مختلف رنگوں میں لکھنا اُس کی آرائش کرنا اور مختلف اقسام کی جلدوں کا بنانا وغیرہ اسلامی فنون لطیفہ بھی اسی سے شروع ہوئے۔ ہم اس بحث کو یہ کہہ کر ختم کر رہے ہیں کہ جرمنوں کا ان سب علوم میں بھی بہت حصہ ہے۔

تراجم قرآن:

مختلف اقوام کے درمیان زبانوں کا بہت اختلاف ہے، ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکتا اور قرآن تو تمام عالم کے لئے اترا تھا۔ اس لئے قرآن کا ترجمہ فہم و عمل کے لئے ضروری ہو گیا (یہاں نماز میں ترجمہ کی تلاوت کا سوال نہیں ہے) اور سب سے پہلا ترجمہ ایک صحابی ہی کی طرف منسوب ہے۔ جیسا کہ فقیہ الکبیر شمس الائمہ سرخسیؒ نے (مبسوط جلد اول صفحہ ۳۷) لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے اس روایت سے استدلال کیا ہے کہ ایرانیوں نے حضرت سلمانؓ کے پاس لکھا کہ وہ سورۂ فاتحہ کا ترجمہ فارسی میں لکھ دیں، چنانچہ ایران اس فارسی ترجمہ کو نماز میں پڑھا کرتے تھے اور یہ سلسلہ اُس

[illegible] کی زبانیں نرم پڑگئیں ــــ فرید وجدی مرحوم نے تحقیق کی ہے
[illegible] مل جواز ترجمۃ القرآن الی اللغات الاجنبیہ صفحہ ۵۸) کہ سلمان فارسیؓ نے یہ کام نبیؐ کی اجازت
[illegible] سے البدایہ والنہایہ کا حوالہ دیتے ہیں۔ میرے علم میں نہیں کہ یہ کس کی
[illegible] والنہایہ ابن کثیر کی ہے جس میں اس کا ذکر نہیں ہے)

[illegible] شہریار نے عجائب الہند صفحہ ۲-۳ میں ذکر کیا ہے کہ علماء ہند نے دین کی تبلیغ کے لئے ۲۷۰ھ سے بھی پہلے قرآن کا ترجمہ کر لیا تھا اور شاید یہ ترجمہ سندھی یا ملتانی زبان میں تھا۔

جاحظ نے البیان والتبیین میں (جلد اول صفحہ ۱۳۹) لکھا ہے کہ موسیٰ بن سیار الاسواری متوفی ۲۵۵ھ قرآن کی تفسیر فارسی میں پڑھایا کرتے تھے۔ ہم تک علماء ماوراء النہر کا ۳۴۵ھ کا ترجمہ پہنچا ہے کہ [illegible] نے ملک منصور بن نوح سامانی کے لئے کیا ہے اور ترجمہ میں طبری متوفی ۳۱۰ھ کی تفسیر کا خلاصہ بھی شامل کر دیا ہے۔ اس شکل میں قرآن کا ترجمہ وتفسیر تین زبانوں یعنی فارسی، مشرقی ترکی اور مغربی ترکی میں [illegible] ہے۔ یہ سب نسخے بحمد اللہ ہم تک مخطوطات کی شکل میں پہنچ گئے ہیں اور سب کے سب مسلمانوں کے ترجمہ شدہ ہیں۔

غیر مسلموں میں سُریانی سب سے پہلے ہیں جنھوں نے قرآن کا ترجمہ کیا۔ کیونکہ ایک کتاب ایسی ملتی ہے جس میں کہ قرآن کی آیات کا سریانی میں ترجمہ ہے۔ یہ مخطوطہ چمڑے کے اوپر ہے اور مانچسٹر کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ منگانہ صاحب نے تحقیق کی ہے کہ یہ مخطوطہ بارصلیبی کا ہے جو کہ حجاج بن یوسف کا ہمعصر تھا یعنی یہ پہلی صدی ہجری کے آخر کا ہے۔ اس کے بعد اہل یورپ نے اندلس میں اس پر توجہ دی اور ۱۱۴۱-۱۱۴۳ء میں روبرتوس کیتینسیس انگریز نے قرآن کو لاطینی میں ترجمہ کیا۔ اس کے بعد تو مسلم اور غیر مسلم علماء اس کو تمام زبانوں میں ترجمہ کرتے رہے۔

[illegible] ۱۳۶۴ھ میں ایک کتاب "القرآن فی کل لسان" چھاپی ہے جو کہ دو امور پر حاوی ہے یعنی میری معلومات کی حد تک تمام زبانوں میں مکمل یا غیر مکمل تراجم کی فہرست اور نمونے کے لئے ہر زبان میں سورۂ فاتحہ کا ترجمہ، پھر میں نے ۱۳۶۵ھ اور ۱۳۶۶ھ میں اس کے مزید دو ایڈیشن

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

٩۔ یوکرینی

[illegible] یوگوسلاوی — خط عربی میں [illegible]

(") خط روسی میں [illegible]

([illegible]) خط لاطینی میں [illegible]

[illegible] بولونیہ (خط عربی میں) [illegible]

(خط لاطینی میں) [illegible]

١٤۔ بوہیمین [illegible]

[illegible] (خط لاطینی میں) ٢٣

(خط اویغوری قدیم میں) ٣

(خط عربی میں، ڈاکٹر ماجد لیشار اوغلو کی فہرست کے مطابق) تقریباً ٦٠

١٦۔ ڈنمارک کی زبان میں	٣	١٧۔ روسی	١١
[illegible]۔ رومانوی	١	١٩۔ اطالوی	[illegible]
[illegible]	٣٣	٢١۔ فن لینڈ کی زبان میں	١
[illegible]	٣٢	٢٣۔ ہنگیرین	٦
[illegible]	١	٢٥۔ ولندیزی	٧
[illegible] ہسپانوی (خط لاطینی میں)	١٨	٢٧۔ یونانی	٣

مالک رام

مولانا ابو الکلام آزاد کی ادبی خدمات

آج ۲۲ فروری ہے۔ دس سال ہوئے، آج ہی کے دن ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا ابو الکلام آزاد کی وفات ہوئی تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مولانا ابو الکلام آزاد کے سے آدمی مر بھی سکتے ہیں ؟!

انسان فانی ہے، اس کلیے سے انکار ممکن نہیں، لیکن اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ یہ مادی جسم اس شکل میں قائم رہنے والا نہیں ہے، یہ ایک نہ ایک دن فنا ہو جائے گا، اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض انسان مر جانے کے بعد بھی نہیں مرتے۔ ملک کی تاریخ کے صفحات پر ان کے کارناموں کے نقش اتنے نمایاں اور پختہ و پائدار ہوتے ہیں کہ وہ زندۂ جاوید ہو جاتے ہیں ؛ حالات کی تبدیلی، انداز و معیار کا تفاوت ان کی شہرت میں کوئی کمی نہیں کر سکتا۔

مولانا ابو الکلام آزاد بھی جن کی ہم آج دسویں برسی منا رہے ہیں، ایسے ہی شخص تھے کہ جسمانی موت کے باوجود وہ آج تک زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

ان کی شخصیت اتنی پہلو دار ہے کہ اس سے متعلق اس مختصر صحبت میں کوئی تفصیلی گفتگو کرنا ممکن نہیں ہے۔ وہ عالم تھے، مفسر قرآن تھے، ادیب تھے، خطیب تھے، صحافی تھے، سیاسی رہنما تھے، جنگ آزادی کے سپاہی بھی تھے اور سپہ سالار بھی ـــــ اور ان سب کے علاوہ وہ بلند مرتبہ انسان تھے، ان کی ہر ایک حیثیت پر مفصل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

وہ ایک پرانے علمی اور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر ۱۰ سال سے زیادہ نہیں

جب انھوں نے ۱۹۰۳ء میں اپنی تعلیم مکمل کرلی اور یہ تعلیم ... فارسی اور عربی کا وہی درس نظامی جو تقریباً ایک صدی سے ... انھیں بھی پڑھنا پڑا۔

لیکن ابھی وہ تعلیم کی منزل طے بھی نہیں کر پائے تھے کہ دس گیارہ سال کی عمر میں انھیں شعرگوئی ... انھوں نے بعض مشہور اساتذۂ وقت : داغ دہلوی اور امیر مینائی اور ... سے مشورہ کیا۔ یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی ؛ بعض اور شاعر بھی اتنی کمسنی ہی میں شعر کہنے لگے تھے۔ مولانا آزاد کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے دل میں اس عمر میں خیال پیدا ہوا کہ شعرگوئی کی تکمیل کے لیے ایک گلدستہ بھی شائع کرنا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے ... جب ان کی عمر محض گیارہ سال کی تھی، نیرنگ عالم کے نام سے ایک ماہانہ گلدستہ جاری کیا جس میں مشاہیر شعراء کا کلام چھپتا رہا۔ یہ پرچہ ایک سال کے اندر اندر بند ہوگیا۔ اس کے بعد انھوں نے المصباح شروع کیا، یہ بھی زیادہ دن تک جاری نہ رہ سکا۔ اس دوران میں ان کا بعض اور پرچوں سے بھی تعلق رہا۔ بالآخر ان کا مشہور رسالہ لسان الصدق منظر عام پر آیا۔ اس کا پہلا شمارہ ... نومبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا تھا۔ جب وہ تازہ تازہ تعلیم سے فارغ ہوئے تھے۔ دراصل یہی پرچہ ان کی عام شہرت کا سنگ بنیاد ثابت ہوا اور اسی سے وہ ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں عام طور پر متعارف ہوئے۔ یہ بھی کم و بیش ڈیڑھ سال کے بعد بند ہوگیا۔ اس کے بعد وہ امرتسر کے مشہور اخبار وکیل میں بحیثیت مدیر کام کرتے رہے۔ اس میں کسی طرح کا شبہہ نہیں کہ وہ بنیادی طور پر صحافی تھے ؛ لیکن ان کا نقطۂ نظر اور معیار اتنا بلند تھا کہ ان کی غیر مطمئن سیمابی طبیعت اپنی منزل کی تلاش میں کہاں کہاں نہیں پھری۔ وہ جہاں بھی گئے، خوب سے خوب تر کے جویا رہے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ جس منزل مقصود کی تلاش میں وہ اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہیں، یہ کہیں ... بالآخر یہ انھیں ملی بھی تو کہاں ؟ خود اپنے جاری کردہ الہلال میں

زباں پہ بارِ خدایا ! یہ کس کا نام آیا

یہ ہفتہ وار صحیح معنوں میں [illegible] میل ثابت ہوا۔ اس کا پہلا شمارہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء میں [illegible] تھا، جب ان [illegible] سال سے کچھ ہی اوپر تھی۔ تین سال کے بعد یہ بھی حوادثِ زمانہ کا مقابلہ کرتے ہوئے بند ہوگیا، لیکن سچ پوچھئے تو یہ آج بھی زندہ ہے، کیونکہ آج تک ہر ہفتہ وار کا مطمح نظر یہ رہا ہے کہ وہ الہلال کے معیار کو پہنچ جائے؛ یہ اور بات ہے کہ یاروں کے بہت زور مارنے پر بھی کسی کو اس کا انداز نصیب نہ ہوسکا۔

جیسا کہ عرض کرچکا ہوں، وہ ایک مذہبی خاندان میں پیدا ہوئے تھے، ان کی تعلیم بھی یکسر دینی علوم سے متعلق تھی، لیکن وہ اسی پر مطمئن نہیں ہوگئے، انھوں نے وسیع اور گوناں گوں ذاتی مطالعے سے اس پر اضافہ کیا۔ پھر انھوں نے دوسروں کی تقلید ہی پر قناعت نہیں کر لی، بلکہ اپنے غور و فکر سے اپنی راہ آپ نکالی۔ حافظہ اتنا قوی تھا کہ جو پڑھا اس کا بیشتر حصہ دماغ میں محفوظ رہا۔ شروع سے قرآن ان کے مطالعے اور غور و خوض کا منبع و مرکز رہا تھا۔ الہلال میں انھوں نے قرآن کو ایسے انوکھے اور دل نشیں انداز میں پیش کیا کہ اسے بالائے طاق پر سے اٹھا کر روزمرہ کے استعمال کی چیز بنا دیا۔

اپنے طویل تفکر و تدبّر کے نتائج انھوں نے اپنی مشہور تصنیف ترجمان القرآن میں محفوظ کیے ہیں۔ افسوس کہ یہ تفسیر مکمل نہ ہوسکی۔ وہ نصف سے کچھ زیادہ شائع کرسکے تھے کہ سیاسی سرگرمیوں نے ان کے اوقات اور صلاحیتوں پر غاصبانہ بلکہ مخالفانہ قبضہ جما لیا اور وہ باقی حصے کی تفسیر قلم بند نہ کرسکے، ہمیں اعتراف ہے کہ یہ علمی اور مذہبی دنیا کا عظیم نقصان ہے لیکن اگر ہم مسئلے کو اس پہلو سے دیکھیں کہ بیشتر بنیادی مسائل قرآن کے نصف اول میں آگئے ہیں اور ان سے متعلق انھوں نے اپنے افکار شائع شدہ دو جلدوں میں درج کر دئے ہیں تو اس نقصان کا غم کچھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک اور بات ہے۔ یہ ہے اُن کا اندازِ فکر اور اسلوب بیان۔ اگر ہم واقعی پوری توجہ اور انشراحِ صدر سے ان دونوں جلدوں کا مطالعہ کریں تو ناممکن ہے کہ ہم ان کے سوچنے کے طریقے سے متاثر نہ ہوں اور ہمیں معلوم نہ ہو جائے کہ وہ قرآن کو کس ڈھنگ سے مطالعہ کرنے کے

خواہش مند تھے۔ یوں ان کے دکھائے ہوئے رستے پر چل کر آپ خود بقیہ پاروں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ گویا ترجمان القرآن محض ترجمہ و تفسیر ہی نہیں، بلکہ ایک نئی تفسیر کی رہنما بھی ہے۔ میرے نزدیک ترجمان القرآن کی ... خصوصیت یہ ہے کہ اس نے یونانیات اور اسرائیلیات سے قطع نظر کر کے علوم و دعوتِ قرآن ... پیش کیا جو شارع عام کا مقصود اور صدرِ اول کا اعتقاد تھا

... مضامین قلم بند کیے تھے، لیکن اس کے بعد حالات کے ... دور لے گئے۔ شعر و شاعری پہلے ترک ہو گئی تھی، اب ادب بھی مجبوراً چھوٹ گیا ... کے دوران میں انہوں نے بعض ادبی مضامین خطوط کی شکل میں حوالہ ... کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ... ان کے عہدِ شباب کی یادگار ... بڑھاپے کی۔ لیکن کوئی شخص اسے پڑھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی تھکے ہوئے دماغ یا قلم کی ... جہاں بھی ان کے ذہن کی گرم جولانی، اور قلم کی گل افشانی میں وہی وسعت اور دلکشی ہے جو روزِ اول سے ان سے منسوب رہی تھی۔ اسے دیکھ کر پھر ایک مرتبہ افسوس کرنا پڑتا ہے کہ علم و ادب نے ان کی ذات میں سیاست کی بارگاہ پر کتنی قربانی دی۔ اگر وہ اور تمام مشغولیتوں سے قطع نظر کر کے اپنے آپ کو علم و ادب ہی کے لیے وقف رکھتے تو نہ معلوم آج اردو کے خزانے میں کیسے کیسے قیمتی جواہر کا اضافہ ہو گیا ہوتا۔

میں پھر وہی بات دہراؤں گا، جو میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جس شخص نے ہماری تہذیب و ثقافت کو اتنا کچھ دیا ہے، کیا وہ کبھی مر سکتا ہے؟ اور اگر اس کے باوجود وہ مر جائے یعنی بھلا دیا جائے، تو ہم سے زیادہ ... بد قسمت اور کون ہوگا!

(بہ شکریہ اردو پروگرام، آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی)

یہ ہفتہ وار صحیح معنوں میں ہماری سیاسی اور صحافتی اور ادبی تاریخ میں سنگِ میل ثابت ہوا۔ اس کا پہلا [illegible] جولائی ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا تھا، جب ان کی عمر ۲۴ سال سے کچھ ہی اوپر تھی۔ تین سال [illegible] انہ کا مقابلہ کرتے ہوئے بند ہو گیا، لیکن سچ پوچھئے تو یہ آج بھی زندہ ہے، کیونکہ آج تک ہر ہفتہ وار کا مطمع نظر یہ رہا ہے کہ وہ الہلال کے معیار کو پہنچ جائے؛ یہ اور بات ہے کہ یاروں کے بہت زور مارنے پر بھی کسی کو اس کا انداز نصیب نہ ہو سکا۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، وہ ایک مذہبی خاندان میں پیدا ہوئے تھے، ان کی تعلیم بھی یکسر دینی علوم سے متعلق تھی، لیکن وہ اسی پر مطمئن نہیں ہو گئے، انھوں نے وسیع اور گوناں گوں ذاتی مطالعے سے اس پر اضافہ کیا۔ پھر انھوں نے دوسروں کی تقلید ہی پر قناعت نہیں کر لی، بلکہ اپنے غور و فکر سے اپنی راہ آپ نکالی۔ حافظہ اتنا قوی تھا کہ جو پڑھا اس کا بیشتر حصہ دماغ میں محفوظ رہا۔ شروع ہی سے قرآن ان کے مطالعے اور غور و خوض کا منبع و مرکز رہا تھا۔ الہلال میں انھوں نے قرآن کو ایسے انوکھے اور دل نشیں انداز میں پیش کیا کہ اسے بالائے طاق پر سے اٹھا کر روزمرہ کے استعمال کی چیز بنا دیا۔

اپنے طویل تفکر و تدبّر کے نتائج انھوں نے اپنی مشہور تصنیف ترجمان القرآن میں محفوظ کیے ہیں۔ افسوس کہ یہ تفسیر مکمل نہ ہو سکی۔ وہ نصف سے کچھ زیادہ شائع کر سکے تھے کہ سیاسی سرگرمیوں نے ان کے اوقات اور صلاحیتوں پر غاصبانہ بلکہ مخالفانہ قبضہ جما لیا اور وہ باقی حصے کی تفسیر قلم بند نہ کر سکے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ یہ علمی اور مذہبی دنیا کا عظیم نقصان ہے لیکن اگر ہم مسئلے کو اس پہلو سے دیکھیں کہ بیشتر بنیادی مسائل قرآن کے نصف اول میں آ گئے ہیں اور ان سے متعلق انھوں نے اپنے افکار شائع شدہ دو جلدوں میں درج کر دئے ہیں تو اس نقصان کا غم کچھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک اور بات ہے۔ یہ ہے اُن کا اندازِ فکر اور اسلوبِ بیان۔ اگر ہم واقعی پوری توجہ اور انشراحِ صدر سے ان دونوں جلدوں کا مطالعہ کریں تو ناممکن ہے کہ ہم ان کے سوچنے کے طریقے سے متاثر نہ ہوں اور ہمیں معلوم نہ ہو جائے کہ وہ قرآن کو کس ڈھنگ سے مطالعہ کرنے کے

خواہش مند تھے۔ یوں ان کے دکھائے ہوئے رستے پر چل کر آپ خود بقیہ پاروں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

[illegible] ترجمان القرآن محض [illegible] ہی نہیں، بلکہ ایک نئی تفسیر کی رہنما بھی ہے۔ میرے نزدیک ترجمان القرآن کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے یونانیات اور اسرائیلیات سے قطع نظر کر کے علوم و دعوت قرآن [illegible] میں پیش کیا جو شارع عام کا مقصود اور صدر اول کا اعتقاد تھا

الہلال میں [illegible] نے کئی خالص ادبی مضامین قلم بند کیے تھے، لیکن اس کے بعد حالات کے تقاضے انہیں [illegible] سے دور لے گئے۔ شعر و شاعری پہلے ترک ہو گئی تھی، اب ادب بھی مجبوراً چھوڑ گیا۔ حسن اتفاق سے آخری قید کے دوران میں انھوں نے بعض ادبی مضامین خطوط کی شکل میں حوالۂ [illegible] غبار خاطر کے عنوان سے شائع ہوئے۔ الہلال ان کے عہد شباب کی یادگار ہے، غبار خاطر [illegible] بلکہ بڑھاپے کی۔ لیکن کوئی شخص اسے پڑھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کس تھکے [illegible] دماغ یا قلم کی تخلیق ہے، یہاں بھی ان کے ذہن کی گرم جولانی، اور قلم کی گل افشانی میں وہی وسعت اور دلکشی ہے، جو روز اول سے ان سے منسوب رہی تھی۔ اسے دیکھ کر پھر ایک مرتبہ افسوس کرنا پڑتا ہے کہ علم و ادب نے ان کی ذات میں سیاست کی بارگاہ پر کتنی قربانی دی۔ اگر وہ اور تمام مشغولیتوں سے قطع نظر کر کے اپنے آپ کو علم و ادب ہی کے لیے وقف رکھتے تو نہ معلوم آج اردو کے خزانے میں کیسے کیسے قیمتی جواہر کا اضافہ ہو گیا ہوتا۔

[illegible] پھر وہی بات دہراؤں گا، جو میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جس شخص نے ہماری تہذیب و ثقافت کو [illegible] دیا ہے، کیا وہ کبھی مر سکتا ہے؟ اور اگر اس کے باوجود وہ مر جائے یعنی بھلا دیا جائے، تو ہم [illegible] نا اہل اور بد قسمت اور کون ہوگا!

(بہ شکریہ اردو پروگرام، آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی)

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] یہ نظم ایک مقامی روزنامے میں شائع ہو چکی ہے اس لیے یہاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں، البتہ میری خواہش پر سلام صاحب نے اس نظم میں حسب ذیل شعروں کا اضافہ کیا [illegible] میں ہوئے ہیں [illegible] ان کو درج کرتا ہوں۔ نظم کا عنوان ہے "ابوالکلام آزاد کی یاد میں"۔ غیر مطبوعہ شعر یہ ہیں:

[illegible] موجودگی "صدرِ وطن"
[illegible] کے چہرے پہ ان کا ہی عکس جلوہ فگن
جو صدرِ ہند ہیں پر گرمیِ صرف "ذاکر" ہیں
جو اہلِ فن کے مربی ہیں، نور شاعر ہیں
ابوالکلام کہ تھے بلبلِ بہارِ چمن
ان ہی کی یاد میں آئے ہیں "جانِ بزمِ وطن"
وہ "جانِ بزمِ وطن" اندرا کہیں جن کو
نئی حیات کی دلکش فضا کہیں جن کو

[illegible] کے بعد جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر تشریف لائے اور حسب ذیل قطعات کے ذریعہ مولانا آزاد مرحوم کو اپنا خراجِ عقیدت پیش کیا:

ملک و ملت کو ناز ہے تجھ پر — تا قیامت رہے گی تیری یاد
قید خانے میں خود رہا برسوں — ملک کو قید سے کیا آزاد

ملک اور قوم کے عقیدت مند — یاد کرتے رہیں گے کام ترا
[illegible] ابوالکلام آزاد! — تا قیامت رہے گا نام ترا

[illegible] قدر عزم تھا جواں اپنا — کتنا روشن تھا اپنا مستقبل
جب کہ آزاد اور نہرو تھے — مادرِ ہند کا دماغ اور دل

ہر طرف بغض ہے کدورت ہے پھر سے آمادۂ فساد ہیں لوگ
آج پھر ملک کو ضرورت ہے آگہی و خلوص و دانش کی

اس موقع پر تقریباً تمام مرکزی وزیر موجود تھے، وزیر داخلہ شری چوہان، وزیر تعلیم شری تری گون سین، وزیر غذا شری جگجیون رام، وزیر اطلاعات و نشریات شری کے کے شاہ، وزیر صنعت شری فخر الدین علی احمد، نائب وزیر شری بھگوت سنگھ آزاد، نائب وزیر شری یونس سلیم۔ صدر جمہوریہ کی تشریف آوری سے قبل ان کی باہمی گفتگو کافی دلچسپ تھی۔ چند وزیر آچکے تھے اور وہ لوگ اسٹیج کے نیچے مولانا کے مزار سے مل کر فرش پر بیٹھ گئے۔ جب جگجیون رام صاحب تشریف لائے تو بعض وزیروں نے ان سے کہا کہ وہ اسٹیج پر تشریف رکھیں، انھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور زینے پر بیٹھ گئے جو اسٹیج پر چڑھنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں کے کے شاہ تشریف لائے۔ ۱۸ر فروری کو انھوں نے یوم غالب کے مشاعرے کی صدارت فرمائی تھی اور اپنی صدارتی تقریر میں غالب کے موقع و محل کے مطابق بہت مناسب شعر پیش کئے تھے۔ انھوں نے جگجیون رام صاحب کو زینے پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو برجستہ فرمایا، یہ غالب کا زمانہ نہیں ہے جگجیون رام کہ آپ فرمادیں گے:

بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی آئیں تو سب نے کھڑے ہو کر ان کا خیر مقدم کیا۔ غیر وزیروں میں سے کسی نے کہا: اب آپ لوگوں کی سربراہ آگئیں اب تو اسٹیج پر تشریف رکھئے۔ وزیروں نے اندرا جی سے آگے بڑھنے کو کہا، انھوں نے فرمایا دھکئے میں وہاں بھی پہنچ جائیں اور وزیروں کے جھرمٹ میں اسٹیج پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئیں۔ انھوں نے وہاں سے ماحول کا جائزہ لیا، جامع مسجد کے حسین منظر کو دیکھا، اس کے ارد گرد کباڑیوں کی دوکانوں پر نظر ڈالی اور فرمایا، یہاں پر کیا ہو رہا ہے، ان کا اشارہ ان شرکوں اور دوکانوں کی تعمیر کی طرف تھا، جو ایک عرصے سے وہاں جاری ہے اور جامع مسجد کے علاقے کو صاف ستھرا رکھنے اور اس کو خوبصورت بنانے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے کہا، کباڑیوں کی ان دوکانوں سے جامع مسجد کا حسن بالکل چھپ گیا ہے۔ افسوس کہ اس وقت کوئی ایسا شخص نہیں

تھا، جو اس علاقے کی اسکیموں سے پوری طرح واقف تھا اور ان کو صحیح صورت حال بتلاتا اور ان کے اس ... صاحب وغیرہ نو راشٹرپتی کے استقبال میں مصروف تھے۔

... کالج، دیال سنگھ، میں بھی مولانا آزاد کی برسی منائی گئی اور استادوں اور طالب ... نے جو تقریریں کیں وہ جذبات اور خیالات کے لحاظ سے بہت اچھی تھیں۔ مگر بعض مقرروں سے ملنے اور گفتگو کرنے کے بعد میں نے محسوس کیا ہے کہ ہندی میں مولانا پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس طرف خاص طور پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے، نئی نسل تو آج بھی نصاب تعلیم کے علاوہ، غالباً انگریزی کی کتابیں اور رسالے نہیں پڑھتی، لیکن پچھلے دنوں انگریزی کے خلاف جو مظاہرے کئے گئے ہیں، ان کے پیش نظر مولانا آزاد اور دوسرے مسلم قوم پرور رہنماؤں کے متعلق ہندی میں زیادہ سے زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے۔

"مولانا آزاد کے انتقال کو دس سال ہو گئے، ہندوستان کے اس عظیم رہنما کو کچھ لوگ بھولتے جا رہے ہیں" "ہماری زبان" نے اپنے ادارتی نوٹ میں لکھا ہے۔ کچھ اسی طرح کی بات روزنامہ "دعوت" نے بھی لکھی ہے۔ "مولانا اپنے وقت کی بہت قدآور شخصیت تھے، مگر احسان ناشناس زمانہ انہیں بھولتا جا رہا ہے۔" مگر سوال یہ ہے کہ انہیں کس نے یاد رکھا ہے؟ ہمارے مسلم اخبارات دوسروں سے شکایت کرتے ہیں کہ مسلمان رہنماؤں کو یاد نہیں کیا جاتا۔ مگر یہ مسلم اخبارات خود بھی کچھ کرتے ہیں؟ مولانا آزاد کی دسویں برسی پر مسلم اخبارات کو اٹھا کر دیکھ جائیے ہر طرف سناٹا نظر آئے گا۔ روزنامہ الجمعیۃ نے مولانا آزاد کی برسی کی خبر شائع کرتے وقت دلی کے کانگریسی رہنماؤں سے شکایت کی ہے کہ فلاں فلاں اشخاص کے علاوہ اور کوئی بھی جلسے میں موجود نہیں تھا۔ مگر خود اس اخبار کو اداریہ نہ سہی ایک نوٹ لکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔ اگر کسی کو اداریہ لکھنے کی توفیق ہوئی تو وہ ایک غیر مسلم روزنامہ ہے۔ اردو کے مشہور روزنامہ تیج نے اپنے ۲۴ فروری کے شمارہ میں ایک اداریہ سپرد قلم کیا ہے، جس میں اس نے مولانا کو کھل کر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

ریڈیو کے مختلف پروگراموں میں بھی ہر سال مولانا کی یاد میں تقریریں اور فیچر نشر کیے جاتے ہیں حسب معمول امسال بھی ۲۲ فروری کو مولانائے مرحوم کی یاد کو تازہ کیا گیا اور ان کی روح کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ اردو تقریروں کے سکشن سے، جو ایک طویل عرصے سے قائم ہے اور جس سے ہمیں اردو کے اچھے پروگراموں کی توقع ہوتی ہے، جو پروگرام نشر ہوا وہ کچھ کمزور سا تھا، مولانا آزاد کی تحریروں کی بنیاد پر ایک فیچر مرتب کیا گیا تھا، شاید کسی اچھے مقرر کا انتظام نہ ہو سکا، اس لیے خلا کو پُر کرنے کے لیے ایک پروگرام شامل کر لیا گیا۔ اس فیچر کا عنوان تھا "اسوۂ آزاد"۔ میرے خیال میں پچھلے سال بھی اسی عنوان سے یہی پروگرام نشر کیا گیا تھا۔ "اسوہ" کے لفظی معنی جو بھی ہوں، لیکن اردو میں اس کا استعمال آنحضرت کے لئے مخصوص ہو گیا ہے۔ اس لیے کسی اور کے لیے استعمال کرنا ذرا نامناسب ہے، جناب ساغر نظامی صاحب تو اس قسم کی باریکیوں سے واقف ہیں، اس لیے اس عنوان کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ اس سے قطع نظر یوں بھی موضوع کے لحاظ سے اس فیچر کا یہ عنوان صحیح نہیں تھا۔

خوشی کی بات ہے کہ دہلی ریڈیو کے دوسرے پروگراموں میں بڑی پر اثر اور فکر انگیز تقریریں نشر ہوئیں، اردو مجلس سے تین تقریریں نشر ہوئیں اور تینوں ایک سے ایک اچھی؛ ڈاکٹر تارا چند کو مولانا کے ساتھ وزارت تعلیمات میں سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا تھا، انھوں نے قومی یکجہتی اور مولانا آزاد کے عنوان سے تقریر کی، پروفیسر خواجہ غلام السیدین کو بھی مولانا کے ساتھ کام کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے، ان کی تقریر کا عنوان تھا "مولانا آزاد بحیثیت انسان"۔ پروفیسر آل احمد سرور اردو کے مستند نقاد اور بہترین انشا پرداز ہیں، ان کی تقریر تھی "مولانا آزاد کا اجتہاد اردو نثر میں"۔ بڑی دلکش تقریر تھی۔ ان تقریروں کی نقلیں حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، انشاء اللہ جامعہ کے اگلے شمارے میں ہم شائع کر سکیں گے۔ کسی اور پروگرام کے تحت جناب ایم این مسعود صاحب نے انگریزی میں تقریر کی تھی، عنوان تھا، "مولانا آزاد جیسا کہ میں ان کو جانتا ہوں"۔ موصوف کو بھی مولانا آزاد کے ساتھ کام کرنے کا فخر حاصل ہے انھوں نے اس کی نقل بھیجنے کا وعدہ کیا ہے، انشاء اللہ اس کا ترجمہ بھی کسی مناسب موقع پر پیش کیا جائے گا۔ شری کے ڈی مالویہ کی بھی ایک تقریر نشر ہوئی تھی، عنوان تھا "مولانا صاحب کو میں بھی جانتا

سامنے آئیں گے جو کسی حد تک تاریکی میں تھے۔ میں نے اس وقت جلدی میں صرف ورق گردانی کی ہے۔ مولانائے مرحوم کی موقع موقع سے بہت سی تحریریں بھی پیش کی گئی ہیں۔ ان میں بعض ایسی تحریریں بھی ہیں جو آسانی سے آج ہر شخص کو میسر نہیں آسکتیں، ہم چاہتے ہیں کہ ان میں سے بعض کی آپ بھی سیر کرلیں۔ "مسئلۂ خلافت اور جزیرۃ العرب" کے نام سے مولانا کے ابتدائی دور میں ایک رسالہ شائع ہوا تھا۔ یہ دراصل مولانا کا ایک خطبۂ صدارت تھا، جو بنگال کی صوبائی خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا، بعد میں مولانا کی نظر ثانی کے بعد البلاغ پریس سے دوبارہ شائع کیا گیا۔ مولانا پیغمبروں اور بیسویں صدی کے رہنماؤں کے طریق کار کے فرق اور اختلاف پر لکھتے ہیں:

"۱۹۱۱ء میں جبکہ میری موجودہ پبلک زندگی کا بالکل ابتدائی عہد تھا، مجھے موقع ملا کہ اپنی آئندہ زندگی کے لیے ایک مذہب عمل قرار دے لوں۔ خدمت ملک و ملت کے دشت ناپیدا کنار کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے، اصول عمل کی مختلف راہیں میرے سامنے تھیں اور میں چاہتا تھا کہ میرا سفر اس دانشمند مسافر کی طرح ہو جس نے سفر سے پہلے راہ و منزل کے تمام مرحلوں پر غور کر لیا ہے، اس طوفانی کشتی کی طرح نہ ہو جس نے ہوا کے جھونکوں اور سمندر کی موجوں پر اپنے سفر کا رخ اور کنارے کی جستجو چھوڑ دی ہے، اس وقت اپنے مذہب عمل کی نسبت جن اصولی مسائل کا میں نے قطعی فیصلہ کر لیا تھا، ان میں ایک خاص مسئلہ یہ بھی تھا کہ اپنی زندگی کے ہر حصے میں ہمیشہ مجلسوں کی صدارت انجمنوں کے عہدوں اور اسی طرح کے تمام رئیسانہ اور رسمی منصبوں سے یک قلم کنارہ کش رہوں۔

یہ فیصلہ دراصل میرے ایک بنیادی اور دینی اعتقاد کا ایک قدرتی نتیجہ تھا۔ میں نے اپنے لیے جو راہ عمل منتخب کی تھی وہ دعوت و تبلیغ کی راہ تھی؛ موجودہ زمانے کی مصطلحہ لیڈرشپ کی راہ نہ تھی۔ میرے سامنے اتباع و اقتدار کے لیے نوع انسانی کے ان مخصوص افراد کا نمونہ تھا جو دنیا میں خدا کے رسولوں اور پیغمبروں کے نام سے پکارے گئے ہیں اور جن کے طریق عمل کو اسلام کی اصطلاح میں حکمت اور سنت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ میں اپنی راہ طلب کا ہاتھ ابراہیم اور محمد (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے رہنما ہاتھوں میں دیدینے کے لیے مضطر تھا؛ گریبالڈی، میزینی یا گلیڈاسٹون اور پارنل بننے کا عشق

[illegible]

[illegible] کا اثر ہویدا ہے ۔ ایک تصویر میں وہ ہلاکت [illegible] پر جو تصویر بنی

اس میں حسن کی دیبی بنا کھڑا ہے ، اگرچہ آخری اوصاف کا اظہار بھی پوشیدہ مصالح پر مبنی

[illegible] اس وجہ تضاد سا اختلاف بے معنی نہیں ہوسکتا[1] ......

مولانا آزاد کی یہ تحریر پڑھ کر مجھے مولانا شبلی کا مشہور شعر یاد آگیا :

تمھیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کش تھا ، ظالم تھا ، ستمگر تھا

پاکستان میں مولانا آزاد کی کتابیں بہت مقبول ہیں ، یہاں تک کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان سے بھی زیادہ وہاں بکتی ہیں ، مگر وہاں کی حکومت اس کی پوری احتیاط رکھتی ہے کہ سرکاری ملاقات میں ان کا کوئی ذکر نہ آنے پائے ، اس لیے یہ توقع رکھنا کہ وہاں کے ریڈیو نے بھی مولانا آزاد کی برسی پر کچھ نشر کیا ہوگا ، سراسر عبث ہے ، البتہ مولانا مرحوم کے عقیدت مند مولانا غلام رسول مہر اور بیباک ہفت روزہ چٹان (لاہور) کے اڈیٹر جناب شورش کاشمیری مولانا کی یاد کا چراغ ہر حالت میں روشن رکھتے ہیں اور الوسلمان شاہجہاں پوری نے مولانا آزاد کی یادگار میں ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے اور وہ کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں ۔ کئی سال سے مولانا کے خطوط کا ایک مکمل اور جامع مجموعہ مرتب کر رہے تھے ، خوشی کی بات ہے کہ امسال اس دسویں برسی کے موقع پر وہ شائع ہوگیا ہے ۔ میری خواہش پر ، اس رپورتاژ کے لئے انھوں نے ایک بیٹنگ کاپی بھجوائی ہے ، مگر اس دور میں جبکہ دنیا سمٹ کر مختصر سے مختصر تر ہوگئی ہے اور فاصلے روز بروز کم ہوتے جارہے ہیں ، ہندوستان اور پاکستان کے فاصلے بڑھ گئے ہیں ، اس کتاب کو روانہ ہوئے کافی دن ہوگئے ہیں ، مگر دیکھئے کب موصول ہوتی ہے ۔ یہ رپورتاژ اگرچہ اس مجموعۂ خطوط سے محروم رہا ، مگر قارئین جامعہ کو اس سے مستفید کرنے کی کوئی نہ کوئی اور صورت نکل آئے گی ——— یار زندہ صحبت باقی

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد صفحہ ۲۸۹

سعید انصاری

رفتارِ تعلیم

نوجوان اور ڈاکٹر کلودیس مقصود :

یوں تو یونیورسٹیوں کے کنووکیشن میں ہندوستان کے بڑے بڑے ماہرینِ تعلیم یا قومی زندگی کے ممتاز اشخاص ہمیشہ مدعو کئے جاتے ہیں، اور وہ ہندوستان کی تعلیم سے متعلق اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار کرتے ہیں، لیکن اس سال جموں وکشمیر یونیورسٹی نے اپنے ہاں جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر عرب لیگ کے خاص [illegible] ڈاکٹر کلودیس مقصود کو مدعو کیا تھا جنھوں نے نوجوانوں کے مسئلے، ان کے ضبط و نظم اور قومی زندگی میں ان کے حصے سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ عام خیالات سے ذرا مختلف ہیں، اس لئے رفتارِ تعلیم کے قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوں گے، وہ کہتے ہیں کہ

"نوجوانوں کو انھیں اپنے ملک کے عام حالات سمجھنے کا پورا موقع دینا چاہئے۔ انھیں اپنے قومی مقاصد سے اور زیادہ باقاعدہ اور گہرے انداز میں وابستہ ہونے کا موقع ہونا چاہئے۔ ہمارے نوجوان اسی وقت ٹھیک انداز میں کام کریں گے جب وہ یہ سمجھیں گے کہ ان کے مسئلے خواہ کتنے ہی اہم اور پریشان کن کیوں نہ ہوں، اور ان کی تکالیف خواہ کتنی ہی شدید اور فوری کیوں نہ ہوں، نہ ملک کی عام پریشان حال سماجی اور معاشی اسباب کا نتیجہ ہیں۔ لیکن جو شکایات طلبا اور نوجوانوں کو مخصوص ہیں، ان پر فوری توجہ ہونی چاہئے اور ان کا خاطر خواہ علاج کرنا چاہئے۔ لیکن نوجوانوں کو بھی اپنی شکایتوں کے سلسلہ میں یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ بھی ملک کے عام حالات کا نتیجہ ہو سکتی ہیں۔ نوجوانوں [illegible] تعلق نہیں رکھنا ہے بلکہ ان کا پوری قوم سے واسطہ ہے۔ دوسری [illegible] ہے کہ جو انتظامی اور نفسیاتی دیواریں ان کے اور نوجوانوں کے

... سے گزر کر ان سے معاملہ کرتا ہے۔ انھیں یہ بھی ...
نوجوان ایک حد ... ہوتا ہے۔ ملک و قوم کا مستقبل اس کے ہاتھوں میں ہے اور جب یہ مستقبل اسے
ایک یا دھندلا ... ہے، تو اس کی پریشانی اور بے چینی بڑھ جاتی ہے اور ناراضگی اور غصہ کے
اظہار کی مختلف شکلیں اختیار کرلیتی ہے۔ یہ صورت حال ان ملکوں میں اور بھی نازک ہوجاتی ہے جو ابھی
ترقی کے راستے پر گامزن ہیں۔ ان ممالک کے بوڑھے اور عمر رسیدہ آزادی و ترقی کی کشاکش سے
دوچار ہوچکے ہیں اور وہ ایک گونہ اس کا پھل کھا رہے ہیں، لیکن یہ نوجوان ہنوز اس کشاکش ...
... اس کے نتائج سے بھی محروم۔

نوجوانوں کے لئے اس زندگی میں بڑا موقع ہے۔ ان کی نت نئی تبدیلیوں کی خواہش، ان کے
علم کی پیاس، ان کے زیادہ سے زیادہ حصول کی کوشش سب اس بات کی متقاضی ہیں کہ وہ اپنے ملکی
اور قومی مسایل کا اپنے بڑوں اور زیادہ تجربہ کار بزرگوں کے ساتھ صحیح سے صحیح حل سوچیں گے اور زندگی
کے نئے افق تلاش کریں گے۔ اس طرح ان میں ایک توازن اور ہم آہنگی رہے گی جو جدید دنیا سے
انھیں وابستہ رکھے گی۔"

موجودہ نظام تعلیم کی بے روحی

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس ہندوستان کی ایک غیر سرکاری جماعت ہے جس کا ہر سال ہندوستان
کے کسی نہ کسی بڑے شہر میں اجلاس ہوتا ہے اور جہاں تعلیم کے مختلف میدانوں میں کام کرنے والے اشخاص
جمع ہوتے ہیں اور اپنے اپنے موضوع پر مقالے پڑھتے ہیں۔ اس کانفرنس کا افتتاح کوئی بڑا آدمی کرتا
ہے اور خطبۂ صدارت تعلیم کا کوئی ماہر دیتا ہے۔ اس سال یہ کانفرنس گذشتہ دسمبر میں مدراس میں
ہوئی تھی۔ اس کا افتتاح مدراس کے گورنر سردار اجل سنگھ نے کیا تھا، استقبالیہ خطبہ ڈاکٹر مدالیار نے
دیا تھا اور اصل اجلاس کی صدارت پروفیسر ڈی سی شرما کے حصہ میں آئی تھی۔ ان میں سے ہر ایک نے
اپنی اپنی علمی حیثیت کے مطابق اپنا حق ادا کیا تھا اور تعلیم کی ترقی اور اس کی رفتار بڑھانے میں اپنے
اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ڈاکٹر مدالیار نے لوگوں میں تعلیم کے روز افزوں شوق کو دیکھ کر بڑے

مختصر لیکن بلیغ انداز میں یہ فرمایا تھا کہ ہمیں اپنے کاموں میں ہندوستان میں رہ کر زیادہ سے زیادہ [illegible] دکھانی ہے اور باہر جا کر اپنے کام [illegible] بڑی سے بڑی عزت حاصل کرنی ہے۔ یہی ہمارا خواہ سرکاری [illegible] یا غیر سرکاری نعرہ ہونا چاہئے۔

[illegible] سنگھ نے اپنی افتتاحی تقریر میں ہندوستان کے اندر اخلاقی اور روحانی تعلیم پر زور [illegible] ہے یہ شکوہ کیا تھا کہ وہ بعض وقت اپنے کو ٹریڈ یونین میں تبدیل کر دیتے ہیں [illegible] بڑا سبب انہوں نے ”نظام تعلیم کا میکانکی اور بے روح“ ہونا بتایا تھا اور اس بات پر سخت افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا تھا کہ ذرا سی شکایت بھی ہنگامہ و فساد کا رخ اختیار کر لیتی ہے اور یہ بھی بڑی قابل افسوس بات ہے کہ طلبا کی جماعت سماج دشمن لوگوں کے ہاتھوں میں [illegible] سے آجاتی ہے۔ ایسی صورت میں اس کی بڑی ضرورت ہے کہ تعلیم گاہوں میں اخلاقی اور مذہبی تعلیم کا لازمی انتظام ہو، اس لئے کہ مذہب اور اخلاق کا سیرت کی تشکیل اور ضبط کے قیام میں بڑا حصہ ہے۔

اس کے بعد اصل خطبہ صدارت ڈاکٹر ڈی سی شرما کا آتا ہے، جس میں انہوں نے بڑی شکایت اس امر کی ہے کہ تعلیم کی اصلاح کے لئے بڑے بڑے کمیشن مقرر ہوئے جن میں یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے رادھا کرشنن، ثانوی تعلیم کے لئے مدالیار کمیشن اور سب سے آخر میں تعلیم کی تنظیم و اصلاح کے لئے کوٹھاری کمیشن جو ابھی حال میں مقرر ہوا تھا۔ سب کی رپورٹیں شائع ہوئیں اور وہ سب کی سب کتب خانوں کی زینت [illegible] اس امر کی ہے کہ ان رپورٹوں کا جو مفید حصہ ہے اور ان کی جو سفارشات اس وقت قابل عمل ہیں [illegible] اکٹھا کر کے ان پر عمل کی طرف قدم اٹھایا جائے انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ہر ریاست کم سے کم [illegible] اپنے سالانہ میزانیہ کا تعلیم پر صرف کرے۔ اس سلسلہ میں مدراس نے جو قدم اٹھایا ہے، وہ قابل تعریف ہے۔ زبان کے مسئلہ پر انہوں نے فرمایا کہ انگریزی ابھی ہندوستان میں بہت دنوں تک [illegible] کی اور جنھیں اس میں شبہ ہے وہ ان ملکوں کا حال دیکھیں، جیسے سویت روس ہے وہاں انگریزی یا کسی غیر ملکی زبان کا کیا حال ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]	:	[illegible]
[illegible]	:	[illegible]
[illegible]	:	[illegible]
[illegible]	:	[illegible]
[illegible]	:	[illegible]
[illegible]	:	[illegible]
[illegible]	:	[illegible]
[illegible]	:	[illegible]
[illegible]	:	[illegible]
[illegible]	:	[illegible]
[illegible]	:	[illegible]
[illegible]	:	[illegible]

([illegible])

[illegible]


APPROVED REMEDIES
for QUICK
RELIEF
for
COUGHS
& COLDS
CHESTON
SYRUP
ALERGIN
TABLETS
TONIC FOR
STUDENTS
& BRAIN WORKERS
HOSPHOTON
for
FEVER & FLU
QINARSO
for
INDIGESTION
CHOLERA
OMNI
PRODUCTS OF
NOWN LABO
Birla
AVAILABLE AT CHEMISTS

جامعہ

سالانہ چندہ ... روپے

قیمت فی پرچہ پچاس پیسے

جلد ۵۷ | بابت ماہ اپریل ۱۹۶۸ء | شمارہ ۴

فہرست مضامین

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کو ساری دنیا کی داستان بنا دینے کی بھرپور فنکارانہ صلاحیت اور قدرت [illegible] ہو۔ اس طرح درحقیقت تحقیق اور تخلیق دونوں ایک دوسرے کے کام آتی ہیں، دونوں ایک دوسرے کا سہارا ہیں، اس لئے تحقیق اور تخلیقی کام کرنے والے ایک دوسرے کے حریف نہیں، ساتھی ہیں۔

[illegible] جو تخلیقات ہو رہی ہیں، وہ بہت کمزور قسم کی ہیں، ہماری نئی نسل کے شاعر، نقاد، افسانہ نویس اور ناول نگار، اپنے کلاسیکی ادب سے پوری واقفیت نہیں رکھتے، اُن میں وہ تاریخی نظر نہیں جو اُن کے دل کے اضطراب کو تھام سکے، نالہ ہے مگر خام ہے [illegible] میں پختگی اسی وقت پیدا ہوگی جب اُن کے سامنے تہذیبوں کے طلوع و غروب کے فکر انگیز مناظر ہوں، اور یہ چیز بغیر کلاسیکی ادب کے گہرے مطالعے اور تاریخ انسانی کے خوب و زشت سے واقفیت کے بغیر ممکن نہیں، اور یہ سب کچھ نتیج ہو ایسے تفکر پر کہ انسان کی کہانی اعلیٰ اخلاقی قدروں کی کہانی بن جائے۔

[illegible] نئے لکھنے والے، خواہ وہ شعر کہتے ہوں یا نثر لکھتے ہوں، اُس زبان سے بھی اچھی طرح واقف نہیں جس میں وہ لکھتے ہیں، میری مُراد اردو زبان سے ہے، اس زبان کے محاورے، اس کی تشبیہیں اور استعارے، اس کی شعری علامتیں —— یہ سب ایک خاص تہذیب کی دین ہے، اس تہذیب میں ہندی کی ملاحت، فارسی کی حلاوت اور عربی کی صلابت سبھی کچھ شامل ہے، اردو کے تخلیق کاروں کو اس تہذیب اور اِس کے بنیادی عناصر سے آگاہی ہونی چاہیئے، یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان نے فارسی کا ذوق کھو کر اپنے آپ کو ایک بڑی دولت سے محروم کر لیا، اور اُردو کے شعری ادب کا تقریباً سب کچھ ہی فارسی ہی کا رہینِ منت ہے، ایسی صورت میں کیا یہ لازم نہیں آتا کہ فارسی شعر و ادب کا مطالعہ بھی سنجیدگی سے کیا جائے، یہ کیسے ممکن ہے کہ اردو کے شاعروں اور ادیبوں کو زبان و بیان پر قدرت اردو اور فارسی جانے بغیر حاصل ہو جائے اور معلوم ہے کہ زبان و بیان پر قدرت کے بغیر اچھی ادبی تخلیق نہیں ہو سکتی، جدید شاعری کا انسان خواہ کتنا ہی تنہا کیوں نہ ہو، وہ تاریخ کے دھارے سے [illegible] سکتا، جدید شاعر بلاشبہ اپنے انفرادی اضطراب و ہیجان کو آج

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ضیاء الحسن فاروقی

ژاں ژاک روسو

(۱۷۱۲ — ۱۷۷۸ء)

(۴)

روسو نے جس طرح اس حقیقت کو مان لیا تھا کہ فرد کے لئے معاشرتی زندگی ناگزیر ہے، اسی
رح اس بات پر بھی زور دیا کہ اچھے معاشرہ کی تشکیل کے لئے فرد کی تعلیم بھی اچھی اور مناسب ہونی
اہئے۔ لیکن جیسے اس نے اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی اداروں کے خلاف انقلابی خیالات
یش کئے بالکل اسی طرح تعلیم کے متعلق بھی اس کی آواز رائج طریقوں اور مسلمہ اصولوں کے خلاف
قلاب اور بغاوت کی آواز تھی، اس آواز کی گھن گرج اس نے اپنی تصنیف "امیل" کے برجستہ
قروں، جذباتی جملوں اور منتخب ترکیبوں اور استعاروں کے ذریعہ لوگوں کے کانوں تک پہنچائی،
میل" کا سن تصنیف وہی ہے جو "معاہدہ عمرانی" کا ہے۔ یہ کتاب ایک لحاظ سے خود اس کی
رزوؤں کی کہانی بھی ہے، وہ آرزوئیں جن کے مطابق وہ اپنا بچپن گذارنا چاہتا تھا لیکن
اس کی قسمت میں نہ تھا، یہ فرانس کے طبقۂ امرا کی خاندانی زندگی اور امیر گھرانوں کی مہذب
رتوں کے طور طریقے پر طنز بھی ہے، اس میں بھی ہمیں فطرت اور فطری زندگی کی سادگی اور
یرنگی کے احترام کی دعوت دی گئی ہے اور ایک بار پھر یہی بتایا گیا ہے کہ انسان بنیادی طور پر
[illegible] لیکن تہذیب و تمدن اسے خراب کر دیتے ہیں۔ فطرت انسانی کے نیک ہونے کا تصور
یسائی تعلیمات کی با[illegible] تھا، کلیسا نے صدیوں یہ تعلیم دی تھی کہ انسان پیدائشی طور پر گنہگار ہے،

خدا جو رحیم اور رحمٰن ہے، انسان کی نجات کے لئے بیچین تھا، اس لئے اُس نے خود حضرت مسیحؑ [illegible] صلیب پر چڑھ کر انسان کے گناہوں کا کفارہ ادا کرے، روسو کلیسا کے اس عقیدہ کا مخالف تھا اور یہی وجہ ہے کہ کلیسا نے اُسے کبھی معاف نہیں کیا۔

ویسے تو "ایمیل" ایک کہانی کے روپ میں لکھی گئی ہے، لیکن اِس کا ایک حصہ ناصحانہ ہے، مجموعی طور پر یہ فلسفۂ تعلیم پر ایک پختہ کار ذہن کی ممتاز تصنیف ہے، اس میں اُس نے یہ بتایا ہے کہ بچہ کی صحیح اور سچی تعلیم اسی طرح ہوسکتی ہے کہ اُسے شروع ہی سے ماں باپ سے الگ کر لیا جائے، خاندان، اسکول اور سماج سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو، اِس طرح سب سے الگ کر کے اُسے ایک نمونے کے استاد کی نگرانی میں رکھا جائے جو اُس کی پرورش فطرت کے حُسن اور نیرنگیوں کی آغوش میں کرے۔ کتاب کے شروع ہی میں وہ ایک بنیادی اصول بیان کر دیتا ہے: "خالق کائنات ہر چیز کو اچھی بناتا ہے لیکن جیسے ہی یہ انسان کے ہاتھوں میں پہونچتی ہے اس میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔" ہماری تعلیم کے تین سرچشمے ہیں: فطرت، انسان، اشیاء، ان تین وسیلوں سے جو کچھ ملتا ہے اُس میں اگر ہم آہنگی اور توازن نہ ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری تعلیم میں خرابی اور خامی رہ گئی ہے۔

روسو جب یہ کہتا ہے کہ بچے کی تعلیم و تربیت فطرت کے مطابق ہونی چاہئے تو اس سے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بچے کی خواہشات، جذبات اور اُس کے جبلی عمل اور ردِ عمل پر قید و بند نہ عائد کی جائے، دوسروں کے ساتھ رہ کر بچے کی رائے اور خیال پر خارجی اثرات پڑتے ہیں اور ان کی وجہ سے اُس کے اپنے ذاتی تاثرات پر اُس کی فطرت کی کارفرمائی نہیں رہ پاتی، اور یہ چیز بچے کی تعلیم و تربیت کے لئے مُضر ہے۔ روسو اٹھارویں صدی کی بناوٹی اور تکلفات سے بھرپور متمدن زندگی کے ملبے سے انسان کو نکال کر ایک نیا جنم دینا چاہتا تھا، وہ ایک نئے انسان کی تعمیر کا خواب دیکھتا تھا، اسی لئے وہ مروجہ سماجی اداروں اور رائج ریت رسم کے استحکام کے لئے دی جانے والی تعلیم کو غلامی سے تعبیر کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ اس طرح کی تعلیم میں بچے کی فطرت کو فراموش اور اُس کی سچی خوشی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ "انسانی دانشمندی کا سارا سرمایہ غلامانہ

[illegible]ات پر مشتمل ہے، ہمارے رسم و رواج، حکومی، پریشان [illegible] اور کچھ نہیں۔ مہذب آدمی غلامی کی حالت میں پیدا ہوتا ہے، غلامی ہی میں زندہ رہتا ہے اور اسی حالت میں مر جاتا ہے، پیدائش کے وقت اسے پوتڑوں میں لپیٹ دیا جاتا ہے اور مرنے پر اُسے کفن پہنایا جاتا ہے، غرض جب تک کہ وہ انسانی شکل میں ہوتا ہے، اس پر مختلف اداروں کی بندشیں ہوتی ہیں۔"

جیسا کہ مضمون کے شروع میں کہا جا چکا ہے روسو کی ذہنی روح تعمیر سے نہیں بلکہ تخریب کے ہیجان سے پیدا ہوئی تھی، وہ سیاست اور معاشرت کے ہر شعبے میں اثبات کا نہیں نفی کا واعظ تھا، [illegible] تعلیم کے میدان میں بھی اس کی آواز منفی ہی رہی، اُس نے کہا کہ یہ بات مفاد پرستوں کے حق میں ہو گی اگر تعلیم کا مقصد یہ ہو کہ پرانے عقائد کو اور مستحکم بنایا جائے، اس لئے ضروری ہے کہ [illegible] تعلیم کا منہج منفی ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ بچے کو یہ نہ بتایا جائے کہ نیکی اور سچائی کیا ہے بلکہ یہ کہ وہ کس طرح اپنے دل کو برائیوں اور اپنے ذہن کو غلطیوں سے محفوظ رکھے۔ بچے کا بھی اپنا [illegible] خواہش ہوتی ہے، صحیح تعلیم یہ ہے کہ اُس کی خواہش، فطری رجحانات، داخلی صلاحیتیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس کی اپنی فطرت دبائی نہ جائے۔

تعلیم کے اس منفی تصور سے روسو کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ سرے سے تعلیم ہی نہ دی جائے، مقصود یہ تھا کہ تعلیم ہو لیکن مروجہ طریقۂ تعلیم سے ہٹ کر ایک دوسرے منہج پر۔ اپنے اس تصور کی [illegible] میں اُس نے لکھا ہے کہ ”میں مثبت تعلیم اُس تعلیم کو کہتا ہوں جو وقت سے پہلے ذہن کی تعمیر کا رجحان رکھتی ہے اور بچے کو وہ فرائض سکھاتی ہے جو ایک بالغ انسان ہی [illegible] سکتا ہے، میں منفی تعلیم اس تعلیم کو کہتا ہوں جو اُن اعضا کو جنھیں ہم حصولِ علم کا وسیلہ کہتے ہیں، براہ راست اس علم کا وسیلہ بننے سے پہلے، تیار اور ان کی تکمیل کرتی ہے، اور حواس کے مناسب استعمال سے عقل و شعور کی معجز نمائی کے لئے راہ ہموار کرتی ہے، منفی تعلیم بیکاری اور کاہلی کا مشغلہ نہیں ہے، اس سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں، نیکی نہیں سکھاتی، یہ برائی سے بچاتی ہے، یہ سچائی کی تعلیم نہیں دیتی، یہ خطا سے محفوظ رکھتی ہے، اس سے بچے کی طبیعت

[illegible]

[illegible]

[illegible]

وپ کے لوگ کیتھولک عیسائیت کی تنگ نظ… پابند … تھے، اور انسا
ح کا طائرِ قفس کی تمام تیلیوں کو توڑ کر فضائے بسیط میں پرواز کرنے کا آرزومند تھا، یورپ
سان اب اسی دنیا، اسی زندگی، اس کی کشمکش، اس کے نشیب و فراز اور اسی کے لذت و الم کو
ر انگاہ بنانا چاہتا تھا، شکسپیر اس آرزو … تمنا کی علامت تھا، اُس نے انسانی جذبے اور
ی کے رنگارنگ مناظر کی … تفسیر و تشریح کی کہ اُس انقلابی عہد میں انسان
کا مرکز بن گیا۔

رومانیت کا یہ … لہر تھی اور ابھی مکمل طور پر یہ عہدِ وسطیٰ کے ذہنی اثرات کو مٹا نہیں سکی
ر اس کی روک تھام کے لئے عقلیت کے پشتے بنا دئے گئے، عقلیت کا یہ دور سترھویں صدی
لیع آخر میں شروع ہوا اور تقریباً اسی نوے سال تک یورپ کی علمی و ادبی فضا پر چھایا رہا۔
ریک میں جذبے کی کوئی اہمیت نہیں تھی، سب کچھ عقل تھی، اس تحریک نے فرانس میں جنم لیا،
ر انگلستان … منی میں پہلی، عقلیت نے آزاد خیالی کا رنگ جمایا اور رائج رسم و روایات
رجہ مذہبی عقائد و اعمال طنز و تضحیک کا نشانہ بنے، اس نے روشن خیالی کے لئے فضا ہموار
ر تنقیدی اور علمی … فکر کو پروان چڑھایا، بلاشبہ عقلیت کا یہ بڑا کارنامہ ہے لیکن اِس کا
یہ دہی کلاسیکی … جس میں یونانی اصولوں ہی کو برتا جاتا رہا، اور یونانی رومی تہذیب کی کلاسیکیت
ے گن گاتے جاتے رہے، یورپ ذہنی اعتبار سے، اپنی عقل پرستی کے باوجود، یونان اور
ی کا مقلد … خواہ کسی کی اور کسی نوعیت کی ہو تخلیقی قوت کے سرچشموں کو خشک
ی ہے، ہر قوم اور ہر عہد کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اٹھارویں صدی کا یورپ اپنی کلاسیکیت
عا کے باوجود حقیقی معنوں میں کلاسیکی نہیں تھا، اس عہد کی عقلیت یکطرفہ اور انتہا پسندانہ
عہدِ وسطیٰ کے فکری و ذہنی جمود کے خلاف، اس لئے اس میں ہمیں وہ توازن اور ہم آہنگی
ی جو یونانیوں کے دورِ آخر کے فکر و فلسفے میں پائی جاتی ہے۔
روسو پہلا شخص ہے جس نے فرانس میں اس بے روح عقلیت کے خلاف آواز اٹھائی

اور رومانیت کا غلغلہ ایک بار پھر بلند ہوا، اُدھر جرمنی میں کانٹ اور ہرڈر نے عقلیت کی کمزوریاں [illegible] گوئٹے [illegible] فن اور بصیرت سے اس تحریک کے ہیجان کو سکون سے آشنا کیا۔

[illegible] روسو کا تعلق ہے وہ فرانس میں اس نئی رومانی تحریک کا امام تھا، اس کی آشفتہ نوائی میں غضب کا سوز اور بلا کی گرمی تھی، اُس کی تحریروں میں جذبے کی شدت تھی اور وہ اپنی بات اس طرح سے کہتا تھا کہ سننے والا یا پڑھنے والا یہ سمجھتا تھا کہ یہ اُس کے اپنے دل کی آواز ہے، اُس نے عقل اور تجزئے کو وہ اہمیت نہیں دی جو اٹھارویں صدی کے عقلیت پسندوں کا طُرّۂ امتیاز تھا، اس کے بجائے اُس نے جذبے اور جبلت کو اہم بتایا اور یہ کہا کہ جذبہ حقیقت سے زیادہ نزدیک ہے اس لئے جذباتی زندگی صداقتوں اور مسرتوں سے معمور ہے، عقل محض پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اس سے ہم خیالات و آرا کے گورکھ دھندوں میں پھنس جاتے ہیں، ہم اپنی بے خبری اور جہل میں زیادہ خوش رہ سکتے ہیں، اس سے کون انکار کرتا ہے کہ ایک عالم ایسی ہزاروں چیزوں سے واقف ہوتا ہے جنھیں ایک جاہل شخص کبھی نہیں جان سکتا؟ لیکن کیا یہ عالم اس بنا پر سچائی سے قریب ہو جاتا ہے؟ برخلاف اس کے علم کے میدان میں وہ جتنا آگے بڑھتا ہے اتنا ہی سچائی سے دور ہوتا جاتا ہے کیونکہ علم کا غرور اور رائے قائم کرنے کے سلسلے میں اُس کی خود پسندی اُسے سیکڑوں غلط خیالات میں اُلجھا دیتی ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ یوروپ کی علمی انجمنوں کی حقیقت مکر و فریب کے پبلک اسکول سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ علم اور عقل پر اس شدت کا حملہ کرنے کے ساتھ ہی وہ جذبہ، وجدان، فطرت، محبت، آزادی اور فطری سادگی کے قصیدے پڑھتا ہے، انسان کی اہمیت بتاتا ہے اور اسی کو کائنات کا مرکز سمجھتا ہے۔ انسان اُس کے نزدیک ایک لامحدود دنیا ہے جس میں بے پناہ امکانات چھپے ہوئے ہیں۔ تخیل کی پہنائیاں انسان کا وہ جوہر ہے جس کے سہارے وہ اپنی دنیا آپ بناتا اور بگاڑتا ہے، اُس کا اندرون گنجینۂ حقیقت ہے، اسی میں وہ ڈوب کر ابھرے تو زندگی کی سچائیوں کا سراغ مل سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہی رجحانات رومانیت کی خصوصیت ہیں، انھیں میں فطرت اور انسان سے محبت
[illegible] محبت کا جذبہ داخلیت کی طرف لے جاتا ہے، ہیوم اور خالص علمی فلسفہ اور
عقلی توجیہہ ہو کر رہ جائے تو اس سے دل کی دنیا آباد نہیں ہو سکتی، دل کی دنیا آباد ہوتی ہے جذبہ کی
[illegible] کی خلش سے، درد کی لذت سے، سلگنے کی تڑپ سے، روسو نے فرانسیسی
[illegible] کو شامل کیا اور ایک نئی طرز یعنی رومانیت کی بنیاد ڈالی۔

جدید ادب میں روسو کا کیا مرتبہ ہے؟ اس سوال کا جواب ہم ڈاکٹر یوسف حسین خاں
کی مشہور کتاب 'فرانسیسی ادب' کے ایک طویل اقتباس سے دیتے ہیں کہ یہ ایک ایسے شخص کی
رائے ہے جس کی نظر فرانسیسی ادب اور روسو کی ادبی حیثیت پر مسلّم کہی جا سکتی ہے، فطرت
ور روسو [illegible] طرح انسانی ڈرامہ میں ایک زندہ اور جیتے جاگتے کردار کی حیثیت سے پیش
کیا، اس پر بھی اس اقتباس سے روشنی پڑتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"فرانسیسی ادب میں ویسے تو فطرت کا ذکر ہمیں نشأۃ ثانیہ کے بعد سے برابر ملتا ہے
لیکن روسو نے اسے بلند مرتبہ پر پہنچایا اور ایسا اعلیٰ مقام عطا کیا کہ آج تک وہ وہیں براجمان
ہے۔ اس نے فطرت کے ساتھ انسانوں کا جذباتی تعلق قائم کر دیا جسے اس کا زبردست کارنامہ
سمجھنا چاہیئے۔ اب فطرت محض انسانی عمل کے پس منظر کا کام نہیں دیتی بلکہ مقصود بالذات بن گئی۔
اب وہ مطالعہ اور شاعری کا موضوع قرار پائی اور اہلِ ذوق نے اسے نئی بصیرتوں کا ماخذ قرار
دیا۔ روسو کے بعد ادب میں نفسیاتی تجزئے کے ساتھ فطرت کی تصویر کشی لازمی قرار پائی۔ روسو
کے طرزِ تحریر کی یہ خصوصیت ہے کہ فلسفی ادیبوں کے طرز کے خلاف اس کے یہاں حرارت و حرکت
کا احساس ہوتا ہے۔ اس طرح اس نے جدید ادب کے لئے راستہ صاف کر دیا جس میں خارجیت
[illegible] کا امتزاج ملتا ہے۔ رومانی غنائیت کا، جس کے موضوع خودی، خدا اور فطرت
[illegible] پائی ہے۔ اس کے تصورات میں منطق اور جذبہ، تجرید اور ادراک، خطابت اور شاعری
سفر اور مصوری سب کی لطیف کارفرمائی موجود ہے۔ وہ عہدِ جدید کے مختلف رجحانوں کا سنگم ہے۔

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

سعید انصاری

فروبل ۔ کنڈرگارٹن کا بانی

(۲)

پچھلے حصہ میں فروبل کے فلسفیانہ خیالات اور تعلیم کے نظری پہلوؤں سے بحث کی گئی تھی۔ اس حصہ میں تعلیم کے عملی پہلوؤں اور بالخصوص کنڈرگارٹن سے بحث ہوگی۔

فروبل کا اثر تعلیم کے عملی پہلوؤں پر:

فروبل کا تصور مدرسہ کی عملی زندگی کے متعلق ایسا ہی انقلاب انگیز تھا، جیسا کہ پیسٹالوزی کا۔ اور باوجود ... اور پیسٹالوزی کے اس کے خیال میں وہ اب بھی اسی قدر اصلاح کا محتاج تھا جتنا ان سے پہلے۔ ان تبدیلیوں کا جو تجربی بنیاد پر اس کے اندر پیدا ہوئیں، فروبل انھیں ایک فلسفہ کا رنگ دینا چاہتا تھا۔ اپنی ایک کتاب "تعلیم نمو کے ذریعہ" میں وہ لکھتا ہے:

"تعلیم و تدریس، ضبط اور مدرسہ بہ حیثیت مجموعی اپنی ضروریات اور ان کا انتظام، خواہ وہ بچوں کی زندگی سے بالکل باہر ہوں یا انسانی زندگی کے اندر بھی ہوں، پھر بھی ان کا تعلق ایک ایسے زمانہ سے ہوتا ہے جو بچہ کے نقطۂ نظر سے اتنا مستقبل بعید میں ہوتا ہے کہ اس کے لئے کوئی جاذبیت، ابھار اور نمو کا سبب نہیں بنتا۔ جو کچھ بچے کو کرنا یا سیکھنا ہے، وہ اس کے ارادے اور عمل سے شروع ہونا چاہیئے جو اندرونی طور پر کرنے یا خواہش سے مربوط ... مجموعی زندگی کا نتیجہ ہو جو خود اپنی جگہ پر متحد اور مربوط ہو۔ اس کا اظہار یقیناً ہمارے تمام مضامینِ تعلیم سے ہوتا ہے جن کا تعلق بیشتر انسان کی زندگی سے ہے۔ ہماری تمام ... پڑھنے اور لکھنے، گننے اور بولنے، حساب اور زبان سے متعلق خصوصیت سے گزر

ہوتی ہے اس لئے کہ وہ مجردات سے شروع کی جاتی ہے، جہاں پر اسے ختم ہونا چاہئے۔ اس
لئے یہ تدریس کے زندگی میں بہت کم دیرپا اثرات ہوتے ہیں۔

فروبل کے نزدیک مدرسہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں بچے کو زندگی کی اہم باتیں حقیقت کے لحاظ سے
سکھائی جائیں۔ آزاد شخصیت، ذمہ داری، کام کرنے کا حوصلہ، سبب اور نتیجہ کا تعلق اور اس قسم کی اہم باتیں
آنی چاہئیں، نہ صرف انہیں سیکھ کر بلکہ برت کر حاصل کرنی چاہئیں۔

وحدت کے بنیادی تصور کے مطابق مدرسہ کو ایک ایسا ادارہ ہونا چاہئے جس میں ہر بچہ خود اپنی
انفرادیت کو دریافت کرے، اپنی شخصیت کو ابھارے اور اپنے کام کے حوصلے اور کرنے کی قوت کو
نشوونما دے۔ یہ باتیں اسے ایسے لوگوں سے مل کر کرنی ہیں جو خود بھی اسی قسم کے کاموں میں لگے
ہوں، جہاں سب کی دلچسپیاں مشترک ہوں، سب مل کر ذمہ داری اٹھاتے ہوں اور اس کا
صلہ و انعام سب کو یکساں ملتا ہو۔ ایک دوسرے کی مدد کرنا ان کا مستقل محرک ہو۔ مدرسہ کو جس طرح
کر دینا ہے ایک وحدت بننا ہے، جس میں ترقی پذیر انفرادیت کی تمام وحدتیں دنیا کی زندگی میں شریک
ہو کر اپنی تکمیل کو پہنچتی ہیں۔ ایک مصنف کے قول کے مطابق

"اس کا کنڈر گارٹن یا مدرسہ ایک چھوٹی سی دنیا ہے، جہاں سب مل کر ذمہ داری اٹھاتے
ہیں، سب انفرادی حقوق کا احترام کرتے ہیں، سب میں برادرانہ ہمدردی کا جذبہ ہوتا ہے
اور سب ہنسی خوشی مل کر کام کرتے ہیں۔"[1]

غرض اشتراکِ عمل جو وحدت کا لازمہ ہے، وحدت کے اندر تنوع جو زندگی اور حقیقت کا قانون ہے، اس
مدرسہ کا بنیادی اصول ہے۔ مدرسہ ایک چھوٹا سا سماج بن جاتا ہے۔ تعلیم زندگی کا ایک جزو ہو جاتی ہے جو کسی
آگے کی تیاری نہیں بلکہ بذاتِ خود اس کا خلاصہ ہے۔

تدریس پھر تعلیم یا مدرسہ کے کام کے مرادف نہیں رہتی، یہ پھر ایک ایسے عمل کا ذریعہ بن جاتی

---

[1] ہیوز: فروبل کے تعلیمی قوانین، صفحہ ۱۷

...ساختہ عمل اور طبعی دل چسپیوں ... ہوتی ہے اور ہر علم کے کسی حقیقی استعمال اور...
ہار پر ختم ہوتی ہے جو تدریس کے ذریعہ دیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے کھیل کی اہمیت اس کے نزدیک
ہت زیادہ ہے جو بے ساختہ عمل اور بچہ کی طبعی دل چسپیوں کا سب سے بڑا مظہر ہوتا ہے۔ اس کے
یا اور مشغلوں میں ایک حصہ جہاں تعلیمی مشغلوں کا ہے، دوسرا حصہ مختلف کھیلوں سے تعلق رکھتا ہے۔

...یل کی اہمیت

...کے عملی کاموں پر فروبل کا جو سب سے گہرا اثر پڑا ہے، وہ تعلیم کی ابتدائی منزلوں میں کھیل
اہمیت ہے۔ کھیل کا تعلیمی فائدہ سب سے پہلے افلاطون نے بتایا تھا اور اس کے بعد قدیم مصریوں
ہاں اس کا پتہ ملتا ہے۔ اسی طرح تعلیم کی ساری تاریخ میں بالخصوص نشاۃ ثانیہ کے مصنفوں نے بھی
ں کا تذکرہ کیا ہے، اور فروبل کے کنڈر گارٹن سے پہلے کوئی نصف صدی سے یہ جرمنی میں ایک تعلیمی
ریک کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس تحریک میں زیادہ تر اس کی جسمانی حیثیت پر زور دیا جاتا تھا، لیکن فروبل
...آ کے ... اور اخلاقی معنی پہنا دیے ہیں۔

...چونکہ بچہ کا سب سے بے ساختہ عمل ہے، ابتدائی عمر میں یہ تعلیمی عمل کی ایک بہت بڑی بنیاد
جاتا ہے۔ چونکہ یہ بچہ کی طبعی دل چسپیوں سے براہ راست تعلق رکھتا ہے، اس لئے اس میں اس
...پوری صلاحیت ہوتی ہے کہ بچہ کے ان اعمال، جذبات اور خیالات کی بنیاد اس پر رکھی جائے
ماہرین تعلیم ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ کھیل ہے جس کے ذریعہ بچہ سب سے پہلے دنیا کو اپنے سامنے دیکھتا
۔ چنانچہ اس کھیل کے ذریعہ معلم زندگی کی وہ تفسیر جو وہ دینا چاہتا ہے، بچہ کے سامنے پیش کر سکتا
۔ اس کے ذریعہ نہایت خوبی کے ساتھ حقیقی معاشری تعلقات کی دنیا سے بچہ کو روشناس
سکتا ہے ... اور جذبۂ عمل پیدا کر سکتا ہے اور اسے ایک ایسا فرد بنا سکتا ہے جو اس
شری کل کا ایک جزو نظر آئے۔

...صرف نظری حیثیت سے کھیل کی تعلیمی اہمیت بتانے پر اکتفا نہیں کی بلکہ اپنے
...لات اس نے کنڈر گارٹن کی عملی شکل میں پیش کئے ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ کنڈر گارٹن میں کھیل

[illegible]ش یا اور دوسری آسان چیزوں سے بنا کر ظاہر کرے گا۔ اس طرح سے بچے میں خیالات پیدا ہوں [illegible]س کی قوت تخیل تیز ہوگی، ہاتھ اور آنکھ کی تربیت ہوگی، اعصاب میں ربط پیدا ہوگا، اصل [illegible]یار میں ظاہر کرنے کی کوشش سے اخلاقی فطرت مضبوط ہوگی اور احساسات میں ترقی ہوگی۔ اس طرح تعلیم کی ہمہ جہتی نشو و نما کا مقصد پورا ہو سکے گا۔ کنڈر گارٹن کے سامان تعلیم میں علاوہ گانوں کے، فروبل نے ایک سلسلہ "ہدایا اور مشغلوں" کا تیار کیا تھا۔ یہ ایک خاص تدریج اور ترتیب کے ساتھ استعمال کئے جاتے ہیں۔ جس وقت بچہ ایک 'ہدیہ' کے مواد سے یا اس پر مبنی 'مشغلوں' سے واقف ہو جاتا ہے، پھر اس کے بعد دوسرا شروع کرتا ہے، جو پہلے سے نکلتا ہے اور اس طرح ہر ایک سے نئے تاثرات پیدا ہوتے ہیں اور پرانوں کی تکرار ہوتی ہے۔ ان "ہدایا اور مشغلوں" میں عام طور سے جو فرق کیا جاتا ہے، وہ کسی خاص اصول پر مبنی نہیں ہیں۔ فروبل نے خود تمام کاموں کو 'مشغلے' کہا ہے اور ان کے سامان کو 'ہدایا'۔ لیکن بعد میں جب فروبل کے فلسفہ کے اصول مرتب ہونے لگے تو مواد یا سامان سے زیادہ مشغلوں پر زور دیا جانے لگا۔ اگرچہ فروبل نے اپنے تعلیمی اصولوں کو ان مقررہ شکلوں میں ترتیب دے کر تعلیم کی ایک بڑی خدمت انجام دی ہے، پھر بھی ان میں سے اکثر گانے اور مشغلے ایک زمانہ اور قوم کے لئے مخصوص نظر آتے ہیں، لیکن زمانہ اور حالات کے مطابق ان میں تبدیلیاں بھی ہو سکتی ہیں۔

کنڈر گارٹن کے سلسلے میں ایک بات اور بھی قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ اگرچہ فروبل کے انتقال سے قبل کئی ایک کنڈر گارٹن جرمنی کے مختلف حصوں میں قائم ہو چکے تھے، لیکن پرشیا کی حکومت کو ان میں نہ جانے کیا ایسی انقلابی روح نظر آئی کہ اس نے ان سب کو بند کر دیا۔ لیکن ایک شریف خاتون بیرونس برتھا ([illegible] Bertha B) کو اس سے ایسی دل چسپی پیدا ہوئی کہ وہ اپنے کام کو بند کرنے کی بجائے انگلستان اٹھا کر لے گئیں جہاں کی آزاد فضا میں اسے پھولنے پھلنے کا بہتر موقع ملا۔ سچ پوچھئے تو کنڈر گارٹن کے [illegible] مقبول بنانے میں ان خاتون کا بہت بڑا حصہ ہے۔ دس سال کے بعد اگرچہ حکومت نے اپنی [illegible] اٹھالی لیکن پھر بھی وہ پورے نظام تعلیم کا جزو نہ بن سکا۔

خواجہ غلام السیدین

مولانا آزاد بحیثیت ایک انسان کے

[illegible] سے زیادہ حیرت ناک کوئی ہستی نہیں ہے۔ فرشتوں سے زیادہ
نل اور حیوانوں سے [illegible] دنیا کی سب سے زیادہ پیچیدہ۔ Computer سے [illegible]
یدہ اور بے اندازہ امکانات کا مالک، بقول اقبال

ے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے — دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
د ترے بحر تخیل کے کنارے — پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیر خودی کر اثر آہِ رسا دیکھ

مولانا آزاد نے شعوری طور پر اور نہایت سلیقہ کے ساتھ اپنی خودی کی تعمیر کی تھی۔ وراثت
یرت اور دل و دماغ کا بیش بہا خزانہ پایا تھا، بزرگوں کی تربیت سے بہت کچھ حاصل کیا
ور پھر اپنی [illegible] اور انفرادیت کے طفیل ہر معاملہ میں اپنی ایک ذاتی راہ نکالی تھی اور
د وراثت اور تربیت کے اثرات قبول کرنے کے ان کو تمام و کمال اپنانے سے انکار کر دیا
[illegible] اپنے ہی بنائے راستوں پر چلتے رہے اور دوسروں کو ان پر چلنے کی تربیت دیتے
۔ ایمان کو بھی انھوں نے بطور ایک عطیہ خداداد کے نہیں پایا، بلکہ اس کے حصول کی راہ میں
شبہ کے [illegible] زاروں میں سے گذرے اور اس تک طلب، سعی اور فکر کی سخت
ہد اور آزمائشوں کے بعد پہونچے۔
سوچیے تو کیسا ہمہ گیر اور غیر معمولی انسان تھا یہ آزاد! میں بہت سے اسمائے صفت استعمال

کرکے اپنی تقریر کو بوجھل کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن تعجب ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ بنانے والے نے اپنی نعمتوں کی کس
[illegible] انداز کی تھی ان کی ذات میں۔ ایک نہایت جید عالم دین جس نے نہ صرف اپنے مذہب بلکہ مذاہب
عالم کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان میں نظر پیدا کر کے مذہب اسلام کی تعلیم کا ایک نیا تصور دنیا کے
سامنے پیش کیا تھا۔ یہ بجائے خود ایک عمر بھر کا کام تھا لیکن اِن کی گوناگوں شخصیت کا صرف ایک
پہلو تھا۔ انھوں نے ملک کی سیاسی جدوجہد میں ایک فیصلہ کن حصہ لیا اور قومی زندگی میں بہت
سے ایسے موڑ پیش آئے جس میں انھوں نے گاندھی جی اور نہرو کے دوش بدوش انقلابی قیادت
کا فرض انجام دیا۔ تیسری طرف ان کی تقریریں اور تحریریں اردو ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی
ہیں اور عرصہ دراز تک رہیں گی۔ وہ لفظوں کا جادو وہ عبارت کا دروبست، وہ فصاحت جو ابتدائی
دور میں شوکت الفاظ سے معمور کرتی تھی اور آخری دور میں اپنی سلاست اور زور بیان سے جادو
جگاتی تھی۔ پوری تحریر کو ضبط تحریر میں لائیں تو معلوم ہوگا کہ ادب عالیہ میں جگہ پانے کے قابل ہے۔

پھر کیا آپ کو ایک عالمِ دین، ایک صفِ اول کے سیاسی قائد اور ایک بلند پایہ ادیب سے
یہ توقع ہو سکتی ہے کہ اِس کو مثلاً علم موسیقی سے گہرا لگاؤ اور وسیع واقفیت ہوگی یا اِس کا ذوقِ جمال
اس قدر لطیف اور شگفتہ ہوگا کہ وہ قرآن شریف کی تفسیر میں بھی اِس پہلو کو اجاگر کر کے دکھائے
گا اور فیضانِ جمال کو خدا کی صفات عالیہ میں شمار کرے گا؟ یہ سب چیزیں بھی ان کی ذات میں
خوبصورتی کے ساتھ سمائی ہوئی تھیں۔ اور ان سب کا ذکر کرتے ہوئے اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ
کہیں یہ بات نہ بھول جائے کہ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت میں انھوں نے
محکمۂ تعلیم کے کاموں میں کس طرح ایک نئی وسعت اور گہرائی پیدا کی اور اِس میں بعض بالکل نئے
دروازے کھولے، جیسے ادب اور فنون لطیفہ کی اکیڈمیاں یا ثقافتی تعلقات کا [illegible]
[illegible] صدی میں ان کی فکر کی ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر بھی چند ہی ہستیاں نظر آتی ہیں
میں نے ابھی ان کی ذاتی خصوصیات کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ان کی ذات میں دو باتیں بہت
نمایاں تھیں۔ ایک اصول پرستی جس کا تقاضہ ہے کہ انسان جس بات کو صحیح سمجھے اس پر مضبوطی

ساتھ قائم رہے اور دوسری جرأت کا کسی خوف یا لالچ یا نام نہاد مصلحت سے متاثر نہ ہو۔ دراصل خوف
ان لوگوں پر طاری ہوتا ہے جن کا یا تو حساب صاف نہ ہو یا جو اپنے یقین اور اصول کی قیمت ادا …
تیار نہ ہوں۔ لیکن مولانا کا حساب زندگی ہمیشہ صاف رہا اور کبھی نہ خواہش انعام ہوئی نہ ستائش کی
۔ کوئی خطاب قبول نہیں کیا، سنتا ہوں کہ جب بھارت رتن نے دروازے پر دستک دی تو انہوں
دروازہ نہیں کھولا۔ وہ اعزازی ڈگریوں سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ مجھے ہدایت تھی کہ اگر کوئی ادارہ
عت ان کے نام پر کسی … کا نام رکھنا چاہے تو بغیر ان سے دریافت کئے …
ب …۔ میں نہیں چاہتا کہ جب تک میں وزیر تعلیم ہوں اس قسم کی کوئی چیز کی جائے!
ت کا یہ حال تھا کہ جب کبھی گاندھی جی یا جواہر لال سے اختلاف ہوتا تو اس کو کھلم کھلا ان کے سامنے
ہو ملی … خلاف ان لوگوں کے جو سامنے تائید اور پیٹھ پیچھے مخالفت کرتے
اصول پرستی کا ایک قصہ سن لیجئے، ایک صوبہ کی طرف سے پارلیمنٹ کے الکشن کے لئے ایک
وار کا نام بہت اصرار کے ساتھ پیش کیا گیا۔ ان کے پاس صوبہ کانگریس کمیٹی کی طرف سے وفد
ار اور ٹیلی فون آئے، ان کے اپنے ساتھیوں اور وزیروں نے سفارش کی لیکن پہاڑ اپنی جگہ
ہیں ہلا۔ اس شخص نے اناج کی ذخیرہ اندوزی کی اس وقت جب لوگ بھوکوں مر رہے تھے۔
ی طرح اس بات کے لئے آمادہ نہیں ہوں کہ اس کو کانگریس کا ٹکٹ دیا جائے۔" زندگی ایسی
ر صاف گزری کہ جب پیدا کرنے والے نے ان کو اپنے پاس بلا لیا تو بنک میں اتنا روپیہ نہ
موٹر خریدنے کے لئے حکومت سے جو رقم لی تھی اس کو ادا کیا جا سکے! میں نے بحیثیت ان
اسسٹنٹ سکریٹری اور سکریٹری کے آٹھ سال سے زیادہ ان کے ساتھ کام کیا اور انہوں نے کبھی
امیدوار کے تقرر یا ترقی کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی کوئی سفارش نہیں کی۔ "یہ تمہارا
کام ہے تم اصول کے مطابق فیصلہ کرو۔" دہلی آنے سے پہلے جب میں حکومت بمبئی میں مشیر تعلیم
… نے ایک عزیز کے بارے میں خط لکھا لیکن اس میں یہ بات بالکل واضح کر دی کہ اس معاملہ
… کے چیف منسٹر یا کسی وزیر یا حاکم سے سفارش نہ کی جائے۔ مولانا بالعموم بہت لئے دیئے

اور پھر ایک اور جگہ:

[illegible] میری کامرانی کا راز کیا ہے؟ میں اپنے دل کو مرنے [illegible] کی تڑپ کبھی دھیمی نہیں پڑے گی۔ میں جانتا ہوں کہ [illegible] اس میکدۂ خلوت کے دم سے ہیں۔ یہ اجڑا اور ساری دنیا اُجڑ گئی۔

[illegible] کہ دلِ زندہ تو نہ مرجائے کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

دیکھا آپ نے اس مردِ خدا کو، جس کی بدولت اس کی ذات کے [illegible] دنیاوی سرو سامان کے بغیر بھی غنی تھا۔ [illegible] اگر کرسیٔ وزارت یا کانگریس کی صدارت یا [illegible] دنیاوی اعزاز چھین لئے جاتے [illegible] وہ اتنا ہی بلند، اتنا ہی باوقار، اتنا ہی عہد آفریں ثابت ہوتا۔

[illegible] ہیں یہ لوگ سُن رکھو تم فسانہ ہیں یہ لوگ

کبھی کبھی دل میں یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے (کاش غلط ہو) کہ اب ایسے لوگ پیدا نہ ہوں گے، کم سے کم آسانی سے نہیں!

(بہ شکریہ اردو مجلس، آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی)

[illegible]

...شہر بیخ نمونہ نہیں ہے۔ مگر اس میں علمی [illegible] سی، مذہبی، تہذیبی موضو[illegible] حکیمانہ بلند آہنگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ایک جلال ہے جس میں دلبری وقاہری لیے ہوئے ہیں۔ اس کے پیچھے ایک پیمبرانہ انداز ہے جو حق اور باطل، سود و زیاں، نور و ظلمت، صراط مستقیم اور ضلالت کی نشاندہی کرتا جاتا ہے۔ الہلال مولانا کے تربیتی دور ([illegible]) کو ظاہر کرتا ہے، ترجمان القرآن کی پرواز کے لئے پر تولنے کے مترادف ہے۔ صحافت خطابت سے دامن نہیں بچا سکتی مگر سنجیدہ تصنیف میں خطابت بے جوڑ ہوتی ہے۔ ترجمان القرآن میں مولانا کی نثر کی دوسری منزل ملتی ہے جس میں علمی نثر نے ایک پرسوز تخیل کے سہارے شگفتگی پیدا کی ہے اور غزل کے شوخ اشعار کی مدد سے اپنی بات واضح کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمان القرآن کی پہلی جلد جو سورۂ فاتحہ کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ حکیمانہ نکتہ سنجی کے ساتھ کہیں کہیں شاعرانہ شوخی سے بھی کام لیتی ہے تاکہ حکمت بوجھ نہ معلوم ہو بلکہ باعث کشش نظر آئے ترجمان کی نثر کو ہم غالب کے درمیانی دور کی شاعری کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ غالب کی انفرادیت اس دور میں رنگ بہار ایجادی بیدل کی مرہون منت نہیں رہی، اس نے اپنی راہ پالی ہے۔ مولانا کی حکمت اب خطابت کے طوفان نہیں اٹھاتی، ہاں شعریت کی ہلکی سی موجیں ضرور پیدا کرتی ہے موضوع کی رعایت سے انداز بیان علمی ہے مگر اس میں علم کی خشکی نہیں ایک جمالیاتی حس ہے جس کی وجہ سے ایک رعنائی پیدا ہوگئی ہے۔ مفکر کو اظہار خیال کے لئے وسیع میدان ملا ہے، مگر مفکر ذوق جمال رکھتا ہے اس لئے فکر کے پہاڑ نہیں لڑھکاتا ہاں اس کی آب وتاب دکھاتا ہے۔ یہاں صحافت نہیں ہے کہ طوفانی کیفیت پیدا کرے، یہاں ازلی اور ابدی صداقتوں کی تشریح ہے جن کے لئے حکیمانہ اسلوب کی ضرورت ہے۔ مولانا آزاد نے اس طرح اردو نثر کو برگزیدگی عطا کی ہے۔ سجاد انصاری نے جب کہا تھا کہ اگر قرآن اردو میں اترتا تو اس کے لئے ابوالکلام کی نثر منتخب کی جاتی تو ان کا اشارہ اسی برگزیدگی کی طرف تھا

لیکن مولانا صرف مفکر یا خطیب یا صحافی ہی نہیں تھے۔ سیاست بھی ان کی زندگی میں بڑا
اہم درجہ رکھتی تھی بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شریک غالب تھی۔ سیاست [illegible] میں سرسید کی سیاست
کے خلاف جد و جہد میں مصروف رکھا۔ گر سرسید کے اسلوب کے [illegible] ان پر واضح کر دیئے۔
چنانچہ رام گڑھ کے خطبے میں ہی ہمیں ان کے اسلوب میں ایک اور ارتقائی مقام ملتا ہے جس سے
یہ بات [illegible] جاتی ہے کہ الہلال صرف اپنی خطابت کی وجہ سے مقبول نہیں ہوا تھا۔ [illegible]
ترجمان القرآن اپنی حکیمانہ نکتہ سنجی اور شگفتگی کی وجہ سے، بلکہ دونوں کے پیچھے ایک بیدار ذہن کی
روشنی، ایک پرسوز شخصیت کا گداز، ایک ہمہ گیر مزاج کا شعلۂ طور اور ایک مقدس آتش کی
ہی چنگاری تھی جسے خلوت کی تنہائیوں نے ہوا دی تھی اور جو ہجوم میں ان کی رفیق رہتی تھی۔
غبارِ خاطر کا [illegible] سفر سائی اس وجہ سے ان کے اسلوب کی ارتقائی شکل کو ظاہر کرتا ہے۔
[illegible] کی خلط [illegible] ناپنے کی ضرورت نہیں، اس میں وہ اصل اپنے گرد [illegible]
[illegible] تذکرے کی [illegible] ہے۔ آنا بھی ادب کی بحث ہو یا داستان بے ستون و کوہکن، چڑے چڑیا
کی کہانی ہو یا پھولوں کی بہار کا تذکرہ، موسیقی کے اثرات کی تفصیل ہو یا صلیبی معرکوں کی حکایتیں
[illegible] میں مولانا آزاد کا اسلوب ایک جوئے نغمہ خواں کی طرح ہے، مگر اس کی دلکشی اور دلآویزی
[illegible] سمجھنا ہے تو الہلال کے اسلوب کو ذہن میں رکھنا پڑے گا۔

جدید اردو نثر عربی اور فارسی سے جو کچھ لے سکتی تھی، وہ ابوالکلام نے لے لیا۔ عرب کے
[illegible] دروں اور عجم کے حسنِ طبیعت دونوں کو اردو میں سمو لینا۔ اور اردو کو عربی اور فارسی
[illegible] کلام نہ [illegible] معمولی کام نہیں ہے۔ مولانا آزاد کی نثر سے یہ کام ختم ہو گیا اور اقبال
[illegible] سے۔ اب اردو نثر کی ترقی کے لئے جو امکانات ہیں وہ عالمی ادب خصوصاً انگریزی
[illegible] مگر ابھی اردو نثر میں عربی اور فارسی کے اثرات جس طرح حل ہو گئے
[illegible] کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا پڑے گا۔ اس وجہ سے ابوالکلام آزاد کے جوش قدح سے بزم ادب
[illegible] چراغاں رہے گا۔ (بہ شکریہ اردو مجلس، آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی)

انور صدیقی

جدید شاعری کے کچھ مسائل

ہندستان کی زبانوں میں اردو حساس ترین زبان ہے (اس بات کے کہنے میں جو اعتماد ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ میں دوسری ملکی زبانوں سے براہ راست واقفیت نہیں رکھتا)۔ آج کا اردو ادب بہت سی حشر خیز تبدیلیوں سے دوچار ہے۔ تبدیلیاں پہلے بھی آئی ہیں مگر آج ان کی رفتار اور شدت کا عالم ہی دوسرا ہے۔ ہمارا پورا ادب اس وقت ایک زبردست تبدیلی کی گرفت میں ہے، یہ تبدیلی محض نئے پن کی تلاش کا نام نہیں ہے۔ اس کی پشت پر وہ کائناتی اور تہذیبی تصورات ہیں جو لمحہ بہ لمحہ بدل رہے ہیں۔ فرد اور سماج کے روایتی تصورات ٹوٹ رہے ہیں، زرعی تہذیب کے جمالیاتی تصورات اپنی تمام تر شادابیوں کے ساتھ رخصت ہو رہے ہیں اور ان کی جگہ صنعتی زندگی اپنی تمام تر پیچیدگیوں کے ساتھ اگر پورے طور پر سامنے نہیں آئی ہے تو رفتہ رفتہ سامنے ضرور آ رہی ہے۔ آدرشوں اور عقیدوں کی شکست و ریخت کا بے رحم عمل ہر طرف جاری ہے۔ خوابوں کے عظیم محل زمیں بوس ہو رہے ہیں۔ مشترک فکر و احساس کی ساری قدریں دم توڑ رہی ہیں۔ خارجی دنیا میں انسان کے پھیلنے اسے تہذیبی پیچیدگی بخشی ہے اور وہ اس پیچیدگی سے اکتا کر اپنے اندر کی پراسرار دنیا کو ملبس بن گیا ہے۔ یہ وہ صورت حال ہے جس کی عکاسی اردو کا نیا ادب کر رہا ہے اور وہ بھی اپنے مخصوص انداز اور لب و لہجے میں۔ یہ صورت حال کس قدر المناک ہے اس کا وہی لوگ اندازہ کر سکتے ہیں جن کی نظر میں مغربی تہذیب کے مرگ آفریں زوال کے سارے نقوش ہیں۔ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم آج اسی منزل کی طرف ترقی کے فریب کے سہارے چلے جا رہے ہیں اور ہمیں احساس بھی نہیں ہے کہ ہم ایک ایسے مقتل کی طرف جا رہے ہیں جہاں موت بھی اپنی گزشتہ منزل

...مفہوم سے محروم ہو چکی ہے۔ آج کے اردو ادیبوں نے جدید زندگی کے المیے کو کسی ... بڑی حد تک مغربی ادب اور فلسفے کی وساطت سے سمجھ لیا ہے۔ اس طرح ہمارا نیا شاعر ایک بین الاقوامی ... کا شاعر ہے۔ یہ ... مگر المناک صورت حال کا اظہار کیا ہے اور اس اظہار میں وہ اپنی فنی روایات سے کس حد تک وفادار رہے ہیں یا غیر وفادار ... طرز احساس میں ... جذبہ ... اظہار نہ تو سارے کا سارا مخلصانہ ہے اور نہ ہی غیر مخلصانہ۔ آپ کو اکثریت ایسی نظموں اور غزلوں کی ملے گی جن میں جذبہ بھی اکتسابی ہے اور طرز اظہار بھی۔ اور کہیں کہیں جذبے ... اس ... ہے کہ ناخوشگوار ابہام کا احساس ہونے لگتا ہے مگر یہ کہنا کہ جدید شعراء کی تمام ... بے معنی ہیں، بے بصری ہے۔ یہ صحیح کہ نئی شاعری اس عہد کے بیشتر لوگوں کے لئے ... مبہم ہوتی ہے۔ فرانس میں میلارمے، رمبو اور دوسرے علامت پسندوں کی شاعری ان کے ہم عصروں کے لئے مبہم سے زیادہ مہمل معلوم ہوتی تھی مگر آج کے پڑھنے والوں کے لئے ان کی شاعری اپنی تہہ داری کے باوجود بامعنی معلوم ہوتی ہے۔ انگلستان میں ایلیٹ کی شاعری کسی زمانے میں مشکل بھی تھی اور مبہم بھی۔ آج ایلیٹ کے رمز آشناؤں کی کمی نہیں۔ ہمارے ہاں نئی شاعری کے نام پر بہت کچھ خام اور ادھ کچری چیزیں سامنے آرہی ہیں۔ چونکانے اور سنسنی خیزی کا بھی رجحان ملے گا۔ ... تشدد کا بھی احساس ہوگا۔ یہ سب کچھ ہر ادبی رجحان یا تحریک کے اولین علمبرداروں میں ... ہے۔ حلقہ تحریک میں بھی ایسا ہوا ہے، ترقی پسند بھی اس کے شکار رہے ہیں، نئی شاعری ... ولی دکنی، میراجی اور حلقۂ ارباب ذوق کے دوسرے فنکاروں میں بھی کچھ اسی طرح کی افراط ... تفریط ملتی ہے۔ اگر نئے شعراء میں کچھ ایسے ہیں جو بے راہ رو ہیں تو ہمیں دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ راہ پر نہ آئیں گے تو زمانہ انہیں گرد فراموشی کا کفن پہنا دے گا۔

اردو کی نئی شاعری پچھلی شاعری سے کئی معنوں میں مختلف ہے۔ ہماری گزشتہ شاعری بالخصوص سرسید تحریک کے بعد سے) افادی نقطۂ نظر کی حامل رہی ہے۔ شاعری کی حیثیت وسیلے کی رہی ہے، اس سے کبھی اصلاح کا کام لیا گیا، کبھی انقلاب کا، کبھی کسی نظریے کے ہراول دستے...

سکا اور کبھی گرام سدھار کا۔ [illegible] اس کے علم بردار شاعری سے اس طرح کے کام لینے کے
قائل نہیں ہیں۔ وہ شاعری کو اس کا جائز منصب دلانا چاہتے ہیں، وہ [illegible] کی چاکری
[illegible] ذات کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی نظر میں شاعری اپنی لطیف ترین شکل میں
صرف اظہارِ ذات ہوتی ہے۔ یہ مسئلہ بحث طلب ہے کہ کیا اس طرح کے اظہار میں بالواسطہ طور پر ہی
دوسری سماجی اور تہذیبی صداقتوں کا اظہار نہیں ہو جاتا؟ دراصل نئی شاعری فرد پر زور دیتی ہے
اور اس کی شخصیت کو کائنات [illegible] تصور کرتی ہے۔ شاعری اسی کائنات اصغر کے وسیلے سے سب کچھ
سمجھنا اور سمجھانا چاہتی ہے۔ اس کائنات کے اپنے کرب، اپنے غم اور اپنے خواب ہوتے ہیں۔ خارجی
کائنات اس کائنات پر مسلسل چھاپہ مارتی رہتی ہے اور اسے اس کی انفرادیت سے محروم کرنے کے درپے
رہتی ہے اسی ٹکراؤ یا کشمکش سے شاعری جنم لیتی ہے۔ اسی وجہ سے آج کی مغربی شاعری پڑھ کر یہ محسوس
ہوتا ہے کہ شاعر ایک ایسے قلعے میں محصور ہے جس کے باہر نا آشنا فوجیں خیمہ زن ہیں۔ فرانسیسی
انحطاط پسند شاعر ورلین نے کہا تھا کہ "دنیا نے ہمیں جلاوطن کر دیا ہے اور اب ہم دنیا کو جلا وطن
کرتے ہیں۔" آج کا شاعر ہجوم کے فلسفوں خواہ جمہوری مساوات کا فلسفہ ہو یا پرولتاری طبقے کی آمریت
کا فلسفہ سب کو اپنی انفرادیت کے لئے ایک خطرہ سمجھتا ہے اسی لئے وہ سماجی پس منظر سے کٹ کر شعر گوئی
کرتا ہے اور اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ دوسرے اس کی کیفیات میں شریک ہوں۔ سوشلسٹ ملکوں کو چھوڑ کر
جہاں بھی آج شاعری ہو رہی ہے اس میں یہی ہجوم دشمن رجحان کار فرما ہے، یورپ میں پہلی جنگ عظیم
کے بعد سے ہی شاعری کی عوامی حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ وہاں اس رجحان کی مختلف سماجی اور تہذیبی وجوہات
ہیں) ایک روایت ہے جس کے فروغ میں علامت پسندی، پیکر پرستی، سوریلزم (Surrealism)،
[illegible] ([illegible]) جیسی تحریکوں یا رجحانوں کا ہاتھ ہے۔ اردو
میں اس طرح کے رویوں کی روایت ابھی بالکل نئی ہے اس وجہ سے ہمیں آج کی اردو شاعری کو پڑھ کر
الجھن محسوس ہوتی ہے اور ہم یا تو لعنت ملامت کرنے لگتے ہیں یا توبہ [illegible] نئی شاعری کے یہ
رجحانات دراصل ردِ عمل ہیں ترقی پسندی کی افادیت پرستی اور ادب کو سماج کے دستاویز کی حیثیت

ے دیکھنے کے رویے کے خلاف جس کے اقبال کی سطحی رجائیت بھی تھی اور اختر شیرانی کی نسل کی جاہی لیتی ہوئی رومانیت بھی۔ ابتدائی ردِ عمل میں توازن نہیں ہوتا۔ ہمارے نئے شعراء میں اپنے گزشتہ شعراء کو بہت کچھ کہہ سن گئے ہیں۔ کہیں کہیں ان کے لہجے میں زہرناکی اور تلخی بھی مگر کیا کیا جائے ہر ادبی نسل پرکھ کے کچھ نئے اصول لیکر آتی ہے اور جب پچھلے زمانے کا جائزہ لیتی ہے تو کچھ بت ٹوٹتے ہی ہیں۔ آج ہمارے شعراء کی نئی نسل جہاں ایک طرف سردار جعفری جیسے شعراء ہیں دوسری طرف اس نے میراجی کی بازیافت بھی کی ہے اور ان کے یہاں بہت سے ایسے عناصر بھی تلاش کیے ہیں جن سے ان کا ذہنی رشتہ ہے۔ انگلستان میں ایلیٹ اور یذرا پاؤنڈ کی نسل نے انیسویں صدی کے رومانی شعراء کے فنی، ذہنی، جذباتی اور جمالیاتی معیاروں کے خلاف بغاوت کی مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ سترھویں صدی کے ان شعراء کے احیاء میں معاون ثابت ہوئی جن کے موضوعات سخن مابعد الطبیعی تصورات ہوتے تھے اور جن کی الزبتھی شاعری سے بغاوت میں اس نے اپنی روح کی بغاوت کا عکس دیکھا۔

پرانے شعراء زندگی اور تہذیب سے ہم آہنگی کے نغمہ گر تھے، آج کے شاعر اس ہم آہنگی کی شکست کے نوحہ گر ہیں۔ پرانی صدیوں میں مذاہب اور سماجی تصورات کی وجہ سے عقائد کا اشتراک تھا۔ شاعر فکری نظام تہذیب یا سماج سے الگ نہ تھا۔ فنی اظہار کے سانچے مشترک تھے، علامتیں، تلمیحیں اور ے مشترک تھے۔ طرزِ احساس میں یکرنگی تھی۔ شاعر کے لئے سچائی کی تلاش کا کام مشکل نہ تھا۔ وہ رک عقائد کی بیساکھیوں پر چل سکتا تھا۔ وہ جو کچھ لکھتا یا کہتا تھا اس میں پوری تہذیب شریک ہوتی تھی ر علامتی ہوتا یا تمثیلی سب لوگ سمجھتے تھے۔ عظیم شاعری کے لئے ایسے دور ہمیشہ سازگار رہے ہیں۔ یں صدی کے انسان کا المیہ یہی ہے کہ عقائد کا وہ سرمایہ جس نے صدیوں تہذیبوں کی شیرازہ بندی جو نئے نظام ابھرے انہوں نے کچھ خواب تو دکھائے مگر جلد ہی ان کا جادو ٹوٹ گیا۔ وہ فرد کو اس کی انفرادیت نہ بخش سکے۔ نتیجے کے طور پر آج کا دور اپنی اجتماعی ن کا دور ہے۔ ہر فرد اپنے طور پر اپنی نجات کا طالب ہے۔ وہ اب ایسے

وسیلوں سے زندگی کو دیکھ بھی نہیں سکتا جو اس کی اپنی طینت وطبیعت کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ شخص ہم ایسا بن رہا ہے جس کے شعلوں کا رنگ بھی دوسرے کے جہنموں کے شعلوں کے رنگ سے الگ ہے، اس کے کرب کی نوعیت بھی دوسروں کے کرب سے مختلف ہے، اس کی بے کیفی دوسروں کی بے کیفی سے میل نہیں کھاتی۔ ایسا شخص اگر شاعر ہے تو وہ کیا کرے۔ اس کی روح کا کرب اظہار چاہتا ہے۔ وہ لفظوں کا سہارا لیتا ہے ایسے لفظوں کا جن کے دامن سے صدیوں کے تلازموں کی گرد [illegible] علامتوں کا سہارا لیتا ہے، مگر علامتوں کا بھی طویل ماضی ہے، ان کا بھی مانوس جہان معنی ہے۔ ایسے لفظوں اور ایسی نجیب الطرفین علامتوں کے استعمال کے بعد کیا شاعر کا تجربہ اپنی ابتدائی یا اولیں تازگی باقی رکھ سکتا ہے۔ کیا اس طرح اس کے محسوسات دوسروں کے محسوسات میں ضم نہ ہو جائیں گے؟ محسوسات یا تجربات کے ضم ہونے کے بعد شاعر کی انفرادیت کا کیا ہوگا۔ ان خطروں سے بچنے کی خاطر وہ اپنی علامتیں وضع کرتا ہے۔ مروجہ شعری زبان سے گریز کرتا ہے، اسی لئے جدید شاعری کی یہ تعریف بھی کی گئی ہے کہ یہ اپنی پہچان کو باقی رکھنے کی کربناک کوشش کا نام ہے۔ کرب ناک یوں کہ یہ بڑا ہی مشکل کام ہے اس میں ابلاغ کا بھی مسئلہ درپیش ہوتا ہے اور کرب ناک یوں بھی کہ ایک فرد دشمن تہذیب میں اپنی پہچان کو قائم رکھنے کی جدوجہد کرنا مصلوب ہونے سے کم نہیں ہے، اکثر اس کوشش کا انجام فرد کی تنہائی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نئی شاعری کی لے الیہ ہے۔ اس میں نہ تو پچھلی شاعری کی سرمستی ہے اور نہ سرشاری، نہ جمالیاتی کیف ہے نہ شادابی ___ اور پھر زندگی ہی میں یہ چیزیں کہاں رہ گئی ہیں؟

ہماری اپنی شاعری کا اب تک جو مزاج رہا ہے یا جس تمدنی مواد کا ہماری شاعری اظہار کرتی رہی ہے یا ہماری شعری علامتوں یا خیالی پیکروں کی جو فضا رہی ہے وہ جاگیردارانہ ماضی کے تناظر سے افسانہ وافسوں سے ہم کنار ہے۔ وہ صرف ایک مخصوص انداز کے جمالیاتی تجربے کے اظہار پر قادر رہی ہے۔ حسن کے اظہار کے لئے فارسی کے بعد غالباً اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو اپنے اندر بے شمار اسالیب رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کی فنی دروبست میں ایک طرح کا جیلا پن اور ہمواری

زندگی کے تاریک تر یا بدہیئت مظاہر کی [illegible] شعراء نے کوشش کی ہے تو
اس کے نتیجے میں بدہیئتی یا بدصورتی کے تاثر کے بجائے غیر متوقع طور پر حسن کا تاثر پیدا ہو گیا ہے۔ صنعتی
زندگی نے جہاں ایک طرف زندگی کو تزئین کی [illegible] دوسری طرف اس نے انسان کی زندگی کو
[illegible] سے انتہائی کھردرا [illegible] ویران بنا کر رکھ دیا ہے، خارجی زندگی کے مظاہر میں بھی
[illegible] اور تناسب [illegible] ہے جو ساختی عناصر تھا [illegible] شہروں میں جس طرح زندگی تنہا
بے کیف اور [illegible] ایسی نئی صورت حال ہے جس کی عکاسی یا اظہار کی
ذمہ داری نئے شعراء نے لی ہے۔ اظہار کے پرانے ڈھانچے یا اسالیب اپنے تمدنی مواد کی وجہ
سے نئے شاعر کا ساتھ نہیں دے پا رہے ہیں — وہ ایک نئی صورتِ حال کو نئی اور بعض حالات میں نجی
زبان کے ذریعے سے پیش کرنے کی کوشش میں مبتلا ہے۔ یہ کوشش ابھی ناتمام ہے اور اسی ناتمامی
کی وجہ سے [illegible] الجھنیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ پھر بھی نئے شعراء کی کوششوں کو دیکھ کر یہ اندازہ
ہوتا ہے کہ وہ ایک نئے اندازِ بیان کی تلاش میں ہیں۔

یہ بات فراموش کرنے کی نہیں کہ نئی شاعری ابھی تشکیلی مرحلے سے گزر رہی ہے، لسانی، فنی اور
[illegible]ری سطح پر بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کے حل میں وہ ابھی کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔ وہ ابھی منفی
ردعمل کا شکار ہے مثبت اقدار کی طرف اس کے قدم نہیں بڑھ سکے ہیں۔ ذات کی شاعری بھی بڑی
شاعری ہو سکتی ہے مگر اس کے لئے فن کار کو اپنی ذات کی توسیع کرنی ہوتی ہے، ہمارے شعراء اظہارِ ذات
کا کام انجام دے رہے ہیں مگر یہ ذات انتہائی شکست خوردہ، زخمی اور کچلی ہوئی ہے۔ بڑا فن کار
زندگی کی پیچیدگیوں سے دبتا نہیں وہ انھیں اپنے تخلیقی عمل کی مدد سے منظم کرتا ہے اور وحدت بخشتا
ہے۔ ہمارے نئے شعراء تہذیب کی پیچیدگی اور مزاج کو مناسب اور متوازن شکل دینے میں زیادہ
کامیاب نہیں ہو سکے ہیں بعض اوقات کچھ یوں محسوس ہوتا ہے گویا یہ شعراء اپنے آپ کو اور دنیا کو
بیمار سمجھ کر شعر کہہ رہے ہوں۔ اسی وجہ سے ہماری نئی شاعری میں ابھی تلخی، خود ترسی اور کلبیت
[illegible] فضا ملتی ہے [illegible] مغرب کی نئی شاعری میں بھی ابتداً کچھ اسی طرح کی اسپتالی فضا تھی مگر آج وہاں کی

Inner Strength پیدا ہو گئی ہے۔ تہذیبی بحران کی شاعری بڑی
[illegible] اس داخلی قوت کی حامل ہو جاتی جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے۔
[illegible] غالباً صرف ذہنی سطح پر عالمی شاعری کے بہت سے مفروضوں کو تسلیم کر لیا گیا
اس مفروضہ کی بنا پر کہ ہمارے ملک میں تہذیبی بحران کی وہی نوعیت ہے جو مغرب میں ہے ہندوستان
بھی آج بحران سے دوچار ہے اور اس بحران کے نقوش اور مظاہر بالکل وہی نہیں ہو سکتے
جیسے کہ یورپ میں ہیں۔ کاش ہمارے نئے شعراء اپنے ردعمل کی ہندوستانی نہج کو پوری فن کاری
کے ساتھ پیش کر سکیں۔

"میں کسی نئی ادبی تحریک کو اُس وقت تک عزت کی نظر سے نہیں دیکھتا جب تک اُس کے علمبردار
یہ دعویٰ نہ کریں کہ جو کچھ ان کے عہد میں لکھا جا رہا ہے وہ سب لغو اور بے قدر و قیمت
ہے اور جو کچھ ان سے پہلے لکھا گیا اس کا زیادہ تر حصہ لغو اور بے قدر و قیمت تھا"

—— اسپنڈر

"شاعر غیر وجود سے کشمکش میں مبتلا رہتا ہے اور اسے مجبور کرتا ہے
کہ وہ وجود کو جنم دے۔ ہم سکوت کے [illegible] دیتے ہیں تا کہ جواب
میں نغمہ سن سکیں۔"

—— اے، میک لیش

چاند نرائن رینہ آنند

غزل

[illegible] کی یہ زمیں باقی نہ تاروں کا جہاں باقی
جو کچھ باقی رہے گا تو رہے گا لامکاں باقی

[illegible] دل کی گئی لیکن ابھی بھی حسن [illegible] ہے
[illegible] آتش بجھ گئی لیکن ابھی تک ہے دھواں باقی

[illegible] ہے کاروانِ عشق گو اوجھل نگاہوں سے
ابھی ہے راہِ ہستی میں غبارِ کارواں باقی

جوانی ہی تو تھی روحِ رواں ایوانِ ہستی میں
مکیں جب ہو گیا رخصت تو کیوں ہو یہ مکاں باقی

وہ کیسا سوز تھا نم جس سے اب تک چشمِ عالم ہے
فغاں باقی نہیں لیکن ہے تاثیرِ فغاں باقی

جو ہو شاخِ تخیل پر نہیں ڈر اس کے مٹنے کا
ہزاروں جل گئے لیکن ہے میرا آشیاں باقی

رخِ فطرت سے پردے خود بخود سب اٹھ گئے لیکن
ابھی باریک سا ہے پردۂ چشمِ گماں باقی

[illegible] ہیں برسرِ پیکار دنیا کے حوادث سے
ابھی ہے چاند لیکن ایک مرگِ ناگہاں باقی

عبد اللطیف اعظمی

یوم شبلی — ایک رپوتاژ

ہم لوگوں میں — چاہے ہمارا کسی ادبی [illegible] سے یا کسی میدان زندگی سے تعلق ہو — یہ احساس [illegible] کہ ہم اپنے بزرگوں اور رہنماؤں کو بھلاتے جاتے ہیں۔ جن لوگوں نے ملک و قوم اور اردو زبان و ادب کی اہم خدمت انجام دی ہے اور جن کی زندگی سے ہمیں بہت کچھ روشنی مل سکتی ہے، ان میں ایک مولانا شبلی بھی ہیں، جن کو یاد رکھنے اور ان کی یاد منانے کی ضرورت ہے۔ شبلی پر تو خیر بہت کچھ لکھا گیا ہے، ان کی ایک مستقل یادگار — دارالمصنفین — ہے، جس کی وجہ سے کسی نہ کسی طرح اور کسی نہ کسی معیار پر ان کی یاد تازہ ہوتی رہتی ہے، مگر ان کے دور کے دوسرے بزرگوں اور مصنفوں کو تو ہم نے تقریب تقریب بالکل ہی بھلا دیا ہے۔ اس دور کی سب سے بڑی شخصیت سرسید کی ہے۔ ان کی شخصیت اتنی بڑی اور اہم ہے کہ ان کو بھلانا چاہیں تو بھی نہیں بھلا سکتے۔ مسلم یونیورسٹی میں ان کا ہر سال ۱۷ اکتوبر کو یوم ولادت منایا جاتا ہے اور کم از کم ہفتہ وار ہماری زبان میں اداریہ ضرور لکھا جاتا ہے اور جب تک انجمن ترقی اردو علی گڑھ میں ہے اور ہماری زبان کے مدیر پروفیسر سرور صاحب ہیں، امید ہے کہ یہ سلسلہ ضرور باقی رہے گا، البتہ علمی اور تصنیفی لحاظ سے ان کی جتنی عظیم یادگار کی ضرورت تھی، علی گڑھ والوں نے اس طرف توجہ نہیں کی، لیکن حالی پر بہت کم لکھا گیا اور ان کی مستقل کوئی یادگار نہیں ہے۔ مولانا نذیر احمد اور مولانا محمد حسین آزاد کا تو وہ اعتراف بھی نہیں کیا گیا جس کے وہ مستحق تھے اور چراغ علی کو تو موجودہ نسل کے بہت سے لوگ جانتے بھی نہ ہوں گے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اردو ادب کا ماضی سے رشتہ قائم رہے تو پابندی کے ساتھ ان کی یاد منانے کی کوئی صورت نکالنی

نے نہ صرف اپنی بلکہ علمائے اسلام کی قدر و منزلت کو بڑھایا اور قدیم علوم و فنون کے مرتبے کو اتنا اونچا کیا کہ پروفیسر آرنلڈ اور دوسرے انگریز پروفیسروں کو ان کی تحسین بلکہ تحصیل پر مجبور کر دیا [illegible] میں جبکہ کالج میں ہر طرف سے نئے علوم، نئے مسائل اور [illegible] ہی تھی، ایک مولانا ہی کا وجود تھا جو اس مسلسل بارش کے طوفان میں اسلامی علم و فن کے منارہ کو اس مضبوطی سے اپنی جگہ پر جمائے ہوئے تھے کہ ان کو اس طوفان خیز سیلاب سے کوئی خطرہ نہ رہا۔"

(حیات شبلی صفحہ ۱۴۸)

اس اقتباس کے بعد فاضل مضمون نگار نے فرمایا:

"شبلی کو علی گڑھ میں یہ مقام ان کی گوناں گوں صلاحیتوں کی بدولت حاصل ہوا۔ اس دور میں خیالات کو شعر کے پیراہن میں ظاہر کرنے کا خاص ذوق تھا۔ مولانا شبلی اس میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، نہایت اعلیٰ مذاق کے اشعار لکھتے تھے اور نہایت موثر لہجہ میں پڑھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ میں ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی، کالج کے ہر جلسے اور تقریب میں مولانا کی نظم اس کے پروگرام کا ضروری جزو ہوتی تھی۔"

شبلی کی وسیع تر سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے بعد فاضل مضمون نگار نے اپنے طویل مضمون کا خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا:

"مضمون کو ختم کرتے ہوئے میں کہوں گا کہ شبلی کو علی گڑھ کا بہترین انتخاب کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح شبلی کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کے سولہ سال جو علی گڑھ میں گذرے، وہ ان کی زندگی کے بہترین سال تھے۔ اس طرح دونوں کو وہ چیز ملی جس کی دونوں میں سے ہر ایک کو ضرورت تھی۔ شبلی نے علی گڑھ کے اوپر اسلام کی تاریخی اور علمی عظمت قائم کی، جس کا وہ اُس وقت بے حد محتاج تھا، اسی طرح علی گڑھ نے شبلی کو جدید عرفان دیا، جس کے نتیجے میں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز کے درمیان وہ

اسلامی شخصیت ابھر سکی، جس کو مولانا سید سلیمان ندوی نے "عہد جدید کا معلم اول" کہا ... [illegible] گڑھ کے دو مختلف دھاروں کا ملنا اس امتزاج کو وجود میں لا سکا جس نے اسلامی تاریخ پر اعلیٰ ترین کتابیں تخلیق کیں، جس نے دارالعلوم [illegible] کی بنیاد رکھی، جو دارالمصنفین کی شکل میں ظاہر ہوا [illegible] نے قوم کی اگلی نسلوں کو وہ ہیجان اور شعور دیا، جو آج بھی جدید پر قدیم کو غالب کرنے کی امانت اپنے سینوں میں لیے ہوئے ہے۔ زمانہ کی وقتی قدروں پر اسلام کی دائمی قدروں کو بالا کرنے کے لیے بے چین ہے۔ جس طرح علی گڑھ زندہ ہے اسی طرح شبلی بھی زندہ ہے اور دونوں پھر اسی طرح ایک دوسرے سے ملیں گے جس طرح وہ ماضی میں ملے تھے۔"

اس کے بعد راقم الحروف کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔ میں نے اس معذرت کے بعد کہ وقت کی تنگی اور اپنی غیر معمولی مصروفیت کی وجہ سے مضمون نہیں لکھ سکا، اعظمی اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کو یوم شبلی کے انعقاد پر مبارکباد دی اور اپنا غیر مشروط تعاون پیش کیا۔ میں نے عرض کیا کہ نہ تو میں اس کا قائل ہوں:

اس خطۂ اعظم گڈھ پہ مگر فیضان تجلّی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیّر اعظم ہوتا ہے
(اقبال سہیل)

جیسا کہ ایسوسی ایشن کے مطبوعہ ہینڈبل میں کہا گیا ہے اور نہ شبلی کی عظمت اور خدمات کے اعتراف کے لیے ان کے ہم عصروں کی تنقیص کو ضروری سمجھتا ہوں۔ اگرچہ میں نے اپنی کتاب "شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں" محمد حسین آزاد، حالی اور نذیر احمد دہلوی سے مقابلہ کر کے شبلی کا مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے، مگر یہ دور طالب علمی کے جوش کا نتیجہ ہے، اب اس طریقے کو اچھا نہیں سمجھتا۔ [illegible] یوم شبلی کے منتظمین کو مبارکباد دی کہ انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے ایک بڑے فرض کو

[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]

[illegible]

[illegible]

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے سرسید اور شبلی کے اختلافات کو بہت نمایاں کر کے پیش کیا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ [illegible] کے [illegible] کے عقائد اور دونوں کی طبیعتوں میں بڑا فرق تھا، مگر پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ اتنا فرق نہیں تھا جتنا مولانا سید سلیمان ندوی اور حضرت تھانوی [illegible] عالمانہ زندگی میں سرسید کی عظمت اور خدمت کا جس طرح اعتراف کیا [illegible] ساتھ مل کر جس طرح کام کیا ہے اور ان کی شخصیت سے جس قدر [illegible] ہیں اسے ہم ریاکاری اور مصلحت پرستی پر محمول نہیں کر سکتے۔ علی گڑھ اور سرسید سے شبلی کی اس غیر معمولی محبت، ان کے اس بے پایاں خلوص اور ان کے گہرے تعلقات کی بنا پر، علی گڑھ [illegible] کی خدمات کا جس قدر اور جس طرح اعتراف کرنا چاہیے تھا، نہیں کیا۔ آج یوم شبلی منا کر اس فرض کو ادا کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے وہ قابل صد مبارکباد ہے۔ امید ہے یہ سلسلہ مستقل [illegible] اور آئندہ اس سے بہتر طور پر یہ دن منایا جائے گا۔

میری تقریر کے بعد مولانا سعید اکبر آبادی صاحب نے بڑی پر جوش اور پر مغز تقریر کی۔ موصوف نے شبلی کی ہمہ گیری اور جامعیت بیان کرنے کے بعد، اس پر روشنی ڈالی کہ شبلی اور سرسید میں کیا چیز مشترک تھی۔ انھوں نے فرمایا کہ دونوں بزرگ دوسرے مسائل میں چاہے جو رائے بھی رکھتے ہوں، مگر "تطبیق پسندی" میں دونوں متفق تھے یعنی مسلمانوں کو بدلے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا کرنی چاہیے۔ انھوں نے اس وقت کے حالات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد نئے حالات پیدا ہوتے، تمام بنیادی قدریں بدل گئیں، اس انقلاب کا اثر پورے ملک پر پڑا، مگر مسلمان خاص طور پر متاثر ہوئے، یہ اثر اتنا شدید تھا کہ سرسید جیسا عزم و ہمت کا آدمی بھی مایوس اور بددل ہو گیا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ اپنے ملک سے ہجرت کر کے باہر چلا جائے۔ اس انقلاب کے بعد دو رجحانات بہت نمایاں تھے، ایک یہ کہ نئے حالات کو جوں کا توں قبول کر لیا جائے، دوسرا یہ کہ حالات سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے، مگر ان دو رجحانات کے علاوہ ایک تیسرا رجحان بھی تھا، وہ یہ کہ حالات کا جائزہ لے کر بنیادی قدروں کی حفاظت کی تدبیریں کی

گئیں۔ سرسید اور ان کے رفقاء تطبیق چاہتے تھے اور انقلاب کو اپنے لیے مفید بنانا چاہتے تھے تطبیق کی خواہش اور کوشش میں سرسید اور شبلی بنیادی طور پر ایک ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ سرسید بعض معاملات میں اپنے حدود سے تجاوز کر گئے اور شاید ایسا اس لیے ہوا کہ وہ انقلاب سے براہ راست دوچار ہوئے تھے اور ہمہ گیر تباہ کاریوں کو بچشم خود دیکھا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ملت کے احساس کمتری کو دور کر کے، ان میں حالات کے مقابلہ کا حوصلہ پیدا کیا جائے اور زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت اور جذبہ پیدا کیا جائے۔ افسوس کہ سرسید کا قدم جادۂ اعتدال سے کہیں کہیں ہٹ گیا اور تطبیق پیدا کرنے میں مرعوبیت کا شکار ہو گئے، خاص طور پر معاشرتی معاملات میں اور سرکاری ملازمت کے سلسلے میں۔ برخلاف اس کے شبلی ان مراحل سے نہیں گذرے تھے، جن سے سرسید کو گذرنا پڑا تھا، اس لیے شبلی کے احساسات اور جذبات وہ نہیں ہو سکتے تھے جو سرسید کے تھے۔ شبلی نے سرسید کے بنیادی مقاصد سے سو فیصدی اتفاق کیا، وہ نہ صرف سرسید کے موید بلکہ قدرداں تھے، مگر ان قدر دانیوں کے ساتھ شبلی مسلمانوں کی ثقافتی انفرادیت کے بھی قائل تھے، ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی نشأۃ ثانیہ مکمل طور پر صحت مند اسی وقت ہو سکتی ہے جب مسلمان قدیم ثقافت سے وابستہ رہتے ہوئے، نئے حالات کو قبول کریں۔ شبلی دراصل قدیم وجدید کے سنگم تھے اور دونوں کو ملانے کی انھوں نے مفید اور کامیاب کوشش کی، شبلی اور سرسید کے باہمی تعلقات اور روابط اتنے گہرے اور مضبوط تھے کہ ایک کی تعریف کرتے وقت دوسرے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، دونوں نے مل کر مسلمانوں کی خدمت کی ہے اور ہم دونوں کے یکساں طور پر مرہون منت ہیں۔

مولوی فضل الرحمن صاحب ندوی نے بھی ایک مختصر مگر دلچسپ تقریر کی تھی، میں ان کی تقریر کے نوٹ نہیں لے سکا تھا، اس لیے اس رپورتاژ کے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ آخر میں ایک ریسرچ اسکالر جناب شمسی طہرانی صاحب نے "شبلی اور سرسید" پر ایک پرجوش نظم پڑھ کر سنائی، نظم سے زیادہ ان کا لہجہ اور آواز پرجوش تھی۔ انھوں نے اس پر بہت زور دیا کہ انھوں نے یہ نظم علالت کی حالت میں کہی ہے، اس پر مولانا سعید اکبر آبادی صاحب نے فرمایا کہ آپ اکثر بیمار ہوا کریں تو اتنی پرجوش

نظم سننے کو مل جایا کرے گی۔ موصوف کی نظم بہت طویل ہے، اس لیے معذرت کے ساتھ صرف دو بند [illegible] پیش کرتا ہوں۔ پوری نظم آٹھ بند پر مشتمل ہے، دوسرا بند ملاحظہ ہو:

جب زندگی نگاہ سے محروم ہوگئی — جب بے حسی حیات کا مفہوم ہوگئی
گم ظلمتوں میں امتِ مرحوم ہوگئی — [illegible] دم ہوگئی
سید کو تجھ سا مردِ خود آگاہ مل گیا
[illegible]یت کا ذہن سے کانٹا نکل گیا

ساتویں بند میں [illegible] اس طرح خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے:

تا حشر جس سے ہوگا سرافراز علم و فن — بخشا ہے تو نے شعر و ادب کو وہ بانکپن
شبنم پہ جیسے صبح کے سورج کی ہو کرن — ہر شعبۂ حیات [illegible] ہے ضو فگن
ابھریں گے زندگی سے اشارے نئے نئے
ٹکرائیں گے نظر سے نظارے نئے نئے

بعض لوگ دوسروں کی اصلاح کے ایسے شائق اور خوگر ہوتے ہیں کہ موقع ہو یا نہ ہو، وہ اپنے مشورے ضرور پیش فرما دیتے ہیں۔ ایک صاحب نے، جو میرے پاس ہی بیٹھے تھے، فرمایا، نظر سے [illegible] تھا۔ میں سوالیہ نشان بن کر ان کی طرف متوجہ ہوا تو برجستہ فرمایا:

دیکھیں گے علم و فن کے نظارے نئے نئے

[illegible] پرجوش اور پراثر نظم کے بعد ایسوسی ایشن کے سکریٹری الطاف احمد صاحب اعظمی نے راہ کی مشکلات اور اپنے عزم و ثبات کا ذکر کیا اور آخر میں محمد نعمان خاں صاحب اعظمی نے مہمانوں اور حاضرین [illegible] کے ایٹ ہوم کا اعلان کیا۔

[illegible]رے سے لوگ اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو ان اسکولوں [illegible]۔ اگر ہمارا سماج ہماری
[illegible] اسکول مہیا نہیں کر سکتا [illegible] کوئی وجہ نہیں ہے کہ جو
لوگ اپنے بچوں کے لئے اچھی تعلیم چاہتے ہیں، انھیں ایسی تعلیم کا موقع نہ دیا جائے۔"

سہ لسانی [illegible] زبانوں کے مسئلہ کا واحد حل :

کیرالا کے [illegible] ایس نمبودری پد نے ابھی حال میں وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے ایک ملاقات کے دوران میں یہ کہا ہے کہ وہ ہندی بولنے والے لوگوں پر یہ زور دیں کہ وہ سہ لسانی فارمولا مان لیں اور اپنی ہٹ کو چھوڑ دیں۔ انھوں نے اخباری نمایندوں کو بیان دیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ زبان کے مسئلہ پر سمجھوتہ کی جو کوشش کی گئی تھی، اسے ہندی بولنے والے لوگوں نے اندر اندر ختم کر دیا۔ اگر وہ اپنی اس ضد پر قائم رہے تو مختلف ریاستوں کے درمیان آج جو رشتہ وحدت ہے، وہ ٹوٹ جائے گا اور ہندی بولنے والے لوگ ہمیشہ کے لئے پیچھے رہ جائیں گے۔ چیف منسٹر نے یہ بھی کہا کہ اگر ہندی والے دوسری علاقائی زبانوں کو بھی برابر کا درجہ دیتے، بجائے اس کے کہ ان پر ہندی تھوپیں، اور بین الاقوامی معاملات کے لئے انگریزی یا کسی اور غیر ملکی زبان کی ضرورت کو سمجھتے تو ہندی آج ہمارے ہندوستان میں ایک متحدہ زبان کی حیثیت سے رفتہ رفتہ تسلیم کر لی گئی ہوتی۔

تعلیم میں پلاننگ :

بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ دہلی میں ایک ادارہ ہے، جس کا موجودہ نام ایشین انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ منسٹریشن ہے اور اسے صرف نام ہی میں بڑا نہ سمجھئے بلکہ کام بھی اس کا بہت بڑا ہے۔ اس کے کام کی نوعیت کی تھوڑی سی تشریح اس کے موجودہ ڈایرکٹر جناب خواجہ غلام السیدین [illegible] جو انھوں نے اپنے ایک استقبالیہ میں ابھی حال میں ظاہر فرمائے ہیں، وہ

تعلیمی پلاننگ کے معاملے صرف ماہرین تعلیم کے ہاتھوں ہی صحیح اور مناسب طریقہ حل نہیں کئے

جاسکتے ہیں، بلکہ یہ ایک ایسا بڑا اور مشترک کام ہے جس میں بہت سے شعبوں، بہت سی وزارتوں اور ایجنسیوں کو، جن میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں ہی شامل ہیں، مل کر کام کرنا چاہئے اور یہ کام بہت خوشی اور ہمدردی سے ہونا چاہئے۔ ایک ایسا انتظامی اور مالیاتی نظام جس میں حصہ والے یا تو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہیں، یا پھر ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھتے ہوں، اس مقصد کے لئے کبھی مفید نہیں ہوسکتا ہے۔

یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اتفاق و اشتراکِ عمل کی یہ فضا خواہ یہاں یا دنیا کے کسی اور ملک میں پیدا ہوگئی ہے۔ اختلافات کی خلیج خواہ چھوٹی ہو یا بڑی لیکن ان کے درمیان آمد و رفت کے لئے پل بنانا ہی پڑے گا تاکہ انسانی ترقی کا کام ہوتا رہے۔ اختلافات میں اتحاد و یگانگت کی یہ تلاش بہت سے تخلیقی کاموں کا باعث رہی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پلاننگ اس قسم کا تخلیقی کام ہے، لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ جب تک اس کے مختلف اجزا میں اتفاق و اتحاد نہ ہوگا، اس وقت تک پلاننگ کبھی اپنی منزلِ مقصود کو نہیں پہنچ سکتی ہے۔ اچھا اب یہ دیکھنا ہے کہ اس کے مختلف اجزا کیا ہیں؟ اس کے لئے کوئی نمونہ نہیں بتایا جاسکتا ہے جو کسی ایک ملک میں موجود ہو، لیکن یہ ضرور ہے کہ تعلیمی پلاننگ میں تعلیمی کام کرنے والے کو سب سے پہلے پلاننگ کمیشن، اس کے بعد وزارتِ مالیات، پھر وزیرِ اعظم کے دفتر اور غالباً اس کے بعد پھر زراعت، صنعت اور دوسری وزارتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ پھر ہمیں سب سے زیادہ اس بات کا خیال کرنا ہے کہ ان وزارتوں اور محکموں سے تعاون حاصل ہو اور ان میں باہم اشتراکِ عمل ہوتا ہے ان چیزوں کی ہمارے قومی کاموں میں ابھی بہت ضرورت ہے۔ اس سیمینار میں زیادہ اسی پہلو پر بحث ہوگی۔

یونیورسٹی عوام کی تعلیم کے لئے:

یونیورسٹی کی تعلیم کا بڑا مقصد اب تک یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ ملک کی تہذیبی اور سماجی زندگی کی قیادت کے لئے اشخاص پیدا ہوں، لیکن یونیورسٹی کا یہ کام کہ وہ عوامی خدمات کے سلسلہ میں بھی کچھ کرسکتی ہے ہندوستان میں نسبتاً نیا خیال ہے۔ ایجوکیشن کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اس خیال

کو نہایت خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس [illegible] ہے کہ یونیورسٹی کی یہ تصویر کہ وہ علمار کی ایک [illegible] انجام دیتی ہے، ایک قصۂ ماضی بن کر رہ گئی ہے۔ وہ دیوار جو علما اور جہلا کے درمیان حدِ فاصل تھی، ٹوٹ کر گر چکی ہے اور اب یونیورسٹی اور عوام دونوں کی [illegible] پیدا ہو گیا ہے۔ کم سے کم ایک میدان ایسا ہے اور وہ عوام سے بے تعلیمی اور جہالت دور کرنے کا ہے، جہاں ہماری یونیورسٹیاں بہت کچھ کر سکتی ہیں، اور اس کام میں علاوہ حکومتوں کے [illegible] رضاکارانہ جماعتیں بھی مفید خدمات انجام دے سکتی ہیں۔ ان میں مستقل [illegible] تعلیم گاہوں کے لوگ بھی شامل ہیں، ان میں طلبا اور فارغ التحصیل لوگ لئے جا سکتے ہیں، غرض ملک میں اس کام کے لئے ایک عام مہم چلائی جا سکتی ہے، اس سلسلہ میں مہاراشٹر گاؤں والوں کی تعلیم کے لئے ایک مہم چلا کر بڑی اچھی راہ دکھائی ہے جو سب نوجوانوں کے لئے قابلِ تقلید ہو سکتی ہے۔ ہمارے ملک کی تقریباً تین چوتھائی آبادی یعنی وہ بالغ لوگ جنھیں رائے دینے کا حق دیا گیا ہے، بے پڑھی لکھی ہے اور زندگی کی ضروری معلومات اور واقفیتوں سے بے بہرہ ہے۔ اس لحاظ سے ملک کے اندر اس بے تعلیمی کو ختم کرنا ہمارا سب سے بڑا کام ہے جو ہماری یونیورسٹی اور کالجوں کے نوجوانوں کو کرنا ہے۔"

[illegible] ہیں جو ملک کے ایک مایۂ ناز اہلِ علم اور دہلی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر [illegible] نے ابھی حال میں شیواجی یونیورسٹی، کولہاپور کے کنووکیشن میں ظاہر [illegible]

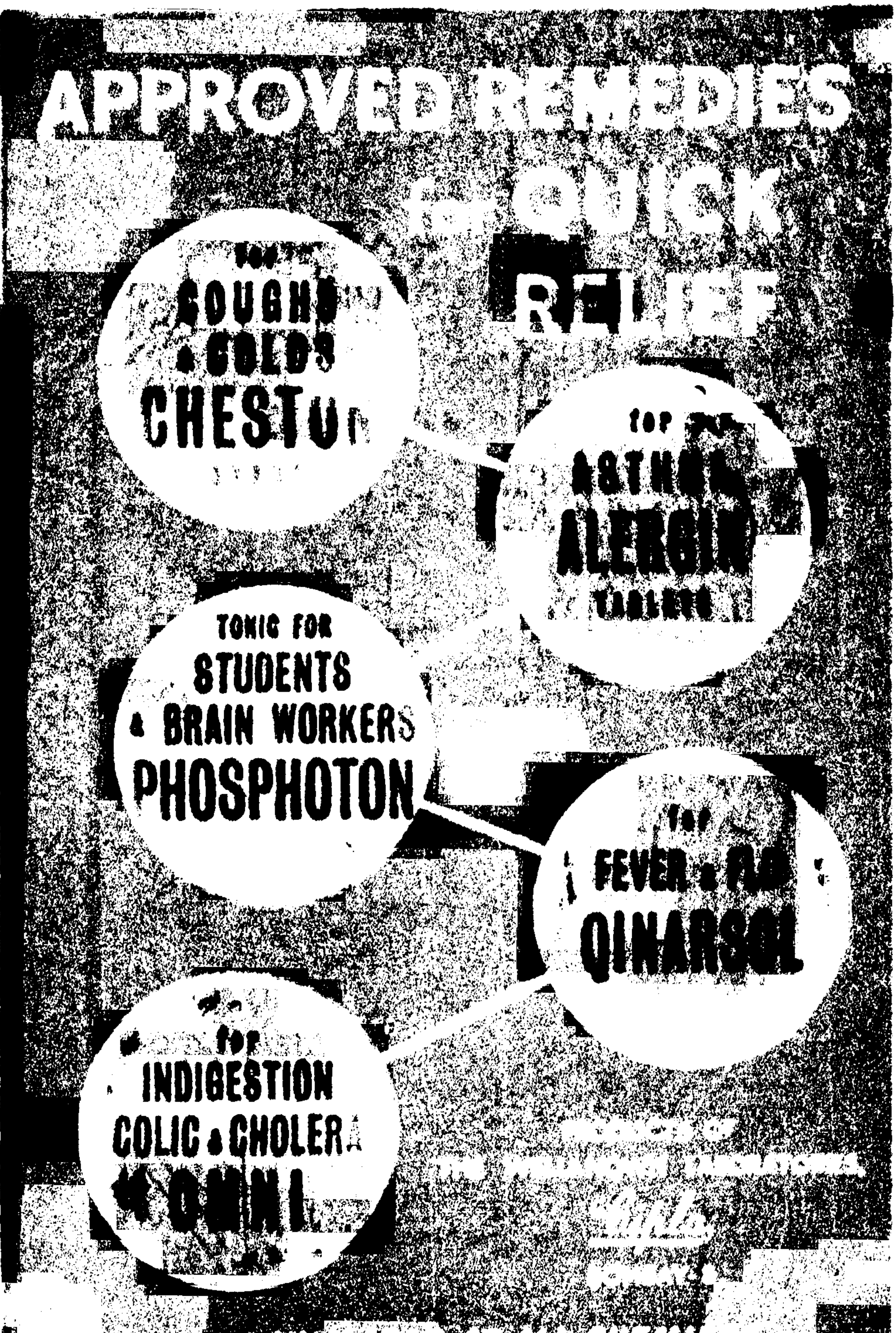


[illegible]

Regd. No. D - 769 April, 1968

The Monthly JAMIA

P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25



جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

[illegible]	[illegible]	۲۸۸
[illegible]	[illegible]	۷۸۸
[illegible]		
[illegible]	[illegible]	۸۵۸
[illegible]	[illegible]	۷۸۸
[illegible]		
[illegible]	[illegible]	۱۸۸
[illegible]	[illegible]	۲۸۸

[illegible]

۲۰۵	[illegible] ۷۸۶ [illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]

[illegible]

شذرات

[illegible] احساس بڑا قوی اور شدید ہوجاتا ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو ساتھ رہتے
صدیاں [illegible] زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کے میل جول سے مشترک زندگی کے رنگا رنگ مظاہر سامنے
آئے [illegible] روایتیں قائم ہوئیں، رسم ورواج اپنائے گئے، زبان اور تمدن پر ایک [illegible]
اثر پڑا، لیکن [illegible] اور پائدار انہام وتفہیم کا کوئی مستقل معیار آخر دونوں فرقوں کے درمیان [illegible]
نہیں قائم ہوسکا؟ ہمیں معلوم ہے کہ صوفیوں کے سلسلوں، اور بھکتی تحریک کے سادھو سنتوں نے من و تو
اور [illegible] کی مشغل سے گذر کر، اور انسانیت کو معیار قرار دے کر، روحانی اتحاد کے گیت
گائے اور ان کی کوششوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں بے شمار لوگ ایک دوسرے سے قریب آئے
لیکن یہ کیا بات ہے کہ تاریخ کے اہم فیصلوں کے وقت ہم مجموعی طور پر دونوں فرقوں کو ایک دوسرے
سے الگ تھلگ پاتے رہے ہیں؟ اس گتھی کو اگر ہم سلجھالیں تو شاید ہندو مسلم مسئلہ کے حل کی کوئی تدبیر نکل سکے۔

[illegible] مختلف جواب ہوسکتے ہیں، دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس کے مختلف اسباب بتائے جاسکتے
ہیں [illegible] نزدیک ایک اہم سبب یہ ہے کہ خالص ذہنی سطح پر مسلمانوں نے ہندو دھرم کو اور ہندوؤں
نے اسلام کو اس طرح نہیں سمجھا جیسا کہ اس کا حق تھا، بلاشبہ دونوں فرقوں میں ایسے منتخب افراد ملیں
گے [illegible] کوشش کی کہ وہ اپنے ہمسایے کے مذہب کو سمجھیں، لیکن ان کی تعداد بہت کم
ہے [illegible] جن کا پڑھا لکھا طبقہ صرف اسی حد تک ایک دوسرے سے واقف ہوسکا جتنا
[illegible] حالات کے تحت [illegible] تھا۔ ظاہر ہے کہ خالص ذہنی سطح پر افہام وتفہیم کے لئے محض افادی مصلحت [illegible]

سے کام نہیں چل سکتا، یاد رہے کہ اس سلسلے میں میں خالص ذہنی سطح پر زور دے رہا ہوں، ورنہ جہاں تک عوام کا تعلق ہے صدیوں سے ہندو مسلم ایک ساتھ رہتے آئے ہیں، ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک، شادی اور مسرت کے موقعوں پر باہم دگر دوست اور ساتھی، میلوں ٹھیلوں اور تہواروں میں ایک دوسرے کے دوش بدوش، لیکن کیا کہا جائے کہ یہی سادہ فطرت لوگ ضرورت پڑی تو مذہب کے نام پر بانٹ دئے گئے، اور انھیں کو جب متوسط طبقہ کے کسی شخص نے مذہب کا واسطہ دے کر پکارا تو وہ مذہب والے کے ساتھ چل پڑے، بارہا ایسا دیکھنے میں آچکا ہے اور اب بھی دیکھا جا سکتا ہے، قیادت تعلیم یافتہ طبقہ کے ہاتھوں میں رہی ہے اور میرا خیال ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے نے مجموعی طور پر ایک دوسرے کے مذہب اور اس کی بنیادی باتوں کے پیچھے جو روح ہے اس کو سمجھنے کی دیانتدارانہ کوشش نہیں کی۔

میرا یہ احساس پرانا ہے اور رہ رہ کر اس کی چبھن محسوس ہوتی رہی ہے، ابھی حال میں مولانا آزاد کے یہاں اسی طرح کا ایک احساس پاکر یہ خیال آیا کہ کیوں نہ اس مسئلہ کو قارئین جامعہ کے سامنے رکھا جائے، ہو سکتا ہے کہ کسی اور نے بھی اس مسئلہ پر غور و فکر کیا ہو، وہ اپنے نتیجۂ فکر سے ہم سب کو مطلع کر سکتا ہے۔ ذکر آزاد (مرتبہ مرحوم عبدالرزاق ملیح آبادی) میں صفحہ ۲۷۵ پر مولانا آزاد کی ایک تحریر (غالباً ۱۹۲۲ء کی) کا اقتباس ملاحظہ ہو: "دنیا کی تمام قوموں سے کہیں زیادہ ہندو مسلمانوں میں دائمی اور حقیقی اتحاد ہو سکتا ہے، بشرطیکہ باہم دگر غلط فہمیوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک دوسرے کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ مجھے نہایت رنج ہوتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ایک ہندوستانی انگلستان اور امریکہ کی تاریخ اور لٹریچر حفظ کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اس مذہب اور جماعت کو جاننے کی بالکل پروا نہیں کرتا جو صدیوں سے اُس کے ہمسایے میں موجود ہے۔" مجھے کس قدر حیرت ہوئی جب میں نے سر برندر ناتھ ٹیگور کا ایک آرٹیکل 'فلاسفی آف انڈین ہسٹری' دیکھا جو موڈرن ریویو میں نکلا تھا۔ اس میں وہ اس بات کی مثال دیتے ہوئے کہ مذہب کے بڑے آدمی بجائے خود معبود بن گئے ہیں، کرشن، مسیح اور چیتنیہ کے ساتھ محمدؐ کا بھی ذکر کرتے ہیں، یعنی کرشن

اور مسیح کی طرح محمدؐ بھی مسلمانوں میں معبود کی طرح پرستش کیے جاتے ہیں! میں نے کہا کہ ہندوستان کا عظیم الشان شاعر امریکہ کی سیاحت سے واپس آرہا ہے لیکن اسے ان لوگوں کا ایک مشہور عقیدہ بھی معلوم نہیں جو اس کے گھر میں بستے ہیں۔ مسلمانوں کے اعتقاد میں جو انسان محمدؐ یا کسی اور انسان کو معبود سمجھے، وہ مسلمان ہی باقی نہیں رہتا۔۔۔ اسی طرح جب میں بنکم چندر چٹرجی کے تاریخی ناول دیکھتا ہوں تو باوجود اس تعریف کے جو ان کے [illegible] ہے ہندوستان کی اسلامی تاریخ سے ان کی بے خبری پر متعجب ہو ہو کے رہ جاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کے مذہب اور تاریخ سے ایک ہندو اتنا ہی ناواقف ہے جتنا کہ ایک امریکی

یہ بات مجموعی طور پر مسلمانوں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے کہ وہ ہندوؤں کے مذہب اور تاریخ سے واقف نہیں ہیں [illegible]، غلط فہمیوں کی ایک بڑی وجہ ناواقفیت اور بے خبری ہوتی ہے، مجھے تو یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ مسلمان اپنے مذہب سے اور ہندو اپنے مذہب سے پوری واقفیت نہیں رکھتے، دونوں جماعتوں کے لوگ اپنے مذہب کی مشہور و معلوم سچائیوں ہی سے واقف ہو جائیں تو بگڑی بہت کچھ بن سکتی ہے، ہم ہندو اس لئے ہیں کہ یہ ہمارا موروثی مذہب ہے، ہم مسلمان اس لئے ہیں کہ ہم مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے، ہندو دھرم عالمگیر سچائیوں کے بارے میں کیا کہتا ہے اس سے ہم واقف نہیں، اسلام آفاقی صداقتوں کے بارے میں کیا سکھاتا ہے اس کی ہمیں جانکاری نہیں، ہاں، ہم اپنے موروثی مذہب کے نام پر کٹ مرنے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کیلئے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں، یہ زندگی کوئی اور زندگی ہو سکتی ہے مہذب اور سچے مذہبی آدمی کی زندگی نہیں ہوگی۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ مسلمانوں میں سوشل سروس (سماجی خدمت) کی کوئی مستحکم بالشان روایت کیوں نہیں [illegible] فسادات روکے نہیں رک رہے ہیں میں نے یہ دیکھا ہے کہ مسلمان شانتی سینا اور سروودے سماج کے کارکنوں کی طرف دیکھتے ہیں اور اس کے متمنی رہتے ہیں کہ حق کی آواز ان کی طرف سے بلند ہو، شانتی سینا او[ر] [illegible] کے رضا کار فساد زدہ علاقوں میں جاکر سماج سیوا کا کام کرتے ہیں، مظلوموں کی ڈھارس بندھاتے ہیں اور جو کچھ ہو سکتا ہے کرتے ہیں۔ لیکن کیا یہ پوچھنا غلط ہوگا کہ شانتی سینا اور سروودے سماج کے سیوکوں

کی صف میں کتنے مسلمان شامل ہیں ؟ کتنے مسلمان ہیں جو ونوبا جی کی تحریک میں شریک ہیں ؟ افسوس اور رنج کی بات ہے کہ جس جماعت میں اعمال صالحہ کو اس قدر ضروری قرار دیا گیا ہو، وہ عمل صالح کو محض انفرادی فعل سمجھ کر جی میں آئے تو کرے ورنہ آپ اپنی دنیا میں گمن رہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مسلمانوں کے یہاں اجتماعی اعمال صالحہ کی مثال نہیں، اسی ہندوستان میں صوفیا کی خانقاہیں اس کا مرکز رہی ہیں، اسی ملک کے قلب میں بیٹھ کر سلطان الاولیا حضرت نظام الدینؒ نے لازم عبادت کے مقابلہ میں متعدی عبادت کا مرتبہ بلند بتایا ہے، ہمارے شیوخ تن تنہا دور دراز اور اجنبی علاقوں میں جا کر ایک جگہ بیٹھ جاتے تھے اور خدمت خلق کے ذریعہ مرجع خلائق بن جاتے تھے، آج مسلمانوں کے یہاں یہ طریقہ نہیں ملتا، وہ خود اس پر عمل کیا کرتے اُن کے ساتھ بھی جانے کے لئے تیار نہیں جو اس طریقے کو اپنائے ہوئے ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ انھوں نے قرآن کریم کی ایک بہت بڑی بنیادی بات جو ایمان کے بعد اہمیت کے لحاظ سے اول درجہ پر ہے، بھلا دی ہے، اور وہ بات ہے عمل صالح، مجھ سے ایک مخلص سماجی کارکن نے بڑے دکھ سے کہا کہ فسادات کے وقت جب ہم لوگ فساد زدہ علاقوں میں جاتے ہیں تو مسلمان ہمارے ساتھ آجاتے ہیں، لیکن اس کے علاوہ کسی اور موقع پر اُن علاقوں میں ہماری موجودگی کی انھیں خبر نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صورت حال مسلمانوں کی پوری جماعت کے لئے باعث شرم ہے، اس سے بڑی غفلت اور بے حسی اور کیا ہو سکتی ہے؟ اِس ملک میں اگر زندہ اور خوددار جماعت کی حیثیت سے رہنا ہے تو اور باتوں کے علاوہ مسلمانوں کو بلا تفریق مذہب و ملت سماج سیوا کا کام کرنا چاہئے، انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی، ملک میں جو انجمنیں اور تنظیمیں اس طرح کا کام کر رہی ہیں اُن میں مسلمانوں کی خاصی تعداد ہونی چاہئے، انہام و تفہیم کے لئے فضا ہموار کرنے اور اپنا اعتبار قائم کرنے کے لئے مسلمانوں کو اس میدان میں بھی پیش قدمی کرنی ہوگی، اوروں کے لئے تو یہ محض وطنی اور انسانی فریضہ ہو سکتا ہے لیکن مسلمانوں کے لئے تو یہ وطنی، انسانی اور دینی فریضہ بھی ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد

مولانا شبلی نعمانی

مولانا شبلی ایک جامع حیثیات بزرگ تھے، وہ محقق، مورخ، ادیب، انشار پرداز، متکلم، شاعر، ماہر تعلیم سبھی کچھ تھے۔ اسی وجہ سے حقیقی معنوں میں وہ ایک عہد آفرین شخصیت تھے۔ سید سلیمان ندوی مرحوم نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ وہ عہد جدید کے معلم اول تھے۔ وہ قدیم وجدید کے ایسے سنگم تھے جن میں دو دریاؤں کے دھارے آکر ملتے تھے۔ وہ قدیم مذہبی رنگ کے عالم بھی تھے اور جدید علوم سے کسی حد تک آشنائی بھی رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کی شخصیت میں بڑا تنوع اور ان کے غیر معمولی اثرات میں ان کی شخصیت کی بوقلمونی کو بڑا دخل تھا۔

مولانا شبلی کثیر التصانیف بزرگ ہیں ان کی تصنیفات کے پیچھے ایک جذبہ کارفرما تھا۔ ان کے اکثر مطالعات مستشرقین کے اعتراضات کے جواب پر مشتمل ہیں جو انھوں نے اسلامی تاریخ وتمدن کے بعض اہم ابواب پر کئے تھے۔ یورپ میں اسلامی علوم کے پھیلنے کے منجملہ مقاصد کے ایک اہم مقصد یہ تھا کہ ان علوم میں مہارت حاصل کرنے کے بعد مستشرق اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ وتمدن کو ہدف اعتراض بنائیں۔ یہ کام بڑی تیزی کے ساتھ شروع ہوا اور عام تعلیم یافتہ نوجوان اس سے بہت جلد متاثر ہونے

یہ مضمون مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں فروری ۶۸ء میں 'یوم شبلی' کی ایک تقریب میں پڑھا گیا۔

لگے۔ خصوصاً وہ نوجوان جو یورپ کے تعلیم یافتہ تھے ان کو اپنی تاریخ میں طرح طرح کی
کمزوریاں نظر آنے لگیں۔ مولانا شبلی کو اس کا بڑی شدت سے احساس ہوا اور
انھوں نے اپنی پوری توجہ اسی طرف مبذول کی۔ ان کا قلم اسلامی علوم وفنون اور تاریخ
وتمدن کے دفاع میں پوری قوت کے ساتھ رواں ہوا اور اس طرح ان کی تحریروں کے ذریعہ
اسلامی تاریخ کے شاندار واقعات اور کارہائے نمایاں دنیا کے سامنے پیش ہوئے۔ ان
کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کی تاریخی وتمدنی عظمت اس طرح پیش کی جائے کہ قوم کے افسردہ
دلوں میں ازسرِ نو تازگی اور امنگ پیدا ہو۔ وہ ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کے خواہاں تھے جس میں
علماء کے ایسے گروہ ہوں جو اسلام کے نئے تقاضوں کو پورا کرتا رہے۔

یورپ میں اورینٹلزم (استشراق) کی بنیاد محض اخلاص پر نہ تھی بلکہ اس کا مقصد بڑی حد
تک سیاسی تھا۔ مشرقی علوم اور خصوصاً علوم اسلامی میں تخصص حاصل کر کے یورپی مستشرق اسلامی
تاریخ اور تمدن کے روشن چہرے کو اس طرح مسخ کرنا چاہتے تھے کہ خود مسلمانوں کو اپنے اسلاف
سے نفرت ہو جائے۔ اور یورپ کے کارناموں کے سامنے انھیں اپنے تمدنی مذہبی کارنامے
ہیچ نظر آئیں۔ اس طرح ان کا مذہب جو ان کی تمام تحریکات کی روح ہے جسد بے جان ہو جائے۔
اسی کے نتیجہ میں مستشرقین نے سرورِ کائناتؐ، خلفاء راشدینؓ، صحابۂ کرامؓ اور مسلمان سلاطین
کو اپنے اعتراض کا نشانہ بنایا۔ یہ مستشرقین یورپ کے فضلاء میں شمار ہوتے تھے وہ علمی تحقیقات
کے نام پر مسلمانوں کی کتابوں سے ایسا مواد نکالتے تھے جس سے ان کی مطلب برآری ہو سکے۔
عربی اور فارسی کی نادر کتابوں کی تلاش اور نہایت قیمتی مواد فراہم کرتے اور ان سے اسلام اور اسلامی
روایت کی بیخ کنی کرتے۔ ان حریفوں کے مقابلے میں مولانا شبلی نے بڑی قوت سے
صف آرائی کی۔ انھوں نے جواب میں وہی طریق استدلال اختیار کیا جو اہل یورپ کا تھا
جزیہ پر مولانا نے جس طرح کی تحقیق کی اس سے تمام معترضین کی زبان بندی ہو گئی۔ ان کی
تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جزیہ قتل کا نہیں بلکہ نصرت کا معاوضہ ہے یعنی اسلامی

ملکوں میں ان غیر مسلموں سے جو فوج میں بھرتی نہیں ہوتے تھے اس لئے ٹیکس وصول کیا جاتا تھا کہ وہ ان کی فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے [illegible] جب خلفائے راشدین [illegible] میں غیر مسلموں نے فوجی خدمت ادا کرنے پر رضامندی [illegible] سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے [illegible] ان کا کتابچہ "حقوق الذمیین" اس بات کو پایہ تحقیق تک پہنچاتا ہے کہ اسلام [illegible] [illegible] عدل و انصاف پر مبنی ہیں۔ عیسائیوں نے [illegible] [illegible] یہ قایم کیا تھا کہ انھوں نے اسکندریہ کا کتب خانہ جلا کر خاک کر دیا۔ مولانا کی تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی کہ یہ الزام سراسر بے بنیاد ہے۔ بلکہ اس مشہور کتب خانے کو عیسائیوں ہی نے صدیوں پہلے برباد کر دیا تھا۔ اسلامی طرز حکومت کی صحیح تصویر کے لئے مولانا نے [illegible] کی حیات مبارکہ کا انتخاب کیا اور انھوں نے اپنی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی سے یہ [illegible] دل پسند طور پر کھینچی۔ "الفاروق" اسلام کے سیاسی اور اقتصادی نظام کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔

مولانا بحیثیت مصنف کے ایک مجدد کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی کوئی کتاب ایسی نہیں جس پر کسی کی نقالی کا الزام عاید کیا جا سکے۔ وہ تحقیق کی موشگافیوں سے واقف تھے اور استدلال [illegible] ایجاد کرتے تھے۔ ان کے قلم نے اسلامی موضوعات کو جس طرح سے روشناس کرایا ہے ہندوستان میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ بلکہ بعض اعتبار سے یہ کہنا درست ہوگا کہ شاید عالم اسلام میں بھی وہ اپنی بعض منفرد خصوصیات کی وجہ سے سب سے ممتاز نظر آئیں۔

مولانا کی ہر تصنیف اپنی جگہ ایک کارنامہ ہے اور وہ ان کے شہرت دوام کی ضامن ہے۔ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم، المامون، سیرت النعمان، سفرنامہ، الفاروق، الغزالی، علم الکلام، [illegible] موازنۂ انیس و دبیر، شعر العجم، اورنگ زیب عالمگیر، سیرت النبی۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر ایسی گرانقدر تصنیف ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ اتنے متنوع موضوعات پر مولانا نے جس طرح سے قلم اٹھایا ہے کسی نے نہ اٹھایا ہوگا اور پھر ان میں جس طرح سے داد تحقیق

دی وہ انھیں کا حصہ ہے۔ وہ اپنی تصنیف کے اعتبار سے علم کے ایسے روشن منارے ہیں جس سے صدیوں تک رہروانِ منزل کو رہنمائی ہوتی رہے گی اور حق یہ ہے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمِ اسلام اور اہلِ یورپ نے مولانا کی اس حیثیت کو تسلیم کیا ہے، ان کی کتابوں کے ترجمے جو مختلف زبانوں میں ہوئے ہیں وہ اسی کا اعتراف ہے، ان تصانیف سے اردو ادب کا دامن مالا مال ہوا اور مولانا کی وجہ سے اردو زبان اس درجے تک پہنچی ہے کہ اب بڑے اعتماد کے ساتھ اس بات کا اعلان کیا جاسکتا ہے کہ اردو اسلامی علوم کے اعتبار سے عربی، فارسی اور ترکی سے ہرگز پیچھے نہیں۔

مولانا نے اردو زبان و ادب کی جس طرح خدمت کی ہے اس کا صحیح احساس اب تک لوگوں کو نہیں ہو سکا ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایک بڑے درجے کے انشاء پرداز ادیب اور نقاد تھے اور اسی اعتبار سے ان کی کتابیں اعلیٰ درجے کے نصاب میں شامل کی جاتی ہیں، موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم اردو اور فارسی کے اعلیٰ نصاب کی متداول ترین کتابیں ہیں۔ لیکن یہ تصویر کا محض ایک رخ ہے، دوسرا رخ عالمی اقدار کا حامل ہے وہ یہ ہے کہ مولانا نے اردو میں اسلامی تاریخ و تمدن پر اتنا زیادہ مواد اکٹھا کر دیا ہے کہ اردو زبان بجا طور پر اسلامی علوم کی زبان متصور ہو سکتی ہے۔ عام طور پر اسلامی زبانیں تین سمجھی جاتی ہیں۔ عربی، فارسی اور ترکی۔ ان کے اسلامی قرار دیئے جانے کی وجہ محض یہ نہیں کہ اکثر مسلمانوں کی یہی زبانیں ہیں، بلکہ یہ کہ اسلامی علوم و فنون کے ذخائر کی اجارہ داری انھیں کے حصے میں آئی ہے۔ اسی اصول کے پیشِ نظر اردو بھی انھیں کے ذیل میں آتی ہے۔

مولانا کی عہد آفریں شخصیت، علم کی اس روایت کو جس کے ذریعے بڑے معرکے سر ہوئے جاری کیونکر رکھتی۔ انھوں نے صحیح طور پر محسوس کیا کہ وہ اپنے بعد علماء کا ایسا گروہ چھوڑ جائیں جس کے ذریعہ زمانہ مابعد میں اسلام کے نئے نئے تقاضے پورے ہوتے رہیں اس کو انھوں نے اپنی زندگی کا اہم مقصد قرار دیا۔ ندوۃ العلماء کا استحکام، دار المصنفین

کی تشکیل اسی مقصد کے پیشِ نظر عمل میں آئی۔ ندوہ کے ذریعہ علمار جدید تقاضوں سے آشنا ہوئے، اور بحمد اللہ یہ سلسلہ جاری [illegible] اس ادارہ نے اپنے [illegible] پیدا کئے [illegible] مولانا کی روایت کو [illegible] ب کے ساتھ قایم رکھا۔ سید سلیمان ندوی مرحوم کی [illegible] تاریخ سے [illegible] کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے علمی وعملی کارنامے دنیائے اسلام کو جس طرح متاثر کئے ہوئے ہیں وہ ہر شخص پر بخوبی روشن [illegible] یات پر بجا طور پر فخر ہوسکتا ہے۔

[illegible] ہندوستان کی وہ اکیڈمی ہے جس نے اسلامی تاریخ اور علوم پر ایسے [illegible] ہیں جو اپنی کمیت وکیفیت دونوں اعتبار سے بے نظیر ہیں۔ مولانا نے اسلامی تاریخ [illegible] کا جو خاکہ اپنے ذہن میں کھینچا تھا اور جس کے نمونے خود ان کی حیات میں سامنے [illegible]۔ اس کی تکمیل ان کی وفات کے بعد ان کے عزیز شاگردوں اور ندوہ کے سپوتوں کے ذریعہ ہوتی رہی ہے۔ سیرت نبوی، سیرت صحابہ، صحابیات، تابعین وتبع تابعین تاریخ اسلام وغیرہ کے جو سلسلے دار المصنفین نے شائع کئے وہ ایسی گرانقدر تصانیف ہیں کہ ان سے تاریخ اسلامی کے نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ ہندوستان کو اس ادارے پر بجا طور پر فخر ہوسکتا ہے۔ دار المصنفین کے علمی رسالہ 'معارف' نے علمی وتحقیقی دنیا میں جو شہرت حاصل کی وہ ہر شخص پر منکشف نہیں۔ آج بھی وہ رسالہ اس پابندی کے ساتھ نکلتا ہے جس طرح نصف قرن پہلے نکلتا [illegible] کی اہم ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ اس رسالے میں جتنے اہم موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے اس اعتبار سے ہندوستان، پاکستان، افغانستان اور ایران کا کوئی رسالہ اس کی برابری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔

مولانا شبلی بڑی باکمال شخصیت کے حامل تھے ان کے کارنامے نہایت شاندار اور [illegible] ہیں۔ اسلامی تمدن اور اسلامی تاریخ پر ان کا بڑا احسان ہے۔ ان کی بہترین یادگار یہ ہے کہ ہم ان کی روایت کو آگے بڑھائیں اور جن اداروں کے ذریعہ ان روایات

کو تقویت پہنچتی ہے ان کو تقویت پہنچائیں۔ دارالمصنفین ان کا محبوب ادارہ ہے، وہ جو خدمت انجام دے رہا ہے لائق صد ستائش ہے لیکن اسلامی علوم کے شناسا روز بروز کم ہوتے جاتے ہیں اور ہم اپنی تہذیب سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے دور میں اچھے اور ذہین لوگ ان علوم کی طرف کم متوجہ ہوتے ہیں۔ کیا یہ افسوس کا مقام نہیں۔ ایسے حالات میں جب اندیشہ ہے کہ شبلی کی شاندار روایت زیادہ دیر تک قایم نہیں رکھی جا سکتی۔ اس لئے ہم پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ اس ضرورت کا احساس کریں اور یہ سمجھیں کہ اسلامی تہذیب اور اقدار کی بالکل اسی طرح ضرورت ہے جس طرح سائنسی اقدار کی، ان دونوں میں صحیح طور پر ہم آہنگی ہونی چاہئے اگر ہم آہنگی نہیں ہوگی تو ہم ان اعلیٰ اقدار سے محروم ہو جائیں گے جو ہماری روایت کا شاندار اور قابل فخر کارنامہ ہے۔ عزت و احترام کے لحاظ سے اسلامی تہذیب کے خدمتگار کسی طرح پیچھے نہیں۔ مولانا شبلی، سید سلیمان ندوی، ابو الحسن ندوی اور ان کی طرح کے لوگ جس شہرت اور اہمیت کے مالک ہیں وہ کسی پر چھپی نہیں ہے۔ آج بھی شبلی اور سید سلیمان ندوی پیدا ہو سکتے ہیں لیکن قوم و ملت میں اس کا احساس پیدا ہو کہ یہ علوم ضمنی توجہ سے زندہ نہیں رہ سکتے، ان کا بھی اپنا مقام ہے، ان کی بھی اپنی حیثیت ہے۔ اگر یہ احساس قوم میں پیدا ہو جائے تو یقیناً ہماری درسگاہیں پھر چمک سکتی ہیں اور اسلامی علوم کے سچے سپوت پیدا کر سکتی ہیں۔

آج اسلام اور اسلامی علوم پر پہلے سے زیادہ یورش ہے۔ اسلامی تاریخ و تمدن کا مطالعہ اس وقت یہودیت اپنا اولین مقصد قرار دے چکی ہے۔ ہزاروں یہودی فضلا جو علوم مغربی و مشرقی کے منتہی ہیں، اپنے زبردست وسائل سے ایسے ایسے مواد فراہم کر رہے ہیں جو ہماری دسترس میں نہیں ہیں، ان میں اسرائیل کے علاوہ یورپ اور امریکا کے فضلا بھی شامل ہیں ان میں سے بعض اسلامی تاریخ کے سلسلہ میں ایسے مواد کو سامنے لانے کی کوشش کر رہے ہیں جن سے اسلام اور اسلامی تاریخ کی تابناکی مدھم ہو جائے۔ اس لئے اس وقت اور بھی ضرورت ہے کہ ہمارے ذہین لوگ اس طرف بطور خاص متوجہ ہوں، ایک طرف اسلام اور اسلامی

علوم و تاریخ کا مطالعہ کریں تو دوسری طرف اسرائیلیت اور عیسائیت کو اپنا موضوع تحقیق بنائیں
[illegible] سامی اور دوسری متعلقہ زبانیں اور ان کے علوم کا فکر [illegible] لیکن یہ کام کسی
[illegible] آدمی کے کرنے کا نہیں، [illegible] کا کام ہے۔ قوم و ملت کا فرض ہے کہ وقت کے
ان اہم تقاضوں کے پیش نظر اعلیٰ درجے کے تحقیقاتی ادارے قایم کرے جن میں ملت کے
بہترین افراد اسلام اور اسلامی تاریخ کے دفاع میں اپنی صلاحیتوں کا استعمال کریں۔ اس
طرح کے [illegible] کی غرض ہوگی اور وقت کی اہم ضرورت بھی پوری
ہوگی۔

ڈاکٹر مشیر الحق

کالی قومیت : تاریخ اور پس منظر

امریکہ کے تقریباً ۱۲ ملین (ایک کروڑ ۲۰ لاکھ) حبشی النسل مرد اور عورتیں اگرچہ وہاں کے دستور کے مطابق دوسرے امریکی شہریوں کے برابر ہیں، لیکن صدہا برس کی غلامی کے باعث ان کی بہت بڑی اکثریت ساجی اور معاشی حیثیت سے دورِ غلامی سے بہتر زندگی نہیں گذار رہی ہے۔ اگرچہ روز بروز بڑھتی ہوئی تعلیم ان میں یہ احساس پیدا کرتی جاتی ہے کہ انھیں ساجی اور معاشی حیثیت سے سفید فام امریکیوں سے اگر بلند نہیں تو کم از کم ان کے برابر ضرور ہونا ہے۔ اس مقصد کے لئے امریکہ میں حبشیوں کی مختلف انجمنیں اور جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ ایسی تمام جماعتیں اس بات پر تو متفق ہیں کہ انھیں سیاہ فام امریکیوں کے مفاد کے لئے کام کرنا ہے، لیکن وہ مفاد ہے کیا، اور اسے کس طرح حاصل کیا جائے، اس پر شدید اختلاف ہے۔

"حبشی مفاد" کو سمجھنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے ان کے موجودہ ساجی طبقات پر ایک نظر ڈالنی پڑے گی۔ ۱۹ویں صدی ہی سے شمالی امریکہ میں بسنے والے سفید فام لوگوں کو سیاسی دور اندیشی کی وجہ سے اس علاقے کے حبشیوں میں تعلیم اور روزگار میں آزادانہ مقاومت کی وجہ سے ایک ایسا طبقہ پیدا ہونے لگا تھا جو ۲۰ویں صدی تک پہونچتے پہونچتے جسمانی طور سے کالا ضرور تھا لیکن طرزِ رہائش اور انداز و گفتار میں سفید ساج کا ایک حصہ بن جانے کو اپنا مطمحِ نظر سمجھتا تھا۔ اس طبقہ کے کی نظر میں حبشی مفاد کا حصول سیاہ اور سفید ساج کے ادغام پر تھا۔ لیکن درحقیقت یہ سفید اور سیاہ ساج کا نہیں بلکہ سفید ساج میں سیاہ ساج کا ادغام تھا۔ اس

[illegible] کا نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم یافتہ اور معاشی حالت [illegible] کا یہ طبقہ خود اپنی ذات سے ایک نیا سماج بن گیا، جسے سفید سماج پوری طرح [illegible] اپنانے پر تیار نہیں تھا اور خود اپنے پس ماندہ [illegible] سے یہ طبقہ ملنے کو [illegible] ہمنشینوں میں معاشی اور سماجی حیثیت سے (اعلیٰ طبقہ کے وجہ [illegible] طبقہ تو پیدا ہو گیا لیکن کالے سماج کی بھاری اکثریت زندگی کی [illegible]

[illegible] ویں صدی کے شروع میں اِکا دُکا طریقے سے کچھ ایسی تحریکیں بھی ابھریں جن کا پورا زور سفید میں سیاہ کو مدغم کرنے کے بجائے "سیاہ قومیت" کی انفرادیت پر تھا۔ یہ تحریکیں اس بات کی مدعی تھیں کہ سفید اور سیاہ میں نہ تو کبھی کوئی وجہ مماثلت [illegible] میں یہ امید کی جا سکتی ہے کہ سفید سماج بطیب خاطر سیاہ سماج کو برابری [illegible]۔ اس تحریک کے لیڈروں کے لئے سب سے بنیادی بات یہ تھی کہ وہ ان نقاط کی نشاندہی کریں جو سفید اور سیاہ سماج کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے بجائے ایک دوسرے کے بالمقابل مدعیانہ حیثیت سے کھڑا کر سکیں، کیونکہ اس کے بغیر سفید فام امریکہ میں "سیاہ قومیت" کا وجود ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔

سیاہ فام لوگ جب افریقہ سے غلام بنا کر لائے گئے تھے اس وقت وہ امریکہ کے سفید فام لوگوں سے اپنی تہذیب، زبان، مذہب، نسل، غرضیکہ ہر چیز میں مختلف رہے ہوں گے، لیکن [illegible] پہنچتے پہنچتے یہ تمام امتیازات ختم ہو چکے تھے۔ کالوں کی اپنی تہذیب کبھی کی مردہ ہو چکی تھی۔ زبان دونوں سماجوں کی انگریزی بن گئی تھی۔ مذہب عیسائیت تھا۔ رہ گئی نسل کی بات، تو سفید سماج شاید اپنی نسلی "پاکیزگی" کا غلط یا صحیح پروپگنڈا کر بھی سکتا تھا لیکن کالوں کی رگوں میں "سفید" "سرخ" "سیاہ" "زرد" تقریباً ہر رنگ کا خون دوڑ رہا تھا۔ لے دے کر اگر کوئی چیز ان کے پاس بچی تھی تو وہ ان کا ظاہری رنگ تھا ـــ سیاہ رنگ! اور یہی رنگ "سیاہ قومیت" کا دار و مدار قرار پایا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] (PROPHET OF GOD) [illegible]

[illegible] (MESSENGER) [illegible]

[illegible] (FATHER DIVINE) [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] (CHRIST) [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہو گئی تو خدا کے "وجود بہر مکان" عقیدہ کو اس طرح محدود کر دیا گیا کہ وہ ہر شخص میں ہونے کے بجائے
صرف "روحانی باپ" میں [illegible] بدیہی نتیجہ، جیسا کہ خود روحانی باپ نے اپنی ایک تقریر
میں کہا تھا، یہ [illegible]

[illegible] ہے، اور میں سیاہ فام ہوں۔ اس لئے خدا بھی
[illegible] فام ہے۔ خدا سے برتر اور کوئی نہیں ہے اس لئے
"سیاہ" ہر ایک سے برتر ہے۔"

[illegible] تعلیم اور مابعد الطبیعاتی عقائد کچھ اس قدر پراسرار تھے کہ اسے کوئی اثباتی
مذہب نہیں کہا جا سکتا۔ عیسائیت اور "حبشیت" کی تفریق پر زور ہونے کی وجہ سے ہم اسے
[illegible] منفی مذہب کہہ سکتے ہیں۔
[illegible] دو اور شخصیتیں سامنے آئیں۔ ایک امریکی حبشی تموتھی دریو (TIMOTHY
[illegible] تھا، اور دوسرا ویسٹ انڈیز کا رہنے والا ایک حبشی مارکس گریوی (MARCUS
GRAVY) تھا۔

تموتھی دریو، جس نے بعد میں اپنا نام نوبل دریو علی (NOBLE DREW ALI) رکھ لیا
تھا اور اسی نام سے مشہور بھی ہے، ۱۸۸۶ء میں شمالی کارولینا (N. CAROLINA) میں پیدا ہوا
[illegible] ۱۹۱۳ء میں وہ ایک مذہبی مبلغ کی حیثیت سے نیوارک (NEWARK) شہر کے
حبشی محلوں میں نوبل دریو علی کے نام سے گھومتا ہوا پایا گیا۔ وہیں اس نے سب سے پہلے ایک
عبادت [illegible] (TEMPLE) قائم کی۔ آنے والے ۱۲ سال کے عرصہ میں اس نے مختلف شہروں
[illegible] عبادت گاہیں قائم کیں۔ یہ عبادت گاہیں در اصل لکچر ہال تھے جہاں علی اور اس کے
[illegible] کو ان کے "اصلی" مذہب یعنی اسلام کی طرف دعوت دیتے تھے۔ اور انہیں ان
کی اس تاریخ سے آگاہ کرتے تھے جسے "سفید شیطانوں" نے کتابوں سے نکال دیا تھا۔ اس تاریخ
کی رو سے [illegible] مراکشی تھے جسے "سفید فام شیطانوں" نے "نیگرو [illegible]

دیا تھا۔ اسی مناسبت سے انھوں نے اپنی ہر عبادت گاہ کا نام "مراکشی امریکی سائنسی عبادت گاہ" (MOORISH - AMERICAN SCIENCE TEMPLE) رکھا۔

نوبل درو علی کے اس تاریخی انکشاف نے بعد میں ایک دلچسپ اور مضحکہ خیز بحث یہ پیدا کر دی کہ امریکہ کے حبشیوں کو کس نام سے پکارا جائے۔ ابھی تک وہ "نیگرو" یا اور زیادہ حقارت آمیز الفاظ میں "نیگر" (NIGGER) تھے لیکن "کالی قومیت" کا احساس پیدا ہو جانے کے بعد انھوں نے اپنے کو نیگرو کہنے سے انکار کر دیا کیونکہ لفظ "نیگرو" ان کے "سفید آقاؤں" کا ایک عطیہ تھا۔ امریکہ کے سیاہ فام لوگوں پر ادھر چند برسوں میں جو تحقیقاتی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں ان کے لئے مختلف نام استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً؛ افرو امریکی (AFRO - AMERICAN)؛ افرامریکی (AFRAMERICAN)؛ افریقی در مسافرت (AFRICAN - ABROAD)؛ افریقی النسل (PERSON OF AFRICAN DESCENT)؛ ایشیائی (ASIATIC)؛ افریقی یورپی امریکن انڈین (AFRICAN - EUROPEAN - AMERICAN - INDIAN)۔ یہ نام مختلف مصنفین نے اپنی کتابوں میں امریکہ کے تمام (بلا تفریق مذہب) حبشیوں کے لئے استعمال کئے ہیں۔ لیکن خود ان میں سے جو مسلمان ہو چکے ہیں وہ اپنے میں اور غیر مسلمان حبشیوں میں فرق کرتے ہیں۔ وہ اپنے کو "سیاہ مسلمان" (BLACK. MUSLIM) "اسلامی قوم" (NATION OF ISLAM) یا "بازیافتہ گم شدہ قوم" (LOST-FOUND NATION) کہتے ہیں۔ اپنی تقریروں میں اگر وہ لفظ نیگرو استعمال کرتے ہیں تو اس کے ساتھ "نام نہاد" (SO - CALLED NEGRO) کا اضافہ ضرور کر دیتے ہیں۔ "نام نہاد" کے بغیر جب کبھی بھی وہ "نیگرو" کا لفظ استعمال کریں گے تو اس کا مطلب "غیر مسلم نیگرو" ہوتا ہے۔

نوبل علی کچھ خاص پڑھا لکھا شخص نہیں تھا لیکن اسلام کے بارے میں اس نے کچھ الٹی سیدھی

---

* "انڈین" سے ہندوستانی نہیں، بلکہ امریکہ کے اصل انڈین باشندے مراد ہیں

[illegible]

(HOLY KORAN) [illegible] (HOLY KORAN)

[illegible]

میں قیادت کے لئے باہمی رقابت کو بھی لائی۔ علی کا ایک حریف ۱۹۲۹ء میں ایک صبح مردہ پایا گیا۔ پولیس
نے قتل کے شبہ میں علی کو گرفتار کرلیا، لیکن مقدمہ کے فیصلہ سے پہلے ہی جبکہ علی ضمانت [illegible]
[illegible] وہ اپنے مقتول حریف کی طرح مردہ پایا گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ضمانت پر رہا ہونے
[illegible] جیل میں تھا پولیس نے اسے اس قدر جسمانی اذیت دی تھی کہ وہ اس [illegible]
[illegible] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حریف گروہ کے کسی شخص نے اُسے قتل کر دیا۔

[illegible] دوسرا لیڈر مارکس گریوی (۱۸۸۷ - ۱۹۴۰) نے جو "سیاہ موسیٰ" (BLACK
[illegible]) کے نام سے بھی مشہور ہے، جداگانہ سیاہ قومیت پر پورا زور دینے کے باوجود
جداگانہ مذہب" کے تصور کی بہت زیادہ ہمت افزائی نہیں کی۔ جہاں تک افریقہ کو وطن ماننے
کا مسئلہ تھا، وہ اس معاملہ میں علی سے چند قدم آگے ہی تھا۔ علی کے یہاں وطن کا جو تصور عقیدہ
کی حد تک تھا مارکس کے یہاں وہ عمل ہی عمل تھا۔

۱۹۱۴ء کے لگ بھگ مارکس نے اپنی تحریک جس میں "وطن کی طرف واپسی" پر زور تھا، شروع
کی۔ کہا جاتا ہے کہ چند ہی برسوں میں اس کے ماننے والوں کی تعداد (یقیناً مبالغہ کے ساتھ) کروڑوں
تک پہونچ گئی۔ ۱۹۲۰ء میں مارکس نے نیویارک میں دنیا کے سیاہ فاموں کی بین الاقوامی کانفرنس
(INTERNATIONAL CONVENTION OF THE NEGRO PEOPLE
OF THE WORLD) کا اہتمام کیا۔ کانفرنس کی کاروائیوں اور دھوم دھام کا اندازہ اس سے
لگایا جا سکتا ہے کہ اس کانفرنس نے مارکس کو "اعلیٰ حضرت شہنشاہ" (HIS HIGHNES THE
POTENTATE) کے شاہانہ لقب کے ساتھ "جمہوریہ افریقہ" کا صدر منتخب کیا۔ صدر افریقہ
کی حیثیت سے ۲۲ ہزار ڈالر سالانہ الاؤنس مقرر کیا گیا۔ صدارت کا عہدہ قبول کرنے کے بعد مارکس
نے ۱۸ ممبروں کی ایک اعلیٰ انتظامی کونسل بنائی جس کے ہر ممبر کو ۳ ہزار سے لے کر ۱۰ ہزار ڈالر
تک سالانہ اعزازی الاؤنس دینا طے کیا گیا۔

جمہوریہ افریقہ کے صدر کی حیثیت سے مارکس گریوی نے جو معاشی پروگرام اپنی قوم کے سامنے

پیش کیا اس میں ایک جہاز راں کمپنی (BLACK STAR STEAMSHIP COMPANY) اور ایک نیگرو فیکٹری کا قیام شامل تھا۔ چار پانچ جہاز بھی خرید لیے گئے۔ یہ کمپنی خاص [illegible] کی گئی تھی کہ امریکہ کے حبشیوں کو اپنے آبائی وطن واپس جانے میں سہولت [illegible] نے افریقہ [illegible] تعلقات بڑھانے اور استوار کرنے کی خاطر ایک تجارتی [illegible] لائبیریا کو بھیجا۔ اور بھی کئی ایک چھوٹے بڑے معاشی منصوبے قائم کئے گئے لیکن ناتجربہ کاری [illegible] باعث کوئی بھی منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔

١٩٢٥ء میں امریکہ کی حکومت نے مارکس گریوی پر دھوکہ بازی اور خیانت مجرمانہ کے مقدمات [illegible] سال کے لئے جیل بھیج دیا۔ حکومت کے اس اقدام کے بارے میں امریکی حبشی کا یہ [illegible] مارکس گریوی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے ڈر کر حکومت نے اسے جعلی مقدمات کے [illegible] مارکس گریوی چونکہ امریکی شہری نہیں تھا اس لئے ١٩٢٧ء میں جیل سے رہا ہوتے [illegible] سے جلا وطن کر دیا گیا، کیونکہ قانوناً اب وہ حدود امریکہ میں نہیں رہ سکتا تھا۔ وہاں سے وہ جمیکا، پھر لندن چلا گیا، جہاں ١٩٤٠ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ لندن کے دوران [illegible] مارکس نے اپنی تحریک کو زندہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں اسے کامیابی نہ ہو سکی۔

[illegible] علی اور مارکس گریوی، دونوں کی تحریکیں اگرچہ خاص طور سے حبشی عوام کو مخاطب کرتی تھیں لیکن مارکس کے مقابلے میں علی کو پائدار کامیابی اس وجہ سے زیادہ ہوئی کہ اس کے یہاں زور [illegible] تھا کہ چونکہ ان کا اصل وطن (افریقہ) سفید فاموں کے ہاتھوں ان سے چھوٹ چکا ہے [illegible] لئے اب وہ سفید فاموں کے وطن سے ایک ٹکڑا لے کر اپنا آزاد وطن بنائیں۔ مارکس گریوی کے یہاں زور ہجرت پر تھا جس سے نچلے طبقہ کو خاص فائدہ پہونچنے کی امید نہیں تھی۔ سب سے [illegible] تھی کہ جذباتی حیثیت سے افریقہ کو اپنا وطن سمجھنے کے باوجود امریکی حبشی وہاں واپس [illegible] نہیں تھا کیونکہ افریقہ کے بارے میں وہ بچپن سے سنتا آرہا تھا کہ وہاں "آدم خور وحشی" [illegible] کی نظر میں سیاہ و سفید کی کوئی تمیز نہیں ہے۔

(۲)

... گریوی کے خاتمہ کے بعد امریکہ کی کالی سیاست میں کچھ دنوں کے لئے جمود کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ متوسط طبقہ کے تعلیم یافتہ اور خوشحال حبشیوں کی رفاہی اور سیاسی جماعتیں ... ہی تھیں لیکن چونکہ ان میں اور ان کی قوم کے نچلے طبقے کے درمیان ایک ... خلیج پیدا ہو چکی تھی اس لئے ان کی باتوں پر حبشی عوام زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے۔ ... کے یہ معتدل لیڈر، نچلے طبقے کے انتہا پسندوں کی نظر میں "سیاہ جسموں میں سفید شیطان" تھے۔

امریکی حبشی فطری طور سے جذباتی واقع ہوا ہے۔ سیکڑوں برس تک اس نے جس قسم کی محرومی کی زندگی گزاری ہے اس نے اس میں سیلاب دشتی کی ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ اسے ٹھنڈے اور منطقی استدلال متاثر نہیں کرسکتے ــــ اپنی اس قومی عادت کی وجہ سے امریکی حبشی نوبل دریو علی، مارکس گریوی یا اسی قسم کے انتہا پسند لیڈروں کے پیچھے چل سکتا ہے۔ ان دونوں لیڈروں کے اسٹیج سے ہٹ جانے کے بعد ۱۹۳۰ء میں ایک تیسری پراسرار شخصیت فرد محمد کے نام سے سامنے آئی۔

فرد محمد نے شروع میں اپنے معتقدوں کو یہ یقین دلایا کہ نوبل دریو علی کی روح "سفید شیطانوں" سے تنگ آکر اپنا پرانا جسم چھوڑ کر اس کے جسم میں آگئی ہے، اس طرح درحقیقت وہ فرد محمد نہیں بلکہ نوبل دریو علی ہے، لیکن "شیطانوں" کی وجہ سے اپنا پرانا نام استعمال نہیں کر رہا ہے۔ بعد میں اس نے اپنے ایک خاص معتقد کے سامنے اپنے کو اس "مہدی" کی حیثیت سے پیش کیا جس کا دنیا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن یہ بات مہدویت ہی پر ختم نہیں ہوئی۔ بعض مواقع پر اس نے اپنے کو خدا (God) اور "اللہ" کی حیثیت سے بھی پیش کیا۔ غرضیکہ وہ مختلف حلقوں میں حسب ...

---

* ہندوستانی مسلمان God اور اللہ میں اگر کوئی فرق سمجھتے ہیں تو صرف یہ کہ ایک انگریزی کا لفظ ہے اور ایک عربی کا۔ لیکن امریکہ کے کالے مسلمانوں اور (شاید انھیں کے اثر سے) وہاں پر بسے ہوئے (باقی صفحہ ...)

مختلف ناموں سے مشہور ہے [illegible]

۱۔ ڈبلیو۔ ڈی۔ فرد [illegible] (W. D. [illegible]) ؛ ۲۔ والی فراد (WALLI FARRAD) [illegible] پروفیسر [illegible] فراد محمد [illegible] ۔ محمد علی ؛ ۶۔ مہدی ؛ ۷۔ خدا (God) ؛ ۸۔ اللہ ۔ [illegible]

[illegible] کے خاندانی اور ذاتی حالات ابھی تک پردۂ گمنامی میں ہیں۔ ان کے معتقدین کے حلقے میں [illegible] مشہور ہیں ان کی رو سے ان کے باپ ایک سیاہ فام قریشی عرب [illegible] خود فرد کا رنگ کھلتا ہوا سانولا تھا۔ پیدائش اور ابتدائی تعلیم مکہ میں ہوئی تھی۔ بعد میں اعلیٰ تعلیم انگلینڈ اور امریکہ میں جنوبی کیلیفورنیا اور لاس انجلس کی یونیورسٹیوں میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے مملکت حجاز کی طرف سے انھیں سفارتی کاموں کے لئے تیار کیا جا رہا تھا کہ [illegible] کے لئے انھیں چن لیا، اور ان کے مادی جسم کے [illegible] اپنے منتخب [illegible] غیر سفید اقوام کی مدد کے لئے شمالی امریکہ میں آ گیا۔

سب سے پہلے ۱۹۳۰ء میں فرد ڈیٹروائٹ (DETRIOT) کے حبشی محلوں میں گھر گھر پھیری کر کے کپڑے بیچتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جو کپڑے وہ بیچتے تھے ان میں کوئی خصوصیت نہیں تھی لیکن ان کپڑوں کی جو تاریخ وہ بتاتے تھے اس کی وجہ سے حبشی مرد اور عورتیں ہر صبح شام بے چینی سے ان کا انتظار کیا کرتے تھے۔ فرد کے کندھوں پر لدے ہوئے کپڑے، ان کے کہنے کے مطابق، امریکی نہیں بلکہ افریقی تھے جن میں امریکی حبشیوں کے افریقی بھائی بندوں نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۶) اکثر ایشیائی (جذباتی) مسلمانوں کی نظر میں اللہ اور God میں بہت بڑا فرق ہے اللہ سے مراد وہ ذات ہے جس کا تصور اسلام نے پیش کیا ہے۔ جس ذات کا تصور عیسائیوں نے پیش کیا ہے اسے وہ God کہتے ہیں۔ (دوسرے لفظوں میں "اللہ" مسلمانوں کا اور God عیسائیوں کا خدا ہے) God اور اللہ کا یہ فرق اس مضمون میں باقی رکھنا ضروری تھا۔ اس لئے اللہ کے بالمقابل "God" کے لئے میں نے اردو زبان کا دوسرا معروف لفظ "خدا" استعمال کیا ہے۔

بن کر تیار کیا تھا۔ نوبل دریو علی اور مارکس گریوی کی یاد حبشیوں کے دلوں میں ابھی تازہ تھی اور وہ چیز جو افریقہ سے تعلق رکھتی تھی اس سے انھیں محبت تھی۔ اس طرح فرد گھر گھر گھوم کر امریکی حبشیوں کو جداگانہ قومیت، جداگانہ مذہب اور جداگانہ تہذیب کی کہانیاں سنایا کرتے جو یہ لوگ شروع میں شوق اور دلچسپی، پھر آہستہ آہستہ جذباتی تسلی کی خاطر دھیان سے سنتے تھے۔ چند ہی برس کے عرصے میں فرد نے ڈیٹروائٹ کے حبشیوں کے دلوں میں اتنی جگہ پیدا کر لی کہ لوگ اپنے گھروں پر ان کا انتظار کرنے کے بجائے ایک جگہ اکٹھے ہونے لگے تاکہ فرد ان کو ان کے آباؤ اجداد کے شاندار کارناموں سے واقف کرا سکیں جنھیں "سفید شیطانوں" نے حرف غلط کی طرح تاریخ کی کتابوں سے محو کر دیا تھا۔

ابتدائے آفرینش کی کہانی جو فرد نے انھیں سنائی وہ کچھ ایسی تھی جسے امریکہ کے حبشیوں (اور یقیناً دنیا کے کسی شخص نے بھی) کبھی نہیں سنا تھا:

دنیا کے ابتدائی باشندوں کا اصلی رنگ سیاہ تھا۔ فطرتاً وہ لوگ نیک اور راست باز تھے، اور مکہ میں رہتے تھے۔ چونکہ اس وقت ان میں رنگ و نسل کا کوئی فرق نہیں تھا اس لئے زندگی پر اطمینان تھی۔ اس طرح رہتے رہتے جب کچھ دن گذر گئے تو اللہ نے اپنے بندوں کا امتحان لینا چاہا۔

مکہ سے تقریباً ۲۰ میل دور (حضرت) موسیٰ کی پیدائش سے لگ بھگ ۲ ہزار برس پہلے ایک مشہور سائنسدان یعقوب نامی پیدا ہوا۔ یعقوب قسم قسم کے سائنسی تجربات کیا کرتا تھا۔ پے در پے کامیابیوں نے اُسے مغرور بنا دیا۔ (حضرت) ابراہیم جو صالحین کے سردار تھے، یعقوب کو غرور اور خدا سے سرکشی نہ کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے لیکن اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد یعقوب نے اللہ کے بالمقابل ایک سفید نسل پیدا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس بات سے ناراض ہو کر (حضرت) ابراہیم اور آبادی کے دوسرے لوگوں نے یعقوب کو اور اس کے پانچ ہزار نو سو ننانوے سیاہ فام متبعین کو شہر بدر کر دیا۔ یعقوب نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ

[illegible] غیر آباد جزیرہ میں اپنی تجربہ گاہ قائم کی۔ یعقوب اپنے سائنسی تجربات کی وجہ سے جانتا تھا کہ انسانی جسم میں ایسے مختلف رنگوں کے خلیے ہوتے ہیں جن میں سے کسی ایک کو مردہ کر دی[illegible] [illegible] تبدیلی لائی [illegible]۔ کچھ دنوں کے تجربے کے بعد وہ اس حد تک کامیاب ہو گیا کہ جزیرہ میں پیدا ہونے [illegible] تین بچوں میں سے ایک بچے کا رنگ بادامی ہوتا تھا۔ [illegible] نسل جوان ہوئی تو یعقوب نے یہ [illegible] کالے لڑکے اور لڑکی کی شادی آپس میں نہ کی جائے۔ میاں بیوی دونوں یا کم از کم ایک کا بادامی ہونا ضروری تھا۔ ایسی شادیوں سے جو بادامی بچے پیدا ہوتے ان کی اچھی دیکھ بھال کی جاتی لیکن جو سیاہ [illegible] پیدا ہوتے انہیں زچہ خانہ ہی میں یہ کہہ کر مروا دیا جاتا کہ وہ فرشتے بن کر اپنی ماں کے واسطے جنت [illegible] بنانے گئے ہیں۔ یعقوب نے اپنی زندگی میں اپنے تجربہ کو بالکل کامیاب ہوتے نہیں دیکھا لیکن باہمی شادیوں کے جو اصول اس نے بنائے تھے ان کا اثر یہ ہوا کہ اس کے مرنے کے [illegible] سال بعد جزیرہ میں صرف بادامی رنگ کے لوگ رہ گئے۔ مزید دو سو سال [illegible] بادامی نسل بھی ختم ہو گئی اور اس کی جگہ سرخ رنگ کی ایک نسل پیدا ہو گئی سرخ رنگ سے [illegible] دو سو سال اور لگے۔ اس کے بعد دو سو سال کے اندر زرد نسل، سفید نسل میں تبدیل ہو گئی۔ اس طرح مکہ سے نکلنے کے تقریباً ایک ہزار سال بعد سفید فام نسل [illegible] نے سفید فام نسل تو پیدا کر دی لیکن جس خلیے کو مردہ کر کے اس نے [illegible] تبدیلی پیدا کی تھی وہی خلیہ درحقیقت "احساس حیا" پیدا کرتا تھا۔ جب وہ خلیہ ہی نہیں رہا تو سفید نسل میں شرم و حیا کا احساس کہاں سے پیدا ہوتا۔ سفید عورتیں اور سفید مرد ننگ دھڑنگ وحشیوں کی طرح جزیرہ میں زندگی گذار رہے تھے، جبکہ ان [illegible] مکہ اور اس کے ارد گرد مہذب زندگی بسر کر رہے تھے۔

[illegible] اور آپ کو انسانی ارتقا کی یہ کہانی چانڈو خانے کی گپ معلوم ہو لیکن امریکہ کے غیر تعلیم یافتہ حبشیوں پر، جو روایتی طور سے مذہباً عیسائی اور بائبل کے مختلف [illegible]

آسمانی ... پر ... عام کے بارے میں ان کا نظریہ بھی تو بائبل ہی کی ... تک محدود تھا جو آدم وحوا اور موسیٰ وابراہیم کی حکایتوں سے بھرا ہوا ہے۔ اپنی اس کہانی کو فرد بہت ... کے کردار وں سے ملا دیا کرتا تھا۔ مسلمان جس شخصیت کو حضرت آدم کے نام ... ہیں وہ، فرد کی روایت کے مطابق اس کہانی کے یعقوب ہیں۔ جنھوں نے خدا کے حکم سے سرکشی کی اور جنت سے نکالے گئے۔ وہ جنت، جس سے آدم (یعقوب) اور ان کی اولاد نکالی گئی تھی، کہیں آسمان پر نہیں بلکہ اسی سرزمین پر مکہ میں تھی۔ جب آدم کی سفید فام اولاد سیکڑوں برس تک جاہلی اور حیوانی زندگی گذار چکی تو اللہ کو ان پر رحم آیا اور انھیں تہذیب کی دنیا میں واپس لانے کے لئے (حضرت) موسیٰ کو ان میں پیدا کیا گیا تاکہ وہ اپنی قوم کو (سفید) اندھیرے سے نکال کر (سیاہ) اجالے میں لاسکیں۔ (حضرت) موسیٰ کے بعد (حضرت) عیسیٰ آئے لیکن یعقوب نے جس بنیادی خلئے کو مردہ کرکے رنگ میں تبدیلی کی تھی وہ دوبارہ زندہ نہ ہو سکا اور اسی وجہ سے مختلف پیغمبروں کی کوششوں کے باوجود سفید فام اقوام کی اصلاح نہ ہو سکی۔ اور نہ ہوگی۔

فرد نے امریکی حبشیوں کی نفسیات کو سمجھ کر "سیاہ" اور "سفید" کے تضاد پر اتنا زور دیا ہے کہ اس کا ہر ماننے والا اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ "سیاہ" بہرصورت "سفید" سے بہتر ہے۔ کالے مسلمانوں کے ایک مشہور لیڈر مرحوم الکم ایکس (MALCOM X) نے جو بعد میں قرآن کے مطالعہ اور دوسرے ایشیائی مسلمانوں سے تبادلہ خیال کرنے کے بعد اپنے انتہا پسندانہ "اسلامی" خیالات سے تائب ہو گئے تھے، سیاہ و سفید کے مسئلے کو اس طرح پیش کیا تھا:

سفید کوئی رنگ نہیں ہے۔ سیاہ ایک رنگ ہے۔ دوسرے لفظوں میں سفید "نفی" ہے اور سیاہ "اثبات"۔ سفید کو جتنا بھی صاف کرو اس میں کوئی فرق نہیں آئے گا وہ ہمیشہ سفید ہی رہے گا۔ لیکن اگر سیاہ کو صاف کرو تو اس سے مختلف درجات میں مختلف رنگوں کا ظہور ہوگا۔ ہوتے ہوتے ایک درجہ ایسا بھی آئے گا جہاں سیاہ صاف ہوتے ہوتے

سفید ہو جائے گا — بالکل سفید ... ان کا مطلب یہ ہوا کہ ...
... اس میں قوت تخلیق نہیں ... سیاہ "اثبات" ہے اور قوت تخلیق کا حامل
... کے ذہن میں نفسیاتی طور سے ان کی نسلی برتری کا احساس پوری
... نظر میں اس کی اپنی حیثیت ایک مافوق الفطرت ہستی کی ہو گئی تو اس
... شروع کیا۔ خدا (God) اور "خدا کے بیٹے" کی جگہ "اللہ" کو دی گئی۔
... علاوہ اللہ کے رسولوں پر ایمان لانا ضروری قرار پایا۔ کہ قبلہ بند اور کھانے پینے، اٹھنے
بیٹھنے، اور تجارت وملازمت کے "اسلامی" اصول متعین کیے گئے۔ اسی طرح امریکہ میں "کالے
اسلام" کا جنم ہوا۔ پھر ایک دن ۱۹۳۳ کے آخر یا ۱۹۳۴ کے شروع میں "اللہ" یا "اللہ
کا بندہ" فرد محمد پُراسرار طریقہ سے امریکہ آیا تھا، اسی طرح غائب ہو گیا۔ آج تک یہ بات
معلوم نہ ہو سکی کہ اس شخص کا انجام کیا ہوا۔ فرد کے غائب ہو جانے کے بعد اس کے متبعین ۲
گروہ میں بٹ گئے۔ اکثریت کا خیال ہے کہ وہ "اللہ" تھا اور اپنے بندوں کی مدد کے لئے امریکہ
آیا تھا۔ یہاں اس نے انھیں صحیح راستے پر ڈال کر اور انھیں آنریبل جناب الیاس محمد
(HONBL. MR ILIJA MUHAMMAD) کے ہاتھوں میں سونپ کر مکہ کو جہاں سے
وہ آیا تھا واپس چلا گیا۔ دوسرا اقلیتی گروہ (جو اب تقریباً نہیں کے برابر ہے) فرد کی الوہیت کا قائل نہیں
ہے۔ اس گروہ کے بقول فرد محمد انسان تھا، لیکن "سفید شیطانوں" نے اُسے بھی نوبل دریو علی کی
طرح اپنی راہ کا کانٹا سمجھ کر خفیہ طریقہ سے ختم کرا دیا۔

اس طرح اس صدی کے نصف حصہ تک امریکہ کا حبشی ہر اس کالے شخص کے پیچھے چلتا رہا جو "سیاہ قوم" کا جھنڈا لے کر کھڑا ہو جاتا لیکن حقیقت اس کی جذباتی تشفی صرف ان لیڈروں سے ہوتی تھی جو پورے زور سے یہ کہنے کی جرأت رکھتے تھے کہ سیاہ ... الگ نسل ہیں اور ان دونوں کا امتزاج ناممکن ہے۔ یہ بات وضاحت کے ساتھ نوبل دریو علی اور اس کے بعد فرد محمد نے جداگانہ قومیت کے ساتھ ساتھ جداگانہ مذہب پر زور دیا۔ فرد محمد اپنی تحریک کے پودے کو ایک تناور درخت بنے نہ دیکھ سکے لیکن وہ خوش قسمت تھے کہ انھیں الیاس محمد کے ایسا مستقل مل گیا تھا جس نے ان کی تعلیمات اور خیالات کو امریکہ کی ایک ہمہ گیر تحریک میں بدل کر رکھ دیا۔

ڈاکٹر محمد عمر

مسلمانوں میں حُقّہ نوشی

حُقّہ، عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ایک گول ڈبے کے ہیں جس میں جواہر یا ادویہ وغیرہ رکھی جائیں اور کنایتہً دہن کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جب یہ لفظ فارسی کے دوسرے الفاظ سے مرکب ہوتا ہے تو اس کے مختلف معنی ہو جاتے ہیں۔ مثلاً، حقّہ آتش، ایک قسم کا راکٹ یا گولا جو جنگ کے موقع پر استعمال ہوتا تھا۔ اسی قسم کے حقّوں کے ڈھیر پر آگ لگنے سے شیر شاہ کی موت ہوئی تھی[1]، حقّۂ بے مغز، (احمق)، حقّۂ سبز (فلک)، حقّۂ کلوس (فن موسیقی میں ایک راگ)، حقّہ بلنا فام (کرۂ آسمانی) اور حقّۂ مینا (آسمان)۔ فارسی زبان میں چند محاورے بھی لفظ حقّہ کی ترکیب سے وضع کیے گئے ہیں۔ مثلاً حقّہ بازی، (بازی گر، مداری، مجازاً بہ معنی عیار اور مکّار) حقّہ بردار (حقّہ بھرنے اور پیش کرنے والا) وغیرہ

مگر اس بات کی تحقیق مشکل ہے کہ لفظ حقّہ کا استعمال معروف آلۂ تمباکو نوشی کے معنوں میں کب سے شروع ہوا۔

غالباً ہندوستان میں آنے سے پہلے مسلمانوں میں حُقّہ پینے کا رواج نہیں تھا اور حقّہ نوشی کا یہ شوق اُنھیں ہندوستان سے ملا۔ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ ترکوں کے عہد میں مسلمانوں میں حقّہ نوشی کا رواج شروع ہو چکا تھا یا نہیں، اگر شروع ہو چکا تھا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

---

[1] عباس خاں سروانی۔ تاریخ شیر شاہی (اردو ترجمہ، پاکستان ۱۹۶۳ء) ص ۱۲۸ - ۱۲۹

[illegible] وقت حقہ میں کیا پیا جاتا تھا۔ محمد حسین آزاد کی یہ روایت بھی کہ امیر خسرو حقہ پیتے تھے [illegible] لکھا ہے:

[illegible] ایک بڑھیا ساقن کی دوکان تھی، چھما اس کا نام تھا۔ شہر کے [illegible] پیا کرتے تھے، جب یہ دربار سے پھر کر آتے یا تفریحًا [illegible] تو وہ بھی سلام کرتی، کبھی کبھی حقہ بھر کر سامنے لے [illegible] اس کی دلشکنی کا خیال کر کے دو گھونٹ لے لیا کرتے۔[1]

مورخوں کا خیال ہے کہ تمباکو امریکی لفظ ہے اور یہ لفظ اور تمباکو دونوں اکبری عہد میں ہندوستان پہونچے۔ اوّل اوّل تمباکو پرتگالیوں کی وساطت سے ہندوستان آیا۔ جزائر ہند اور دکن میں پہلے پہونچا۔[2] مگر شمالی ہند میں اواخر عہد اکبری تک نہیں آیا تھا۔ شیخ ابو الفضل کا ملازم اسد بیگ [illegible] سال تک ان کی خدمت کر چکا تھا، اپنے وقائع میں لکھتا ہے کہ ۱۰۱۳ھ (۱۶۰۴ء) کے قریب اکبر بادشاہ نے اس کو دکن بھیجا۔ بیجاپور کے قیام کے زمانے میں اس نے تمباکو دیکھا جو شمالی ہند میں بالکل ناپید تھا۔ اسد بیگ کا بیان ہے کہ اس نے تھوڑا سا تمباکو خرید لیا۔ ایک جڑاؤ حقہ تیار کروایا، جس پر میناکاری کا کام تھا اور جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ عقیق یمنی کی ایک خوبصورت مہنال خریدی۔ سونے کی چلم تیار کرائی اور چاندی کی نے لی، جس پر مخمل چڑھی ہوئی تھی۔ اس نے ان چیزوں کو بڑے سلیقے سے سجا کر مع دیگر تحائف کے اکبر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ جب بادشاہ کی نگاہ حقے پر پڑی تو وہ حیران ہوا۔ اس نے غور سے تمباکو دیکھا جو ایک [illegible] میں علحدہ علحدہ جما ہوا رکھا تھا۔ اس نے دریافت کیا کہ یہ سب کیا ہے؟ اسد بیگ نے عرض کیا کہ اس کا نام تمباکو ہے۔ چونکہ مکہ اور مدینہ میں مروج ہے اور اعلیٰ حضرت کے واسطے

---

[1] مولانا محمد حسین آزاد۔ آب حیات (فیض آباد) ص ۸۷

[2] بقول پینانٹ ۱۶۷۱ء میں تمباکو [illegible] ہندوستان پہونچا۔ ملاحظہ ہو The View of Hindostan جلد دوم، [illegible]

بطور دوا لایا ہوں"۔ بادشاہ نے اسے حقہ بھرنے کا حکم دیا۔ جب حقہ تیار ہو گیا تو بادشاہ کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ اعلیٰ حضرت نے پینا شروع کیا۔ اُدھر سے شاہی حکیم نے منع کرنا شروع کیا۔ مگر اعلیٰ حضرت نے فرمایا "ہمیں اسد بیگ کی خاطر سے پینا چاہیے"۔ یہ کہہ مہنال مُنہ میں لے لی اور دو تین کش لگائے۔ بعد ازیں اسد بیگ کی طرف حقہ بڑھا دیا۔ اس نے بھی دو گھونٹ لیے۔

(اسد بیگ کا بیان ہے کہ وہ تمباکو اور حقے کافی مقدار اور تعداد میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس نے تھوڑا تھوڑا تمباکو اور ایک ایک حقہ مختلف امیروں کی خدمت میں بطور تحفہ بھیج دیا۔ انھیں ایسا شوق لگا کہ ہر امیر نے تمباکو پینا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ اس کی تجارت ہونے لگی اور تمباکو پینے کا چلن عام ہو گیا۔ مگر اعلیٰ حضرت نے کبھی اس کی عادت نہیں ڈالی۔[1]

بھنڈاری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد اکبری سے پہلے تمباکو نوشی کا عام رواج نہ تھا۔ حکما اور اطبا کچھ امراض کے علاج کے سلسلے میں تمباکو پینے کا مشورہ دیتے تھے لیکن کچھ حضرات انفرادی طور پر برائے تفریح پیتے تھے۔ اس وجہ سے فرنگستان سے بہت کم مقدار میں تمباکو کی درآمد ہوتی۔ آخر کار ہندوستان میں بھی اس کی کاشت شروع ہوئی[2] اور دیگر اجناس کی نسبت تمباکو پر زیادہ ٹیکس لگایا جانے لگا۔ جہانگیر کے عہد (۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء) تک تمباکو کی کاشت کا عام رواج ہو چکا تھا؛ اور ہر کس و ناکس تمباکو استعمال کرنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ امرا، وزرا، شرفا، نجبا، صلحا، زہدا، فضلا، شعرا، فصحا، حکما اور فقرا سب کے سب اس کی طرف راغب ہو گئے تھے؛ اور دیگر اشیائے خوردنی اور نوشیدنی پر اسے ترجیح دینے لگے تھے۔ مہمان نوازی اور اظہار خلوص کا یہ ایک واحد ذریعہ بن گیا۔ تمباکو پینے کی لوگوں میں ایسی عادت پیدا ہو گئی تھی کہ اس کے عادی کھانا پینا ترک کر سکتے تھے مگر تمباکو ترک کرنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ عام طور پر ایک شخص

---

[1] برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ رسالہ تاریخ اسد بیگ (قلمی) ص ۳۶-۳۷

[2] سب سے پہلے تمباکو کی کاشت گجرات کے علاقے میں شروع ہوئی تھی۔ ملاحظہ ہو The View of Hindustan جلد دوم، صفحہ

[illegible] سے کراہت کرتا تھا اگر تمباکو پیتے وقت ایک شخص کسی دوسرے کا گھر جائے [illegible] ایک ہی مہنال سے اس کا حقہ پیتا [illegible]

[illegible] رواج ہو گیا۔ چھوٹے بڑے، امیر فقیر سب ہی اس [illegible] نے ۱۶۱۷ء میں ایک حکم نافذ کر کے تمباکو پینا قانونی طور پر ممنوع [illegible] جہانگیر لکھتا ہے:

چوں اسطہ افساد تمباکو کہ در اکثر مزاجہا و طبیعت ہا مقرر است، فرمودہ بودم کہ ہیچکس متوجہ [illegible] برادرم شاہ عباس[2] نیز بہ ضرر آں مطلع گشتہ، در ایران می فرمایند کہ ہیچکس مرتکب کشیدن [illegible] گردد۔ چوں خان عالم[3] بمداومت کشیدن تمباکو بی اختیار [illegible] امر تیام و اقدام می نمود، یادگار علی سلطان ایلچی دارائے ایران [illegible] می نماید کہ خان عالم یک لحظہ بی تمباکو نمی تواند بود۔ جواب عرض [illegible] این بیت مرقوم می سازد ؎

رسول یار میخواہد کہ کند اظہار تمباکو — من از شمع وفا روشن کنم بازار تمباکو

خان عالم نیز در جواب بیتے گفتہ فرستادہ است

من بیچارہ عاجز بودم از اظہار تمباکو — ز لطف شاہ عادل گرم شد بازار تمباکو[4]

چونکہ عوام [illegible] تمباکو نوشی کے بے حد عادی ہو چکے تھے لہٰذا شاہی حکم بھی انھیں اس فعل سے باز نہ رکھ سکا اور وہ شاہی حکم کی خلاف ورزی کرنے پر مجبور ہوئے[5]۔ ایسے مجرموں کو شہر میں گشت

---

۱ سبحان رائے [illegible] خلاصۃ التواریخ (دہلی ۱۹۱۸ء) ص ۴۵۴

۲ شاہ عباس، ایران کا بادشاہ اور جہانگیر کا ہم عصر تھا۔ اس نے ۱۵۸۶ء تا ۱۶۲۹ء ایران پر حکومت کی تھی۔

۳ عہد جہانگیری کا ایک امیر جسے بادشاہ نے اپنا سفیر بنا کر شاہ عباس کے دربار میں بھیجا تھا۔

۴ تزک جہانگیری (فارسی) ص ۱۴۳۔ نیز ملاحظہ ہو۔ بھنڈاری۔ خلاصۃ التواریخ ص ۴۵۵

۵ تزک جہانگیری (انگریزی ترجمہ) ج اول ص ۳۷۰

کرایا جاتا تھا اور اس جرم میں بعض لوگوں کے ہونٹ تک کٹوا لیے گئے تھے مگر اس سختی کے باوجود یہ مرض روز بروز بڑھتا ہی رہا[1]۔

... سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ تمباکو کا استعمال کتنا عام ہو چکا تھا۔ اس کا بیان ... زمانے میں وہ ملتان میں مقید تھا اس کے نگہبانوں نے اس سے درخواست کی کہ وہ انھیں کچھ روپے عنایت کرے تاکہ وہ لوگ تمباکو خرید کر حقہ پی سکیں۔ مجبوراً اسے ان کی خواہش منظور کرنی پڑی[2]۔

مسلمانوں میں حقہ بہت مقبول ہو گیا تھا اور وہ لوگ اس کے بری طرح عادی ہو چکے تھے کھانے کے بعد حقہ پینا ان کا مرغوب ترین مشغلہ تھا، اور یہ شغل فطرتِ ثانیہ بن چکا تھا[3]۔

لہٰذا تمباکو کی کھپت اتنی بڑھ گئی تھی کہ صرف دہلی شہر سے بطور ٹیکس پانچ ہزار روپے کی روزانہ آمدنی ہوتی تھی۔ منوکی بڑی حیرت کے ساتھ لکھتا ہے کہ قارئین اس سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اتنے بڑے ملک سے تمباکو کے ٹیکس کی صورت میں سرکاری خزانہ کو کتنی بڑی رقم حاصل ہوگی[4]۔ بعد میں اورنگ زیب نے تمباکو سے محصول اٹھا لیا تھا۔ اس سے تمباکو پینے والوں کو بے حد اطمینان اور خوشی حاصل ہوئی تھی اور اس سے غریبوں کو بہت فائدہ پہنچا تھا[5]۔

چونکہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں حقہ خاص و عام میں مرغوب خاطر تھا اس وجہ سے شاعروں اور ادیبوں نے تمباکو اور حقہ کی تعریف و توصیف میں طبع آزمائی کی ہے، جو اس کی مقبولیت کا بین ثبوت ہے۔ لعل چند منشی نے ذیل کے اشعار تمباکو کی تعریف میں کہے ہیں:

---

۱ بھنڈاری۔ خلاصۃ التواریخ ص ۴۰۴ ۲ منوکی۔ سفرنامہ (انگریزی) ج دوم، ص ۵۰۰

۳ منوکی۔ سفرنامہ انگریزی ج دوم ص ۱۷۵، نیز ملاحظہ ہو۔ کردس۔ سفرنامہ۔ ج اول، ص ۱۴۶

۴ منوکی۔ سفرنامہ۔ (انگریزی) ج دوم، ص ۱۷۵

۵ ایضاً ج دوم، ص ۱۷۵

[illegible] زہے نامش کہ تنباکو نہادند [illegible] ندانم کہ شہر الش [illegible]

[illegible] کس شادمانی   بہ کیفیتِ انبساط دو جہانی

[illegible] ابد کہ بہاری   کند بر باغ دلہا آبیاری

[illegible] کس سازیہ عیش   سزاوار آں کہ سازم کم از بیش[1]

[illegible] مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں حقہ مقبول تھا اور اکبر بادشاہ کے [illegible] خانوں میں بھی اسے مقبولیت حاصل ہو گئی تھی، ان صدیوں سے دونوں قوموں کے امیر و غریب افراد بڑے چاؤ سے اس کا شغل کرتے تھے۔ مذہبی اور غیر مذہبی جشنوں کے موقعوں پر مہمانوں کی حقے سے تواضع کی جاتی تھی[2]۔ شاہانِ مغلیہ، امراء اور یہاں تک کہ غرباء بھی سفر اور حضر میں حقہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ مغلیہ سرکار میں "تنبول خانہ" ایک علیحدہ شعبہ تھا اور اس کا انتظامی عملہ داروغۂ تنبول خانہ کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ تیونگ نے ایک امیر کا ذکر کیا ہے جو حقے کا شیدائی تھا اور ایک رتھ پر سفر کر رہا تھا۔ اور حقے کے کش بھی لگاتا جاتا تھا۔ آٹھ یا دس فٹ لمبی ایک نیچوان ایک حقہ کے چاروں طرف سانپ کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ نیچے برتن نما ایک تلا تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ کش لگانے پر دھواں اس پانی سے گزرتا تھا جس کی وجہ سے ٹھنڈا اور صاف ہو جاتا تھا۔ رتھ کے ساتھ ایک شخص اس آلے کو ہاتھ پر لیے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہا تھا[3]۔

بادشاہوں کی طرح امراء بھی اپنی مخصوص محفلوں میں حقے سے شغل کرتے تھے۔ طباطبائی نے [illegible] خان کی مجلسوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رات کو نواب اپنی مسند پر جلوہ افروز

---

[1] [illegible] بھنڈاری نے تنباکو کی بہت تعریف کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ خلاصۃ التواریخ ص ۵۵۴، بعد میں آتش نے [illegible] مذمت بھی کی ہے۔ ایضاً ص ۵۵۴ [2] ملاحظہ ہو۔ مرقع دہلی۔ ص ۲۹

[3] Travels in [illegible] ص ۱۳۶

کیے جاتے ہیں۔ چھوٹا حقہ، تلی یا قلیان، یا گڑگڑی کہلاتا ہے [illegible] کا ہوتا ہے اور اسے ہاتھ میں لے کر پیتے ہیں۔ دوسرا حقہ، جسامت میں تلی سے بڑا ہوتا ہے۔ اسے حقہ کہتے ہیں۔ بادشاہوں [illegible] نے چاندی کے بنے ہوئے تھے۔ محمد شاہ بادشاہ کے حقے کی مہنال کی تیاری میں پانچ ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔ جلاوطنی کے زمانے میں بہادر شاہ ظفر [illegible] حقے ساتھ لے گئے تھے اور وہاں بھی ضروری سامان مہیا کر لے [illegible]

[illegible] اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ادب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں بھی حقہ [illegible] پر میلے ٹھیلے کے موقعوں پر جب وہ باغوں اور دیگر سیرگاہوں میں [illegible] اور اراذل کی مستورات حقہ بھی ساتھ لے کر جاتی تھیں۔ [illegible] بھی محفل رقص میں حقے کے کش لگایا کرتی تھیں۔ یہ انداز بڑا دلکش اور دلفریب ہوتا تھا۔ شاہی [illegible] بھی اس وبا سے محفوظ نہ تھیں۔ میر حسن دہلوی نے اپنی مثنوی سحرالبیان میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

کھڑے ہو کے دو گھونٹ حقہ کے لے — چبا پان اور رنگ ہونٹوں پہ دے

مختصر یہ کہ ہندوستان کے ہر طبقے کے لوگوں میں حقہ نوشی کا رواج تھا، یہاں تک کہ بیرونی ممالک کے باشندے [illegible] ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین بھی حقہ پینے لگے تھے ریٹوننگ اپنے ساتھ کچھ حقے [illegible] لے گیا تھا۔

[illegible] حقے کا اتنا شیدا تھا کہ اس نے جعفر علی خاں زکی سے حقے پر مثنوی لکھنے کی فرمائش کی [illegible] مکمل نہ کر سکے اور بادشاہ نے شاہ حاتم کو حکم دیا کہ اسے تمام [illegible]

[illegible] علی خاں زکی کے ابتدائی شعر ملاحظہ ہوں:

[illegible] کو نہ جانوں کیا سبب ہے — ملا ہے گڑ سے اور کیوں گڑ [illegible]

طلب گڑ کی اسے ہے اس سبب سے [illegible] لائے گڑ آ سے پیارے کے لب سے
شاہ حاتم کی [illegible] مثنوی "در وصفِ تنباکو و حقہ" نقل کی جاتی ہے کیوں کہ اس کے استعمال سے
[illegible] عام استعمال پر روشنی پڑتی ہے، اور اس عہد کی معاشرتی زندگی میں دلچسپی رکھنے
[illegible] نہایت اہم ماخذ بھی ہے۔

مثنوی در وصفِ تمباکو و حقہ

تمباکو نہ جانوں کیا سبب ہے
ملا ہے گڑ سے اور کیوں گڑ طلب ہے

طلب ہے گڑ کی اس کو اس سبب سے
ملا دے گڑ آ سے پیارے کے لب سے

گڑ تب گڑ اکو نام پایا
سبھوں نے چاہ سے تب منہ لگایا

کہے ہے تلخ پر میٹھا ہے گڑ سے
مٹھائی گڑ کی ہے گی اس میں دھڑ کندا ہے

کہے حقہ تنباکو کیوں جلے ہے
کہ گنگا جل ترے پاؤں تلے ہے

اگن کو آب نے سے لے بجھادے
دگرنہ باعثِ جلنا بتادے

ہوا ہوں سوکھ کر میں خشک اور زرد
یہی صورت ہے میری دیکھ بے درد

---

۱ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۸۱ ۔ ۲ مجھے اس کا علم نہیں ہے کہ آیا یہ مثنوی شائع ہوئی ہے یا نہیں۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ یہ مثنوی قلمی نسخہ آزاد لائبریری علی گڑھ سے اخذ کی گئی ہے اور متن کے قائم کرنے میں قیاسی تصحیح سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن اس کی نشان دہی ہر جگہ لازماً نہیں کی گئی ۔ ۳ تماکو ۴ جانا ۔ اب یہ لفظ متروک ہے ۵ گڑ ملا پینے کا تنباکو ۶ شوق ۷ حقا ۔ اس زمانے میں حقہ الف سے لکھا جاتا تھا۔ اب الف سے لکھنا متروک ہے۔ ۸ گنگا کا پانی ، حقے کا پانی ۹ نیچے ۱۰ آگ ۱۱ حقے کی وہ نلی جس کے ایک سرے سے چلم رکھتے ہیں اور دوسرا پانی میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

Encyclopaedia of Religion and Ethics VI. pp 480–482

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تس اوپر غم نہ پوچھو دستگی ہے [illegible] رشتۂ دل بستگی ہے
جلوس دست محبوباں [illegible] ہے [illegible]
پھولی پان کی بو سے رچا ہے گلاب و مشک و عنبر میں بسا ہے
نہیں ہے حقہ گر دکھ [illegible] ہے کہ جیرا کو چکی [illegible]
[illegible] خورشند ہے گا عجب معشوق کلغی بند ہے گا
[illegible] ہو گر اس کا میداں کہ حقہ گوشئے اور ڈئے ہے چوگاں
[illegible] آتش بسر ہے دمے نہیں اس کی سوراخ جگر ہی (کذا)
یہاں گلدستہ لانے کیا چلی ہے تنا کو گل ہے اور حقہ [illegible] ہے
کرے ہے طعنہ اب حقہ فلک پر کہ میں ہوں خوبتر تجھ سے [illegible]
[illegible] شکوہ ہر اک جا میرے مشتاق ہیں اعلیٰ و ادنیٰ
[illegible] گہرے مجھکو تزئیں بنا ہوں موتیوں سے عقد پڑویں
[illegible] معشوق ملناز کہ ہویں ایک دم وہ مجھ سے دمساز
زمیں پر جا بجا کرئے نظارے جھڑیں ہیں فیض سے میرے ستارے
اگر تا سے نہ ہوتے آسماں میں سہانا کس طرح لگتا جہاں میں
اسے دن رات مہر و مہ جلا ہے مرا بھی چاند سورج خوانچا ہے

---

۱ معطر ہونا ۲ نہیں اصل نسخہ میں ۳ ڈھال یا آفتابی ۴ ایک قسم کی منقش پگڑی
[illegible] ۷ تاج، ٹوپی یا چوٹی
[illegible] کے خوشنما [illegible] ہوئے ہیں [illegible] ۹ گینڈا
[illegible] عقد ثریا۔ بنات [illegible]
[illegible] چھوٹا خوان، تھال وغیرہ

غلام اس کے تجرد میں [illegible] — گیزنگ اس گھرانے کے جیتے ہیں (کذا)
[illegible] — سدا ہے [illegible] جلیؒ ہے
[illegible] ہے گا درویشی کے فن میں — اُسے خلوت ہے ہر دم انجمن میں
[illegible] ایا یار بسؒ ہے — کہ ہر دم جس کے تئیں پاسِ نفس ہے
ہے [illegible] کے دم کی دن راتؒ — ممدؒ ہم حیات، ہم فرحت ذات
ہے سب کے مذہب و مشرب آگاہ — ہے ہر یک محفل اندر اس کے تئیں راہ
جہاں [illegible] — کیا ہر دخل جا کر کفر و دیں میں
[illegible] آشنا دونوں سے یکساں — طلبگار اس کے ہیں ہندو مسلماں
بتاں سے ہے کبھی ہر دم وہم آغوش — کبھی جوں برہمن زنار بر دوشؒ
ہے شمع مجلس و مجلس کا صاحب — جہاں دیکھو تہاں سب کا مصاحب
[illegible] اہلِ معنی ہے سراپا — مثال چنگؒ ہے خاموش گویا
ہے عاشق سیرت و معشوق صورت — ملے ہے نیک و بد سے بے کدورت
[illegible] ہر قدم ہے یار سب کا — شب تنہائی میں غمخوار سب کا
قبولِ خاطرِ شاہ و گدا ہے — بہفتاد و دو ملتؒ آشنا ہے
کرے ہے غسل وہ ہر دن مکرر — ہمیشہ سے رہے ہے تازہ و تر
حکیم اس کو اگر کہیے بجا ہے — کہ ہر یک مرض کو اس سے شفا ہے
کوئی حقہ، کوئی تلیاں کہے ہے — کوئی حکمت میں صحتِ جاں کہے ہے
[illegible] ہے لے صاحب اللہ اک — بقدر حوصلہ معجون و تریاکؒ

ؒ صوفیا کی اصطلاح میں باآوازِ بلند یادِ الٰہی کو "ذکر جلی" کہتے ہیں ؒ کافی ہے ؒ مددگار ؒ سے ؒ کا مذہب
[illegible] مسلمانوں کے [illegible] ؒ ایک خاص قسم کی معجون جو زہر کے اثر کے دفع کرنے کیلئے بناتے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

فتح پیچ، (ایک قسم کے حقے کا نیچہ) مداریا (سٹک، پیچوان، ایک قسم کا چھوٹا حقہ) ہردم تازہ اور فرشی وغیرہ اصطلاحیں بنائیں۔ چلم پر ٹوپی رکھی، مہنال اور زنجیر کا اضافہ کیا۔ موسم گرما میں اس کو خس سے ٹھنڈا کیا۔ عطریات سے بسایا، خوشبودار خمیرے تیار کیے۔

آج کل شہروں سے حقے پینے کا رواج اٹھتا جا رہا ہے۔ کیوں کہ یہاں کی زندگی تگ و دو کی شکار ہے اور شہریوں کو اتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ اطمینان کے ساتھ حقے کے چند کش لے سکیں۔ لہٰذا سگریٹ، سگار اور بیڑی سے کام چلاتے ہیں۔ اس کے برخلاف دیہاتوں میں اب بھی حقے کا رواج ہے۔ اس لیے کہ حقہ کا اہتمام جس سکون کا طالب ہے وہ مشینوں کے ساتھ [illegible] زندگی میں نہیں مل سکتا۔ سگریٹ، اور حقے میں ظاہر اور باطن کے اعتبار سے جو فرق ہے وہی در اصل انیسویں اور بیسویں صدی کی معاشرت اور اقدار کا

کی تدبیریں اختیار کرنے کے بجائے اُن میں گھلنا شروع کر دیتے ہیں۔ جب یہ رجحان طبیعت میں [illegible] بس جاتا ہے اور احساس کا رنگ گہرا ہوجاتا ہے تو مزاج ہو جاتا ہے [illegible] زندگی، اندیشہ ہائے دور دراز سے عبارت ہوتی [illegible] کیفیت، اپنی لیاقت اور صلاحیت سے پورا اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑتی۔ اپنے گرد ایک سوگوار فضا قائم ہوجاتی ہے۔ [illegible] محرومی کا احساس جڑ پکڑ لیتا ہے۔ اپنی نگاہوں میں اپنی قدر گھٹنے لگتی ہے۔ نکما پن روز بروز بڑھتا [illegible] کو گھن لگ گیا، فکر کا گھن!

پریشانی دراصل [illegible] جذباتی ردعمل ہے جس سے ذہنی کشاکش کا اظہار ہوتا ہے۔ ایسا آدمی بوکھلایا ہوا [illegible] اضطراری کیفیات کا مرتکب ہوتا ہے۔ جیسے کوئی بلاوجہ ہاتھ ملے جاتا ہے، کوئی ہونٹ چباتا ہے، کوئی دانتوں سے ناخن کاٹے نکلتا ہے، کوئی چہل قدمی ہی کیے جاتا ہے۔ [illegible] کی دنیا بھی ہیجان سے خالی نہیں ہوتی۔ دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے، خون کا دباؤ [illegible] اور جسم کے اندر مختلف رطوبتیں خارج ہونے لگتی ہیں۔ کبھی کبھی بے چینی کے کرب میں دورے کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور جوشِ وحشت میں آدمی اپنے آپ ہی کو جھنجوڑ ڈالتا ہے یا جس پر بس چلتا ہے اُسے کاٹ کھانے کو دوڑ پڑتا ہے۔ مثلاً جذبات سے مغلوب ہوکر کوئی چھت سے [illegible] ہے تو کوئی اپنے معصوم بچے کو ہی پٹخ دیتا ہے۔ اس لمحے ہوش کی دنیا اتنی سکڑ کر رہ جاتی ہے کہ اپنی سُدھ بُدھ ہی باقی نہیں رہتی۔ اُس کے برخلاف ایسا بھی ہوتا ہے کہ پریشان [illegible] خیالات میں گم ہوکر رہ جائے۔ اس کے لیے دنیا کے تماشے میں کوئی کشش ہی نہ [illegible] طرح بسر کرنے لگے جیسے خود اپنا ہاتھ پکڑ کر چل رہا ہو اور اُس کا وجود بے حسی کی گرد میں اَٹ کر رہ جائے۔

نکما کثر محرومی پر ایک نقاب بھی ہوا کرتی ہے۔ جب زندگی بوجھ بن جاتی ہے اور سنبھالے [illegible] تو ہم پریشانیوں کو گلے لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہر معمولی سا واقعہ ایک حادثہ سمجھ لیا جاتا [illegible] مرحلہ بن جاتا ہے۔ زندگی کی ساری اُدھیڑ بُن ہی یہ رہ جاتی ہے کہ کسی طرح

فکروں سے نجات حاصل کی جائے۔ گویا پریشانی سے بچنے کے لیے پریشان رہتے ہیں۔ متفکر ذہن دراصل ایک ہی وقت میں حال اور مستقبل دونوں زمانوں میں رہنا چاہتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ اگر واقعی کوئی سانحہ قسمت میں لکھ گیا ہے اور رونما ہو کر رہے گا تو پھر تردّدِ بے جا سے کیا حاصل ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ فکرمندی کی بدولت اس سانحے کا غم ایک بار نہیں بلکہ دوبار ہے۔ پہلی مرتبہ اُسے سوچ کر اور دوسری مرتبہ اُسے جھیل کر۔ ہمیں یہ خیال نہیں آتا کہ جاگتے ہوئے ہم اچھا کیوں نہ سوچیں۔ خواب تو بُرے بُرے آسکتے ہیں کیونکہ اُن پر اپنا قابو نہیں ہے لیکن بیٹھے بٹھائے امکانی خطرے مول لیتے رہنے کو کس نے کہا ہے۔ مگر فکروں کے جالے کو اپنے ذہن پر لپیٹ کر ہم ناکامی کے اقرار کی ذلّت اور کامیابی حاصل کرنے کی ذمہ داری دونوں سے بزعمِ خود بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔

ذرا غور سے دیکھیے تو یہ بھی صاف پتہ چلتا ہے کہ پریشانی کی تہہ میں خوف چھپا ہوا ہے۔ ہمیں یہ خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اتنے اچھے نہیں ہیں جتنا آج تک اپنے آپ کو سمجھتے رہے ہیں یا اپنے آپ سے آس لگائے رہے ہیں۔ ہمیں گھبراہٹ ہوتی ہے کہ جو چاہتے ہیں اسے حاصل نہ کر سکیں گے۔ پے در پے ناکامیاں، حوصلہ پست کرنے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ ان کی بدولت اپنے اوپر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ صحت، ملازمت، عزت، آل اولاد سب ہی کی طرف سے خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ فکروں میں گھلنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ محض امکانی خطرات کے انتظار میں گھڑیاں گنی جا رہی ہیں۔ خوف اور فکر میں صرف اس قدر فرق کیا جا سکتا ہے کہ وہ صورت حال پر مبنی ہوا کرتا ہے اور یہ مآلِ کار سوچ سوچ کر بڑھتی ہے۔ متفکر ذہن، خواہ پریشانی میں الجھا ہوا ہو یا بے حسی میں کھویا ہوا، بہرحال انجام کے خیال سے سہما ہوا ہے۔

یوں تو خوف مناسب اور واجب بھی ہوتا ہے۔ پچھلا تجربہ یا حالات کا جائزہ بجا طور پر احتیاط برتنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ ناگوار نتائج یقیناً جھجک پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ”بے بات کا ڈر“ اور بات ہے جبکہ کسی مخصوص چیز یا صورتِ حال سے بلا وجہ، شدید ڈر لگنے لگتا ہے اگرچہ وہ

چھا جاتی ہے۔ جیسے جنگ کی ہولناکی بعض ذہنوں کو غیر معمولی طور پر متاثر کر ڈالتی ہے۔ حالات بدل جاتے ہیں، وقت گزر جاتا ہے لیکن تاثر ایک مدت تک برقرار رہتا ہے اور اضطراب کا باعث بنتا ہے۔ محاذ پر ایک ہی وقت میں لڑنے والے سب ہی فوجیوں کے ذہن پر یکساں دباؤ نہیں پڑا کرتا کیونکہ ہر ایک کا کارخانۂ طبیعت جدا ہوتا ہے۔ پہلے سے جو زائد حساس ہوتا ہے اور جس نے سامنے زندگی کا کچھ رابطہ ضابطہ تیار کر رکھا ہے، اسے حالات کی خواری اتنا ستاتی ہے کہ برداشت نہیں کر پاتا۔ کبھی کبھی دہشت زدگی کی بنا پر ذہن قطعی بے کار ہو کر رہ جاتا ہے، یا کوئی فضول خیال میں بیٹھ جاتا ہے جس کی حیثیت علامتی ہوتی ہے۔ اس صورتِ حال کو بھی گھبراہٹ اور پریشانی کا ہی دین سمجھنا چاہئے کیونکہ جتنی فکر زیادہ ہوتی ہے، اتنا ہی ردِ عمل، شدید ہوا کرتا ہے۔

دہشت زدگی کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ جسم کا کوئی عضو معطّل ہو کر رہ جائے۔ مثلاً کوئی ہاتھ بے جان ہو کر رہ جائے یا پاؤں سو جائیں۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں یا کوئی اور روگ لگ جائے۔ بعض اوقات ذہنی کشاکش کا دباؤ بھی کچھ ایسی ہی 'جسمانی معذوری' کی شکل میں نمودار ہوا کرتا ہے۔ یہاں مَن کا بوجھ تن پر آپڑتا ہے۔ ذہن اپنا تناؤ کم کرنے کے لیے یہ چال چل جاتا ہے۔ لیکن یہ جسمانی عذر ایسا عام اور بدنام ہے کہ مشکل سے کسی کو اس پر اعتبار آتا ہے۔ عموماً یہی گمان گزرتا ہے کہ ڈھکوسلہ بازی کی گئی ہے، ڈھونگ رچایا گیا ہے گویا اسے محض 'عذر لنگ' ہی سمجھا جاتا ہے جبکہ لنگ واقعی ہوتی ہے۔ بظاہر 'جسمانی معذوری' اور 'عذر لنگ' میں فرق دشوار ہے۔ بہروپیے ہر جگہ ہوتے ہیں۔ پھر بھی صورتِ حال کا جائزہ لینے سے حقیقت کا انکشاف ہو ہی جاتا ہے۔ عام بات ہے کہ امتحان کا بخار اچھے خاصے لوگوں کو چڑھ جاتا ہے، بلکہ اس سے واقعی سر میں درد ہونے لگتا ہے، فیرو نچیب کام کا نام ہی سن کر تھکن محسوس ہونے لگتی ہے۔ ایسی تمام صورتوں سے ذہنی دباؤ کے جسمانی اثرات کا صاف پتہ لگتا ہے اگرچہ ان سے سلامت روی میں کوئی ایسا فرق نہیں آتا ہے لیکن جب یہی ذہنی دباؤ اور تناؤ اتنا شدید ہو جائے کہ 'جسمانی معذوری' پیدا کر دے تو وہ مریضانہ تدارک کی حیثیت رکھتا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی نقش، دل میں اس طرح بیٹھتا ہے کہ پھر اٹھتا نہیں۔ گرفت ایسی سخت ہوتی ہے کہ کسی طور نہیں چھوٹتی۔ ہمارے [illegible] خیالات کے مٹتے ہی [illegible] رہتے ہیں خیال تکلیف دہ یا نازیبا ہوتا ہے، ہم اسے ہرگز ہرگز سوچنا نہیں چاہتے مگر بغیر سوچے رہا نہیں جاتا۔ گویا ہماری مرضی کے خلاف ہمارے ذہن میں لگاتار ایک [illegible] کھائی جاتی ہے۔ مثلاً کسی کو رہ رہ کر یہی خیال ستاتا ہے کہ وہ اگلے سال مر جائے گا کیونکہ اسی عمر میں اس کے بھائی کا انتقال ہوا تھا۔ کوئی اس [illegible] ہے کہ [illegible] باپ کا قاتل بننے کے لیے تیار رہتا ہے۔

اب ایسے برے برے خیالات ہی نہیں ستاتے بلکہ مختلف توہمات بھی پریشان کرتے ہیں۔ اسی طرح [illegible] عادت پڑ جاتی ہے جو فضول اور باعثِ شرم ہوتی ہے مگر چھوڑنے سے چھٹتی نہیں۔ مثلاً جب تک رات کو سوتے وقت گھر کے ہر ایک صندوق میں تالا نہ لگا دیا جائے، [illegible] نہ آئے۔ [illegible] کسی سے اپنے بدن کا کوئی کپڑا چھو جائے تو اسے [illegible]۔ چھپا چوری دوسروں کے خط پڑھے بغیر تسکین نہ ہو۔ جب تک [illegible] چین نہ آئے۔ جیسے کوئی معافی مانگنے کی علت میں گرفتار ہو جائے۔

ایک صاحب کو دیکھا کہ ہر ایک سے معافی مانگتے پھرتے ہیں۔ بظاہر یہ کوئی خرابی نہیں معلوم ہوتی ہے۔ دو ایک دفعہ کی ملاقات میں تو ان کی اس روش کا احساس تک نہیں ہوتا لیکن اسے کیا کہا جائے کہ اگر دن بھر میں ان سے دس بار ملاقات ہو تو دس بار معافی مانگیں۔ لوگوں سے خط لکھ لکھ کر معافی [illegible] اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی کہیں کہ اپنے مرحوم عزیزوں کی طرف سے بھی معاف کر دیجیے۔ جب سمجھاؤ کہ بلا وجہ کیوں معافی مانگتے رہتے ہو تو بڑے اطمینان سے فرمائیں کہ ’ہاں، ایسا نہیں کرنا چاہیے‘، [illegible] لیکن جب رخصت ہونے لگیں تو بغیر معافی مانگے رہا نہ جائے۔ اب خواہ خیال کی مجبوری ہو یا فعل کی، سچی بات یہی ہے کہ ’یہ خطا جان کر نہیں ہوتی‘۔ ایسے شخص کو وہمی، مراقی، خبطی کیا کچھ نہیں کہا جاتا ہے، لیکن وہ بیچارا کیا کرے، اپنے بس میں خود نہیں ہوتا۔ نہ اسے اپنے خیالات کی لپیٹ سے نکل پاتا ہے اور نہ اپنی روش چھوڑ پاتا ہے۔ ایسا کر کے پچھتاتا ہے اور بعض کیے

بھی رہا نہیں جاتا!

آپ نے دیکھا کہ خواہ یہ بات کا ڈر ہو یا ذہنی دباؤ کی وجہ سے رونما ہونے والی جسمانی معذوری۔ خیال کی مجبوری ہو یا عمل کی، سب کی سرشت ایک ہے، یعنی فکر و اندیشہ۔ تمام خرابیوں کی جڑ بار بار سے تفکرات [illegible] ان کی زد میں آجانے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ظاہر ظہور اور چھپے دبے [illegible]ے آزار ہم اپنے لیے مول لے بیٹھتے ہیں جن کا مدعا اور مقصد صرف یہی ہوتا ہے کہ ہم چین [illegible] اپنے ذہن کی تعمیری قوتوں سے کام نہ لے سکیں۔ ہماری زندگی میں جس قدر ان کا زور بڑھتا جاتا ہے، اسی قدر ہماری کارکردگی گھٹتی جاتی ہے اور ان کے ہاتھوں ہم ایسے مارے جاتے ہیں کہ کوئی رونے والا بھی نہیں ملتا بلکہ الٹی جگ ہنسائی ہوتی ہے۔ ہم اپنے 'سوزِ غم ہائے نہانی' میں بھسم ہوتے رہتے ہیں جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ 'آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں' لیکن سماج سے جملے بازی، طنز، ٹھٹول، مخول کے چھینٹے ہی نصیب ہوتے ہیں جن سے غم کی آگ کچھ اور بھڑک اٹھتی [illegible] الجھنوں میں اضافہ ہوتا ہے، کڑھن بڑھتی ہے اور بڑھتے بڑھتے بے حسی طاری کر دیتی ہے۔ [illegible] زندگی کا سارا خون، فکر کا گھن چاٹ لیتا ہے اور بدن کے کھنڈر باقی رہ جاتے ہیں جہاں رنج و مایوسی کی گھنگھور گھٹائیں برستی ہیں، شرمساری اور خواری کی کائی چڑھتی ہے اور اعصابی خلل کی گھاس پھوس اگتی رہتی ہے۔

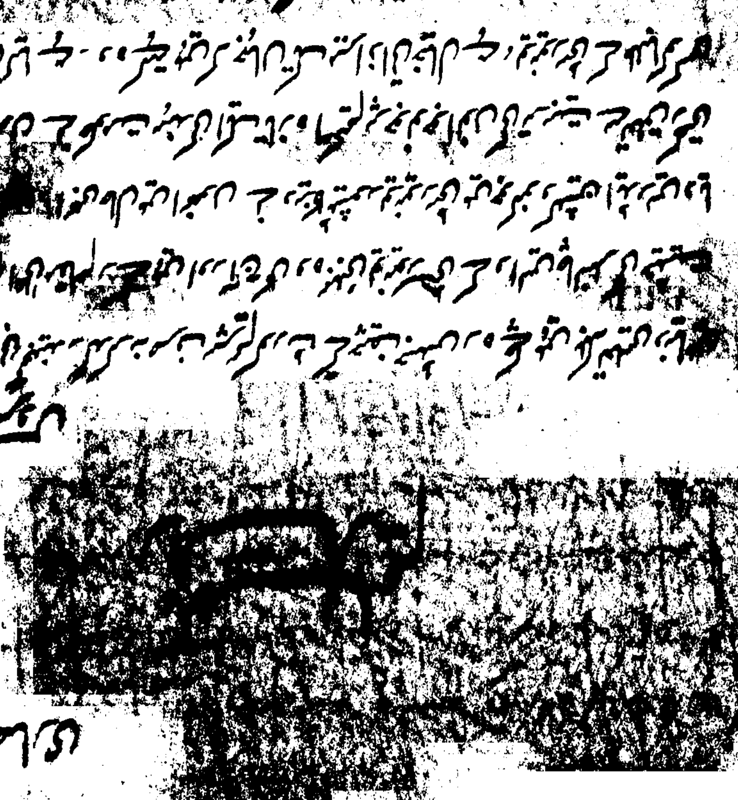
ہر وقت اپنی پریشانیوں کے خیال میں رہنے کی وجہ سے انسان، اپنی ذات کے خول میں بند ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم شعوری طور پر اپنے دھیان کو اِدھر اُدھر منتقل کرتے رہا کریں۔ ذرا سوچیں کہ یہ دنیا کتنی حسین ہے اور اس کے لوگ کتنے پیارے ہیں۔ چوبیسوں گھنٹے اپنے دھندے میں لگے رہنے اور اپنا رونا رونے کے بجائے ذرا اپنوں کی زندگیوں سے لگاؤ پیدا کریں۔ دوسروں کے غم میں شریک ہوں۔ کچھ خدمتِ خلق۔ دوستی کی مسرت حاصل کریں۔ اپنی دلچسپیوں کا دائرہ بڑھائیں۔ غرضیکہ اس دنیا میں رہنے کا حق ادا کریں۔ اس کے علاوہ اقدار اور ایمان کی حرارت و قوت سے اپنے دل کو گرمائیں اور تقویت حاصل

کریں۔ ذرا یہ تو سوچیے کہ ایسا کون ہے جس کے دل کو کبھی ٹھیس نہ لگی ہو۔ دُکھ درد ہر ایک کے ساتھ ہے۔ یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ ہم جیسا دکھیارا اس سارے جہاں میں کوئی دوسرا نہیں ہے اور میں بھرے بازار میں تنہا کھڑا ہوں'۔ یہ [illegible] کرنے کے بجائے خود اک محشرِ خیال'۔ اس طرح 'خلوت' میں بھی 'انجمن' کا مزا مل سکتا ہے۔ ذرا آنکھ اٹھا کر تو دیکھیے اردگرد کتنے لوگ جمع ہیں اور لطف کا کیا کیا سامان میسر ہے۔ بے تکلف دوست ہیں، پُر لطف دلچسپ ماحول ہے۔ معصوم بچوں کی مسکراہٹ ہے، اُن کی چھوٹی چھوٹی فرمائشیں پوری کرنے کا مزا ہے۔ بیوی [illegible] کو اپنا بنایا ہے، اس کے راز و نیاز کی عزت اور [illegible] بیوی، اپنے شوہر کی شریکِ زندگی ہے، اس تعلق کا اطمینان اور اعزاز ہے۔ بزرگوں کی شفقت ہے۔ چھوٹوں [illegible] ہے، جو تمہیں ہے؟ ان سب کی زندگیوں سے وابستگی پیدا کرنے سے زندگی خوشگوار [illegible] پھر کیسی فکر، کہاں کی پریشانی!

اپنے مسائل کو سمجھنے اور ان کا معقول حل، تلاش کرنے کی ضرورت ہے جو لوگ اس آزمائش سے بچ کر بھاگتے ہیں، ان کی طبیعت میں بَل پڑ جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہی بَل اتنی پیچیدگیاں پیدا کر دیتے ہیں کہ ذہنی آسودگی ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ لہٰذا شاہراہِ حیات پر چلنے کے بجائے، زندگی کی چور گھاٹیوں میں پناہ ڈھونڈی جاتی ہے۔ ایسے ہی شخص کو 'خللِ اعصاب' کا مریض کہا جاتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں وہمی، سنکی، مراقی، خبطی اور نہ جانے کن کن القاب و آداب سے یاد کیا جاتا ہے۔

ایسا آدمی دراصل تین بنیادی حقیقتوں یعنی سماج، کام، اور ازدواجی زندگی کی ذمہ داریوں کو نبا ہنا نہیں چاہتا ہے۔ وہ ان سے کترا کر نکل جانے کی غرض سے مختلف قسم کے پاپڑ بیلتا ہے لیکن اس دوڑ دھوپ میں اُس کی زندگی پٹری سے اُتر جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کو عام لوگوں کی زندگی سے مختلف بنانے والی چیز شدّت اور مدّت ہے۔ معقول اور نامعقول میں فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کی زندگی میں وہ کیفیات عارضی، کم اور نرم ہوتی ہیں اور دوسرے کی زندگی

میں مستقل، کثیر اور سنگین۔ فکریں س[illegible] ہوتی ہیں۔ ک[illegible] کردار کی اونچ نیچ ہر جگہ ملتی
ہے، بالکل سیدھا کوئی بھی کھڑا نہیں ہوتا۔ لیکن جہاں اتنا ج[illegible] ہو کہ صورت ہی
مسخ ہو کر [illegible] ہے۔ ایسا شخص ذہنی طور پر اتنا اپاہج ہوتا ہے [illegible]
[illegible] ندگی کے تقاضے بخوبی پورا کر سکے۔ اسے کشاکش
[illegible] ہی طیب نہیں ہو پاتی ہے اور زندگی کا قرینہ اس سے چھن چکا ہوتا
[illegible] وہ اپنے سر بس زندگی کی تہمت اٹھائے ہوتا ہے اور اس کا وجود دیدۂ عبرت [illegible]
کے لئے صرف ا[illegible] رہ جاتا ہے کہ میں ہوں اپنی شکست کی آواز!

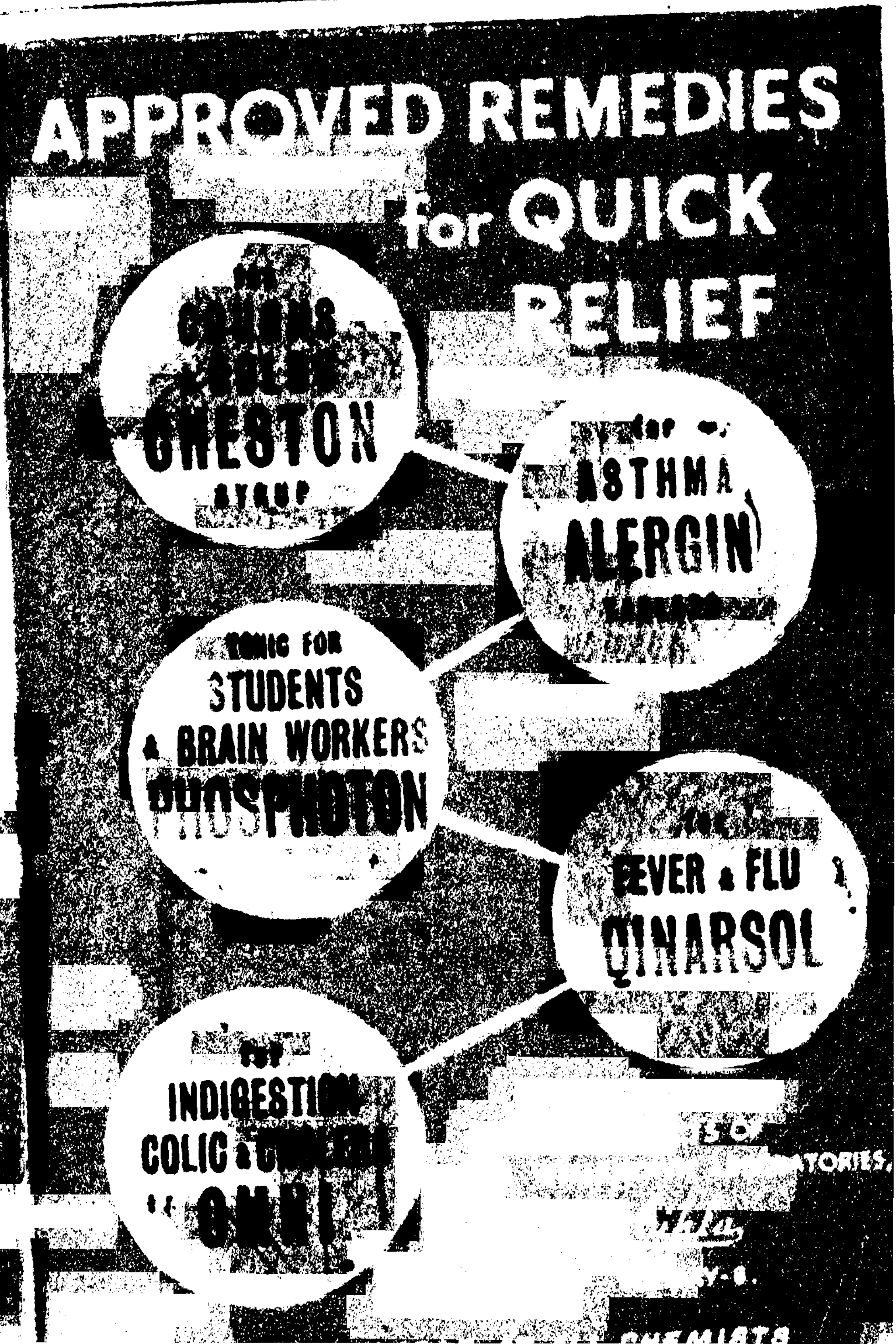


لیکن اس کے ساتھ صحیح اور مناسب فلموں کا انتخاب بہت ضروری ہے، فلم بچوں کی استعداد کے مطابق اور موضوع سے متعلق ہونے چاہئیں۔ بہتر ہے کہ فلم دکھانے سے قبل استاد انھیں دیکھ بھی لے اور طلبا سے معلوم کرے کہ وہ کس موضوع کی فلم دیکھنا چاہتے ہیں اور کیوں؟ پھر اس کے ساتھ فلم دکھانے کے بعد جماعت میں بحث و گفتگو بھی ہونی چاہئیے تاکہ اس کا پورا مقصد حاصل ہو۔ طلبا پر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرا دینی چاہئیے کہ تفریحی فلم بلکہ کسی تعلیم اور تدریس کی غرض سے دکھائی جا رہی ہیں۔ افسوس ہے کہ ہندوستان میں تعلیمی غرض سے فلم بنانے پر ابھی تک بہت کم توجہ کی گئی ہے، البتہ بعض ممالک کے سفارت خانوں ... ایجنسیوں سے ... بہت فلم مل سکتے ہیں، ورنہ اس ضرورت کو پورے طور پر پورا ہونے کے لئے ابھی وقت اور سرمایہ کا انتظار کرنا ہوگا۔

اصلاح تعلیم :

دہلی ایڈمنسٹریشن نے اس پنجسالہ پلان میں یہ طے کیا ہے کہ وہ اگلے سال سے کم سے کم ۰ اسکول ہر سال ایسے کھولے گی جن کا ذریعہ تعلیم ہندی ہوگا اور جو اپنے معیار میں پبلک اسکولوں کے برابر ہوں اور اس طرح وہ ہندوستان سے پبلک اسکولوں کا خاتمہ کرنا چاہتی ہے۔ ایڈمنسٹریشن کی اور اصلاحات میں ایک کتابوں کا "بینک" ہوگا، ابتدائی اور ثانوی مدارس کے بچوں کے لئے حلقہ مطالعہ اور ذہین اور اچھے بچوں کے لئے "گرمائی مدرسہ" کا انتظام ہوگا۔


SHARBAT
NAZLA



جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ [illegible]

[illegible] پچاس پیسے

جلد [illegible] | بابت ماہ جون ۱۹۶۸ء | شمارہ [illegible]

فہرست مضامین

مجلس ادارت

[illegible] ڈاکٹر سیّد عابد حسین

[illegible] اللہ ضیاء الحسن فاروقی

[illegible]

مُدیر

ضیاء الحسن فاروقی

خط وکتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۲۵

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی یونین پریس دہلی ٹائیٹل: جمال پریس دہلی

شذرات

اس وقت ہماری سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ ہمارا ضمیر ظلم و عدوان پر بے چین تو ہوتا ہے لیکن وہ
جوش پیدا نہیں کرتا جو غیرت پر ظلم کا مقابلہ کرنے کے لئے صالح طبیعتوں کو آمادہ کرتی ہے، ہم بھی محفلوں
میں بگڑے ہوئے حالات کا ماتم تو کرتے ہیں لیکن ان حالات کی اصلاح کے لئے کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتے
... پر تقریریں اچھی کر لیتے ہیں لیکن اپنی بے عملی کے سبب ٹوٹے ہوئے، مایوس اور ہراساں
دلوں میں امید و یقین کی شمع روشن نہیں کر سکتے، یہ صورت حال اخلاقی انحطاط کی وہ منزل ہے جس کے بعد
... بے شمار راہیں کھلتی ہیں، اور تاریخ عالم میں ایسی ان گنت شہادتیں موجود ہیں کہ قومیں
اس منزل پر پہونچ کر دائمی ذلت و نکبت کا شکار ہو گئیں۔

... ملک کا حال یہ ہے کہ اگر فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمان کا نقصان کتنا ہوا
اور ہندو کا کتنا، اگر ہریجنوں کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے تو غیر ہریجن اسے اپنا مسئلہ نہیں سمجھتے، کسی شہر میں اگر
ایک خاص علاقہ کے باشندوں یا ایک خاص زبان بولنے والوں کے ساتھ ظلم ہوتا ہے، تو دوسرے علاقے یا زبان
کے افراد اس لئے خوش ہیں کہ وہ محفوظ رہے، جہاں ظلم و عدوان ہندو مسلم، ہریجن غیر ہریجن، شمالی اور
جنوبی، بنگالی اور غیر بنگالی وغیرہ ناموں سے موسوم ہو جائے، وہاں انسانیت اور شرافت کا ذکر کون
کرے؟ جہاں چھوٹی چھوٹی علاقائی وفاداریوں کے نام پر بھائی بھائی کا گلا کاٹے وہاں کسی بڑے نصب العین
یا کسی بڑی اخلاقی قدر سے وفاداری کا چرچا کون کرے؟ جہاں خود غرضی ہی اوڑھنا بچھونا بن جائے
وہاں بے غرضی اور ایثار و قربانی کے لئے کیا گنجائش؟ افسوس کے ساتھ کہنا پڑ...

کچھ اسی قسم کے اخلاقی مرض میں مبتلا ہو گئی ہے، ہم اپنے اس مرض کا علاج جتنی جلدی ڈھونڈ لیں اتنا ہی ہمارے

اچھا سماج کسے کہتے ہیں؟ ہماری رائے میں اچھا سماج وہ ہے جہاں ظلم کہیں پر ہو، کسی پر ہو، ہر شخص یہ سمجھے ظلم اسی پر ہوا ہے، جب تک اعلیٰ شہریت کی یہ خوبی ہم میں نہ ہوگی، اچھے سماج کی تعمیر کا خوش آئند خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا ... ہم ظلم کو ہندو مسلم کی عینک سے دیکھنا ترک کر دیں گے تب اگر ہندو پر ظلم ہوگا تو مسلمان بے تاب ... اور مسلمان پر ہوگا تو ہندو تڑپ اٹھے گا، سوال ہے کہ کیا ہماری قوم میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ ظلم کو ظلم سمجھے خواہ وہ اس کے کسی فرد پر ہو؟ ہمیں اس سوال کا جواب دینا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ ہماری قوم کی اکثریت برائی کو برائی سمجھتی ہے ظلم کو پسند نہیں کرتی، حب الوطنی کا جذبہ بھی ہے اس میں، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ برائی اور ظلم کی ضرب جب تک خود کسی فرد یا طبقہ پر نہ پڑے، وہ خاموش تماشائی کی حیثیت سے سب کچھ دیکھتا رہتا ہے اور کچھ نہیں کہتا۔ یہاں ایک چھوٹی سی مثال دی جاتی ہے، دہلی کے شہر میں بسیں چلتی ہیں، بسوں میں عورتیں بھی ہوتی ہیں اور مرد بھی، کبھی کبھی دیکھنے میں آتا ہے کہ چند لڑکے عورتوں کے ساتھ بدتمیزی کرتے ہیں، رکیک فقرے کستے ہیں، گندے اشارے کرتے ہیں، لوگ یہ سب کچھ دیکھتے ہیں، سمجھتے ہیں لیکن کچھ نہیں کہتے، ساٹھ ستر آدمیوں کی اس بس میں چند اوباش لڑکے شرافت کا منہ چڑاتے ہیں اور باقی سب لوگ بے بس نظر آتے ہیں، یہی صورت حال بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات کے موقعوں پر دیکھنے میں آتی ہے، لوگوں کی اکثریت جلتی ہوئی دکانوں اور تڑپتی ہوئی لاشوں کے مہیب منظر کی تاب نہیں لا سکتی لیکن یہ ہمت یا توفیق نہیں ہوتی کہ نکل کر آگے آئے اور فسادیوں کو للکارے، جب بے حسی یا کم ہمتی کا یہ عالم ہو تو پھر غیرت قومی اور جرات رندانہ کی بات کیسے کی

لیکن غیرت و جرات ... ان کی سی صو... کو کوئی نہیں

ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب اس طرح کی تقسیم ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہیں کر سکتا، یہ تفریق ہم نے کی ہے
ہم انسانوں نے اور ہمیں [illegible] نام نہاد تقسیم
ہے بھی توانائی ملتی [illegible] تفریق کو باقی [illegible] لئے کوشاں ہیں۔ ہمیں
[illegible] کے لئے بھی ان ظلمت پسند [illegible] سے نبرد آزما [illegible]

[illegible] ہم جانتے ہیں کہ مایوس نہ ہونا اللہ کی رحمت ہے، اس دنیا میں انسان نے
[illegible] پر بڑا ظلم کیا ہے، لیکن خدا انسان سے مایوس نہیں، ہر بچہ جو اس دنیا میں آتا ہے درحقیقت پیغام
[illegible] خدائے ذوالجلال کا کہ وہ انسانوں سے مایوس نہیں، اس لئے دل کسی طرح یہ ماننے کے لئے تیار
نہیں کہ ہماری موجودہ حالت میں اصلاح نہیں ہوگی، ہماری قوم کا ضمیر ابھی زندہ ہے اور یہی وجہ
ہے کہ اب ہمارے کانوں میں ایسی آوازیں آ رہی ہیں کہ ملک تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے، اور ہمیں
اسے بچانے کے لئے کچھ کرنا ہے، چند سال قبل ایسی ایک یا دو آوازیں ہوا کرتی تھیں، اب ہر طرف
سے یہ صدا آ رہی ہے، خطرے کا احساس قوی ہو گیا ہے، ایسے لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو ظلم کے
خلاف آواز بلند کرنے لگے ہیں، یہ علامت امید اور حوصلے کی ہے، کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ان
آوازوں کی تعداد میں اور اضافہ ہو اور جلد اضافہ ہو، یہ منظم ہو جائیں اسی طرح جیسے تسلطائی عناصر منظم
ہیں، ہم کسی طرح کی غلامی برداشت نہیں کر سکتے، پہلے بدیسیوں کی غلامی کا طوق ہمارے گلے میں تھا،
اب ہمارے اپنے ہی ہمیں غلام بنانا چاہتے ہیں، ہمیں مل کر ایسے عناصر کا مقابلہ کرنا ہے اور اس ملک
میں شریف انسانوں کا سماج بنانا ہے جو جمہوریت اور انسانیت کا احترام کریں، جو معاشی اور سماجی
انصاف کے قیام کے لئے سینہ سپر رہیں، جو دوسروں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھیں اور اس بات
کو ہمیشہ یاد رکھیں کہ حقیقی انصاف وہ ہے جو نہ صرف اصولی طور پر انصاف ہو بلکہ عملاً بھی انصاف ہو۔
[illegible]

ضیاء الحسن فاروقی

افکار آزاد

اور

چند قومی مسائل

آج ہماری قوم جس اخلاقی اور روحانی بحران میں مبتلا ہے اور ملک کو جو حالات درپیش ہیں [illegible] طبقہ واقف ہے، ایسے میں صورت حال پر قابو پانے اور ملک کو حقیقی ترقی، سچی آزادی [illegible] مستقبل کی راہ پر ڈالنے کے لئے ہم مولانا آزاد کی شخصیت و زندگی [illegible] حالات سے کیا روشنی حاصل کر سکتے ہیں اور روشنی حاصل کر بھی سکتے [illegible] ہیں نے صحیح سمجھا ہے تو یہی آج کی بحث کا موضوع ہے۔

[illegible] ضروری سمجھتا ہوں کہ دانشوروں کی اس مجلس میں مولانا آزاد کے حالات زندگی [illegible] ذکر کروں جن کے وہ حامل تھے، وہ خوبیاں گناؤں جو اُن کی عظمت کے مختلف گوشوں سے متعلق ہیں، ان کے علم و فضل، اُن کی نقید المثال خطابت، اُن کے [illegible] اُن کی نورانی فراست، یہ تمام باتیں جانی پہچانی ہیں، ہاں دو ایک باتیں ہیں جن کی طرف آپ کی توجہ [illegible] دلاؤں گا اور وہ یہ کہ فکر و عمل کی جیسی خوشگوار، فعال اور

نوٹ : یہ مضمون ۱۴ اپریل ۱۹۸۸ء کو نئی دہلی کے مولانا آزاد سیمینار میں پڑھا گیا تھا اور اس پر بحث و گفتگو بھی ہوئی تھی [illegible] سیمینار کی مکمل روداد بھی شامل ہوگی۔

۲۔ وہ افکار و خیالات جن کا تعلق بظاہر مخصوص طور پر اسلام اور مسلمانوں سے ہے، لیکن بنیادی طور پر ان کا تعلق پوری قوم سے بھی ہے اور اس طرح ہے کہ اگر کوئی طبقہ مذہبی معاملات میں جمود و تعطل اور معاشرتی امور میں الحاد گی پسندی اور ظلمت پسندی کا شکار ہو جائے تو [illegible] قوم کو نقصان [illegible] رساں نہیں ہو گا۔

قومیت اور وطنیت کا مسئلہ ہمیشہ سے مسلمانوں میں ایک [illegible] میں اس مسئلہ پر کافی ہنگامہ آرائی تھی، اُس وقت مسلمانوں کی معتدبہ اکثریت کا اس سلسلہ میں جو خیال تھا اُس کی ترجمانی اقبال کے اس مصرع سے بخوبی ہو جاتی ہے۔

[illegible] کا کفن ہے

[illegible] میں مولانا آزاد نے جو موقف اختیار کیا وہ مسلم لیگی قیادت [illegible] کے دور میں [illegible] کی اکثریت سے بالکل مختلف تھا، اور ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ مولانا کے سیاسی [illegible] کی تشکیل [illegible] پسند انقلابیوں کی تحریک کا اولین حصہ تھا، بنگال کے انقلابیوں سے اپنے [illegible] نے ہماری آزادی (INDIA WINS FREEDOM) میں بیان کی [illegible] کہانی کے ضروری ٹکڑے درج ذیل ہیں:

[illegible] دونوں انقلابی جماعتیں اپنے کارکن صرف متوسط طبقے کے ہندوؤں سے چنا کرتی تھیں [illegible] یہ ہے کہ تمام انقلابی جماعتیں مسلمانوں کی مخالفت میں سرگرم تھیں، وہ دیکھتی تھیں کہ برطانوی حکومت نے ہندوستانی تحریک آزادی کی مخالفت میں مسلمانوں کو آلۂ کار [illegible] اور مسلمان اس کے اشاروں پر چلتے ہیں ..... انقلابی محسوس کرتے تھے کہ مسلمان حصول آزادی کی راہ میں ایک رکاوٹ ہیں۔[1]

[illegible] سندر چکرورتی نے دوسرے انقلابیوں سے میرا تعارف کرایا اور ان [illegible] نے دیکھا کہ میں خوشی سے ان کے ساتھ شریک ہونے کو تیار ہوں تو انھیں

بہت حیرت ہوئی، شروع میں ان کو میرے اوپر بھروسہ نہیں تھا اور انھوں نے مجھے اپنی
مخصوص محفلوں سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ رفتہ رفتہ انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور مجھے
[illegible] ان کا اعتماد حاصل ہو گیا۔ میں نے [illegible]
[illegible] ملانا چاہا کہ ان کا یہ خیال غلط ہے کہ مسلمان بہ حیثیت ایک جماعت کے ان [illegible]
اور یہ مناسب نہیں ہے کہ [illegible] لازموں [illegible] ہے جو انہیں
[illegible] تمام حقیقت سمجھ بیٹھیں [illegible]
[illegible] حاصل کرنے [illegible] انقلابی کارروائیوں میں سرگرمی دکھائے
[illegible] ہندوستان کے مسلمان بھی سیاسی جدوجہد میں شریک ہو جائیں گے اگر ہم ان میں
کام کریں اور انھیں اپنا دوست اور ساتھی بنائیں۔ میں نے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ اگر
[illegible] میں سرگرم یا سیاسی تحریک سے بے تعلق بھی رہے تو آزادی حاصل کرنے
[illegible] زیادہ دشوار ہو جائے گی، اس لیے ہمیں ہر ممکن کوشش کرنا چاہیے کہ اس جماعت
کی تائید اور دوستی حاصل کریں۔

"پہلے تو میں اپنے انقلابی دوستوں کو یقین نہ دلا سکا کہ میری سیاسی تشخیص صحیح ہے، مگر
وقت کے ساتھ ان میں سے بعض میرے ہم خیال ہو گئے۔ اسی درمیان میں میں نے مسلمانوں
میں کام شروع کر دیا تھا اور میں نے دیکھا کہ نوجوانوں کی ایک جماعت ہے جو نئے سیاسی
منصوبوں کی ذمہ داریاں اٹھانے کو تیار ہے۔ [illegible]

یہ واقعہ مولانا کے پہلی بار ہندوستان سے باہر جانے سے پہلے کا ہے۔ اس سے ایک طرف
یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مولانا آزاد علی گڑھ پارٹی کی انگریز دوستی [illegible] کے اس وقت سے
[illegible] مخالف تھے اور قومی تقاضوں کا بھرپور شعور رکھتے تھے، دوسری طرف یہ بات بھی ان [illegible]

[illegible] آزادی، صفحہ [illegible]

نہیں ہونا چاہیئے ....

"حالانکہ نہ تو اسلام کی وسعت نظر کے یہ معنی ہیں کہ وہ قومیت کے ساتھ جمع نہیں ہو [illegible]
نہ قومیت کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ اسلام [illegible] دائرہ [illegible]
جائے، یہ دونوں صورتیں افراط و تفریط میں داخل ہیں اور ہر معاملہ کی طرح یہاں بھی
حقیقت اطراف میں نہیں بلکہ وسط میں ڈھونڈنی چاہیے۔"

[illegible] موقف بڑے گونجتے [illegible] و لہجہ میں واضح
کیا:

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ [illegible]
کی شاندار روایتیں [illegible] ورثہ میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا
[illegible] ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون،
اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں
[illegible] ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں ایک خاص ہستی رکھتا ہوں
[illegible] برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے
[illegible] اور احساس بھی رکھتا ہوں، اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی
[illegible] میری رہنمائی کرتی ہے، میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی
ہوں، میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا عنصر ہوں [illegible]
متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے،
[illegible] کی تکوین کا ایک ناگزیر عامل ہوں، میں اپنے اس دعوے سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا۔"

۱۔ مضامین ابو الکلام آزاد [illegible]، "اسلام اور قومیت"، لاہور، [illegible] ۱۴۴ تا ۱۴۳

۲۔ خطبات آزاد، مرتبہ شورش کاشمیری، مکتبہ [illegible] ۳۶۱ ۔ ۳۶۹

میں سمجھتا ہوں کہ آج کے حالات میں بھی ایک محب وطن مسلمان کا یہی موقف ہونا چاہیئے اور اسے بغیر کسی جھجک کے خود اعتمادی کے ساتھ اس کا اعلان کرنا چاہیئے۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسری مذہبی اقلیتوں، خصوصًا عیسائیوں کو بھی اسی موقف کو بہ اصرار پیش کرنا چاہیئے، اور ہندو اکثریت کو اس حقیقی جذبے [illegible] صداقت و تسلیم کر [illegible] ستان کے اتحاد کو مستحکم بنانا چاہیئے، بقول مولانا کے "ہندوستان کے لئے قد [illegible] تھا کہ اس کی سرزمین [illegible] مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف [illegible] کے قافلوں کی منزل بنے۔" قدرت کا یہ فیصلہ احیائی تحریکیں بدل نہیں [illegible]، ہاں اُن کی سرگرمیوں سے ملک کے اتحاد اور قومی یکجہتی کو نقصان پہونچ سکتا ہے، [illegible] مسلمانوں کو بھی [illegible] کا یہ فیصلہ مان لینا چاہیئے، جس ماضی کا وہ خواب دیکھنا چاہتے ہیں وہ اب [illegible]، ہندوستان میں غیر مسلم اکثریت کے ساتھ مشترک زندگی ان کے لئے مقسوم ہو چکی ہے، جو سانچا ڈھل چکا ہے اب وہ ٹوٹ نہیں سکتا، بھلا اسی میں ہے کہ کسی اور جانب دیکھنے کے بجائے وہ یہ دیکھیں کہ اِس ملک میں جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کی حامی کون سی طاقتیں ہیں، ان طاقتوں کے ساتھ وہ اُس میدان کارزار میں ہمت کے ساتھ کود پڑیں جہاں جمہوریت اور سیکولرزم کے لئے جنگ لڑی جا رہی ہے، اس سے متحدہ قومیت کے تصور کو تقویت ملے گی، اور ملک کی بھلائی کے ساتھ خود اُن کی بھلائی ہوگی، علاحدگی پسندی کا رجحان انھیں چھوڑنا ہوگا، بالکل اسی طرح جیسے الہلال کی للکار سے وہ آزادی کی جنگ میں کود پڑے تھے، آج انھیں ملک اور قوم کی نیک نامی کے لئے ان تمام ظلمت پسند قوتوں سے نبرد آزما ہونا ہے جو ملک کو تباہی و بربادی کی طرف لے جا رہی ہیں۔

ہزار برس سے زیادہ کا عرصہ گذرا کہ مسلمانوں کے تعلقات ہندوستان سے بڑھے، اور پھر رفتہ رفتہ ان کے قدم جم گئے اور یہاں کی آبادی کا ایک حصہ بن گئے، لیکن ہندوؤں مسلمانوں کے ہزار سالہ تعلقات میں بھی ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ ہندوؤں نے اسلام کو اور مسلمانوں کے مذہب و حرم کو سمجھنے کی کوشش کی ہو، مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے، لیکن میرا احساس یہی ہے،

بدقسمتی سے غلامی کے دور میں بیرونی اقتدار نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جان بوجھ کر غلط فہمی پیدا کی اور اس کے لئے تاریخ کو مسخ کر ڈالا، پھر ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھی ایسے ظلمت پسند لوگوں کی کمی نہیں رہی جنھوں نے زبان اور کلچر کے نام پر ایسی کتابیں اور مضامین لکھے جن سے رومانوی علاحدگی پسندانہ طرز فکر کو تقویت ملی، اور اسی کے لئے انھوں نے، محب وطن ہونے کا دعویٰ کر کے بھی تاریخ کو غلط رنگ میں پیش کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ خلیج بڑھتی گئی، آج بھی زبان اور کلچر کے نام پر ہنگامہ برپا ہے اور درسگاہوں میں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے وہ عام طور سے جانبدارانہ نقطۂ نظر سے لکھی جاتی ہے، اسکولوں میں نصاب کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اُن میں غلط تاریخی واقعات کچھ اس انداز سے ترتیب دئے اور بیان کئے جاتے ہیں کہ طالب علموں کے خام ذہنوں میں مسلمانوں کی طرف سے بدگمانی پیدا ہوتی ہے اور یہ تاثر مرتب ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تہذیبی رنگا رنگی کی قسم کی کوئی چیز نہیں، مولانا آزاد کی نظر کے سامنے یہ تمام چیزیں تھیں اور وقتاً فوقتاً اس صورت حال کی مضرت رسانی کی طرف وہ متوجہ بھی کرتے تھے، ۱۹۲۹ء میں 'نیشنل تحریک' کے عنوان سے انھوں نے ایک رسالہ لکھا تھا مگر یہ رسالہ چھپ نہیں سکا، ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اپنی تازہ تصنیف مولانا ابوالکلام آزاد میں اس کے کچھ ٹکڑے نقل کئے ہیں، میں اسی سے ذیل کا اقتباس دیتا ہوں لیکن اس سے قبل یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی تاریخ کے متعلق مولانا کا نظریہ یہ تھا کہ وہ از سر نو لکھی جائے اور پوری غیر جانبداری سے لکھی جائے، انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن کے جلسوں میں وہ مؤرخوں کو اُن کا فرض یاد دلاتے رہتے تھے، اور غالباً ۱۹۵۱ء میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ " انگریزوں کے عہد میں لکھی ہوئی تاریخ قابل اعتبار نہیں سمجھی جا سکتی کیونکہ تاریخ داں خواہ غیر ملکی طبقے کے حامی ہوں یا محبانِ وطن، دونوں جانبدار رہے ہیں، لہٰذا آزاد ہندوستان کے مورخ کا فرض ہے کہ اپنے فرائض سے کما حقہ، عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے" نیشنل تحریک کے قلمی مسودہ میں مولانا نے کلچر اور تہذیب کے مسئلہ پر لکھا کہ

" اگر سمپورنانند جی نے یو، پی، اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ تعلیم کے مسئلہ میں

[illegible] ذرو بعد ایک نئی تفریق "پراونشیلزم" کی بڑھتی جارہی ہے۔ "مائی انڈیا" کی جگہ "مائی بنگال" کی صدائیں میں ہمیشہ سنتا رہتا ہوں، ... آپ یقین کیجئے کہ یہ چیز آگے چل کر انڈین نیشنلٹی کے لئے سخت مضر ہوگی۔[1]

مسلمانوں کی مذہبی اصلاح سے متعلق مولانا کے افکار و خیال [illegible]

سب سے پہلے ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ [illegible] نے شاہراہ عام سے کٹ کر ایک الگ راہ اختیار کی۔ میرے خیال میں سب سے پہلے اُن کی صالح [illegible] [illegible] میں جیسے، سو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شک اور اضطراب نے ان کو [illegible] کو بے چین کیا اور وہ حقیقت کی تلاش و جستجو میں نکل کھڑے [illegible] صفحات پر [illegible] غبار خاطر [illegible] ذکر کیا ہے، صالح [illegible] سے سرسید کی عقل [illegible] شکوک [illegible] جیسا کہ "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" کے مرتب نے لکھا ہے سرسید کی تقلید [illegible] بھی جلدی اتر گیا "شکوک و کاوش نے اور مزید وسعت اختیار کی اور سرسید کی انتہائی بلند پروازیاں بھی وہاں ساتھ دینے سے درماندہ ہوگئیں۔" اس کے بعد حیرانگی و سرگشتگی، شک [illegible] جنہیں ان کو طے کرنا پڑی ہوں گی اُن کا احساس و ادراک ہم سرگشتگانِ [illegible] رسوم و قیود نہیں کر سکتے، بالآخر مولانا کو "اوہام و خیالات کی گہری تاریکیوں کے [illegible] مل گئی جو یقین اور اعتقاد کی منزل مقصود تک چلی جاتی ہے۔" فکر و نظر کے ایسے [illegible] طے کرنے کے بعد [illegible] مذہب کی اُس حقیقت کا سُراغ مل جاتا ہے جسے حقیقی مذہب یا [illegible] کہتے ہیں، وہ تقلید کی ہر زنجیر کو توڑ ڈالتا ہے، جمود کو ایک لمحہ کے لئے گوارا نہیں کر سکتا اور زندگی کو ارتقا یعنی مسلسل، بتدریج، فطری ترقی سے تعبیر کرتا [illegible]

---

[1] ذکر آزاد، صفحات [illegible]

قرائن سے صاف پتہ چلتا ہے اور کہیں کہیں ذکر بھی ملتا ہے کہ مولانا پر عالم عرب کی سلفی تحریک کا بھی اثر پڑا تھا، [illegible] المنار گروپ نے دنیائے اسلام کے علمی ماحول میں ایک حرکت پیدا کر رکھی تھی، تذکرہ میں ابن تیمیہ سے مولانا کی جس گہری [illegible] افادہ ہے۔ یو جمل جامد اسلام کی تقلیدی ذہنیت سے متنفر اور قرن اول کے اسلام کی سادگی اور حرکی خصوصیت کے شیدائی تھے، مولانا کی خواہش تھی کہ طبقۂ علماء پر جس کے ہاتھوں میں مسلمانوں کی روحانی و اخلاقی تعلیم و تربیت کا کام ہے، یہ حقیقت روشن ہو جائے کہ جسے وہ اسلام سمجھ رہے ہیں وہ حقیقی اسلام نہیں ہے، درس نظامیہ جس کی نصابی کتابوں کو خود انھوں نے پڑھا تھا، موجودہ دور میں مسلمانوں کی ذہنی ترقی کا سامان فراہم نہیں کرسکتا۔ علماء کی اخلاقی حالت سے بھی وہ مطمئن نہیں تھے۔ ندوۃ العلماء کے حلقہ کے علماء کو وہ روشن خیال سمجھتے تھے لیکن جب انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو انھیں بہت مایوسی ہوئی، مولانا اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اس کے آرزومند رہے کہ عربی مدارس کے نصاب میں ضروری اور تقاضائے وقت کے مطابق تبدیلیاں کرلی جائیں، علماء الگ الگ اُن کی باتیں مان لیتے تھے اس لئے کہ درس نظامیہ کی خرابیوں اور کوتاہیوں پر اُن کی جو دلیلیں ہوتی تھیں اُن کا کوئی توڑ علماء کے پاس نہیں تھا، لیکن جب باہم مل بیٹھ کر مجوزہ تبدیلیوں کے نتائج پر غور کرتے تھے تو انھیں اپنے اپنے خاندان کے اور اپنے طبقے کے خود غرضانہ مفادات کی تباہی نظر آتی تھی، اس لئے صاف، دیدہ و دانستہ غفلت کی چادر تان لیتے تھے، چند جو نیک نیت تھے تقلید اور اسلاف پرستی کی بیڑیاں کاٹ نہیں سکتے تھے، نہیں کہا جاسکتا کہ طبقۂ علماء کے اس رویے سے مسلمانوں کو کتنا عظیم نقصان پہونچ چکا ہے اور آئندہ بھی پہونچے گا، مولانا کے دل پر یہ داغ بہت گہرا تھا اور اسے [illegible] اس دنیا سے لے گئے،

میں یہ مانتا ہوں کہ کوئی قوم اپنی تاریخ اور ماضی سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کرسکتی، لیکن

[illegible]ی کا غلط احترام قوموں کی فطری ترقی کو روک دیتا ہے، قرآن مجید زندگی کو متحرک اور متغیر [illegible]
[illegible] ہے، ماضی کا غلط احترام حرکت اور تغیر کی نفی کرتا ہے، اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ عہد وسطیٰ [illegible]
[illegible] قرآن کی اندرونی روح کے منافی تھا، اس [illegible] کے چیلنجوں کا مقابلہ نہیں کر [illegible]
تھا، اور یہی وجہ ہے کہ ساری دنیائے اسلام رفتہ رفتہ ان چیلنجوں کے [illegible] سرنگوں ہو گئی،
اس تاریخی حقیقت [illegible]
تعلیمات کی اندرونی روح کے سمجھنے میں عمر کا ایک بڑا حصہ صرف کیا اور پھر ان تعلیمات کو اپنے
[illegible] انداز بیان کے سہارے ہزاروں انسانوں کے دلوں میں اتار دیا، طبقۂ [illegible] کے
[illegible] اور تفسیر کو مستند نہیں سمجھتا، اور باتوں کے علاوہ سب سے بڑی شکایت [illegible] وہ
[illegible] پیش کرتے ہیں، مولانا کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ اپنی [illegible] نہیں
[illegible] نے قرآن کی سادہ، فطری اور دل میں اتر جانے والی تعلیمات
کو پیش کیا ہے، حقیقت ایک ہے، سچائی ایک ہے، مختلف مذاہب اپنے اپنے طریقے سے اس
سچائی کی طرف [illegible]، اس لئے جھگڑا درحقیقت مذاہب میں نہیں ہے، بلکہ مدعیان مذاہب
[illegible] کی حقیقی روح کو اگر لوگ سمجھ لیں تو سب خدا کے پرستار اور اعمال صالحہ کے
[illegible] عمل صالح وہ قدر ہے جو کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے تمام مذاہب میں تقریبا
یکساں ہے، پھر مذہب کے نام پر یہ نزاعات کیوں؟

[illegible] یا اس فتنہ کا جسے مولانا فتنۂ قبور کہتے ہیں، غرض زندگی کا کوئی
معاملہ ہو [illegible] قانونی نقطۂ نظر سے جلب مصالح اور دفع مفاسد کا کلیہ سامنے رکھتے
ہیں [illegible] کے خیال میں مسلم سوسائٹی زمانے کے ہر تقاضے کا جواب دے سکتی ہے
بشرطیکہ ذہن کے دریچے بند نہ ہوں، آنکھیں کھلی ہوں اور کان وقت کی پکار سن رہے ہوں۔
[illegible] کہ اگر مسلمان اس حقیقت کو سمجھ لیں تو وہ اپنی زندگی سنوار سکتے ہیں اور جس
ملک میں رہتے ہیں اس کی تعمیر و ترقی میں بھی ممتاز حصہ لے سکتے ہیں، کیونکہ اس سے ان میں [illegible]

ترقی پسند اور روشن خیال عناصر کے ساتھ مل کر مسلمان ہندوستان میں تاریخی رول ادا کر سکتے ہیں بشرطیکہ اُن میں عزم اور یقین ہو، اور یہ عزم و یقین اسی طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ مسلمان عہدِ وسطیٰ کے جامد، غیر متحرک اور بے جان اسلام کی سرحدوں کو عبور کر کے قرنِ اول کے اسلام کی طرف جائیں جس کی بے میل فطری سادگی عزم و یقین اور عمل صالح کے لئے مہمیز کا کام کرتی تھی، جو علم کا مخالف نہیں تھا، جو ترقی کا دشمن نہ [illegible] اور اس کے اعلیٰ مقاصد کو بڑھاوا ملتا تھا۔

[illegible] مولانا [illegible] کرتے تھے [illegible] انھیں کاسہ لیسی کی زندگی گذارتے دیکھنا چاہتے تھے، کوئی موت جماعتی [illegible] سے زیادہ کربناک موت نہیں ہو سکتی، وہ مسلمانوں کو سرتاپا عمل دیکھنا چاہتے تھے کہ جس طرح ماضی میں مسلمانوں نے تاریخِ ہند میں کئی روشن بابوں کا اضافہ [illegible] ہے اسی طرح مستقبل کی تاریخ میں بھی اُن کے لئے نمایاں جگہ ہو، آج سے بہت پیشتر مولانا نے [illegible] میں جو کچھ لکھا تھا اُس کے الفاظ و معنی میں تھوڑی سی ردوبدل کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت بھی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے اُن کا وہی پیغام ہے،

[illegible] ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی، یقیناً ایک دن آئے گا.... اور وہ سب کچھ ہو چکے گا جس کا ہونا ضرور ہے، فرض کر لیجئے کہ اس [illegible] ملک ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی تو آپ کو معلوم ہے کہ اس میں ہندوستان کے [illegible]مانوں کے متعلق کیا لکھا جائے گا

[illegible] لکھا جائے گا کہ ایک بدبخت اور زبوں طالع قوم جو ہمیشہ ملکی ترقی کے [illegible]، ملک کی فلاح کے لئے ایک بدقسمتی، حاکمانہ طمع کا کھلونا اور ہندوستان کی پیشانی پر ایک کہر آلود ہن کر رہی"

بات ذرا کڑوی ہے لیکن سچی ہے، میں مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ اس سرزمین کی [illegible]

[illegible] الٰہیہ کی آنکھیں انہیں کی طرف لگی ہیں کہ وہ خود اعتمادی، عزم اور یقین کے ساتھ اٹھیں، اپنی ظلمت پسندی، اپنے خول میں سکڑ بیٹھنے کے رجحان اور اپنے [illegible] اٹھیں اور اُس میدان کارزار [illegible] جہاں حق و باطل میں نبرد آزمائی ہو رہی ہے، جہاں [illegible] اپنے بے شمار دشمنوں کے نرغے میں ہیں، اسی طرح اور صرف اسی طرح وہ مشیت الٰہی کی تکمیل میں حصہ لے سکتے ہیں، اور یہی اور صرف یہی وہ طریقہ [illegible] وہ مادرِ وطن کے ماتھے کا ٹیکہ بن سکتے ہیں۔

روشؔ صدیقی

شمعِ تنہائی

نقابِ شب میں چھپ [illegible] کی یاد آئی سمجھتے ہیں
[illegible] ہم [illegible] تنہائی سمجھتے ہیں

نہ سمجھیں بات [illegible] کی ہم اتنے بھی نہیں ناداں
کہاں تک ہے بساطِ عقل و دانائی سمجھتے ہیں

[illegible] پھر توجہ ہے، مگر ہم تیرے دیوانے
تغافل کو بھی اک اندازِ رعنائی سمجھتے ہیں

ہمیں ناآشنا سمجھو نہ رسم و راہِ منزل سے
کہاں لے جا رہا ہے ذوقِ رسوائی سمجھتے ہیں

ہم ایسے سرپھروں کو کام کیا ہے مرگ و ہستی سے
[illegible] شوخیٔ نازِ مسیحائی سمجھتے ہیں

ہم اے خلوت نشیں، آخر ہیں تیرے دیکھنے والے
[illegible] ہے اہتمامِ محفل آرائی سمجھتے ہیں

[illegible] ردائے پاکی و تقویٰ کی عظمت میں تو کیا شک ہے
[illegible] ہم تو غبارِ کوئے رسوائی سمجھتے ہیں

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

روشؔ صدیقی

غزل

خود کو گمشدہ کو بہ کو [illegible]
اہلِ عشق تجھے روبرو سمجھے ہیں
ترے خیال کی خوشبو ترے جمال کا رنگ
ہم اس کو تکملۂ رنگ و بو سمجھتے ہیں
کوئی مقام کوئی مرحلہ نظر میں نہیں
کہاں ہے قافلۂ آرزو، سمجھتے ہیں
جانِ شہر کو یہ اعتراف ہو کہ نہ ہو
زبانِ عشق کی سب گفتگو سمجھتے ہیں
[illegible] در آغوش ہے سکوں تیرا
تجھے ہم اے دلِ آشفتہ خو سمجھتے ہیں
ہزار منزلِ نو یک فراغِ گم شدگی
مآلِ حوصلۂ جستجو سمجھتے ہیں
فقیہِ شہر سے کیا پوچھئے روشؔ کہ جناب
زبانِ شیشہ و جام و سبو سمجھتے ہیں

صالحہ عابد حسین

عورت اقبال کی شاعری میں

اقبال ہمارا عظیم شاعر اور مفکر ہے جس نے مذہب، اخلاق، سیاست اور زندگی کے مسئلوں پر اتنا سوچا ہے اور لکھا ہے کہ ٹیگور کے علاوہ شاید ہی کوئی اور شاعر اس کا مقابلہ کر سکے۔ اگرچہ اقبال عام طور پر عالم اسلامی کے افراد کو مخاطب کرتے ہیں لیکن ان کے کلام کا ایک قابل لحاظ حصہ ساری عالم انسانیت سے متعلق ہے کہ وہ ان قدروں کی تبلیغ کرتے ہیں جو سب بڑے مذہبوں اور تہذیبوں میں مشترک ہیں۔

مگر عجیب بات یہ ہے کہ یہ عظیم شاعر اپنے لافانی پیام کو صرف مردوں تک محدود رکھتا ہے یعنی آدھی نوع انسانی کو اس پیام کو سننے کے قابل ہی نہیں سمجھتا، جس کے ذریعے وہ ایک بہتر و برتر دنیا کی تشکیل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن کلام اقبال کے شیدائیوں میں مردوں کے علاوہ تعلیم یافتہ عورتیں بھی کم نہیں۔ وہ ان کے کلام پر جھومتی، اس سے متاثر ہوتی اور اپنے دل و دماغ کو اس سے فیض پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی بڑی مزے کی بات ہے کہ اقبال نے جو کچھ صرف عورت کے بارے میں یا عورت سے خطاب کر کے کہا ہے وہ عورتوں کو بہت کم پسند آتا ہے بلکہ ان کے بعض اشعار پڑھ کر افسوس اور تکلیف ہوتی ہے کہ وہ ایسا کیوں اور کیسے کہہ گئے؟ پرانے زمانے کی قدامت پرست یا تنگ خیال عورتیں ممکن ہے ان شعروں کو صحیح سمجھتی ہوں مگر آج کی باشعور، پڑھی لکھی، روشن خیال عورت ان شعروں کو کس طرح پسند نہیں کرتی ہے

اک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور　　کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد

نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد — نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ جانا — اس قوم کا خورشید بہت [...]

عورت سوچتی ہے کہ مرد پہلے اپنے اخلاق و کیرکٹر کی تو نگہبانی کر لے وہ عورت کی کیا نگہبانی کرے گا جو اپنی آبرو و اخلاق کو جان سے زیادہ پیارا سمجھتی ہے اور اگر اپنی پیاری سی پیاری چیز اس کی حفاظت کے لئے قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتی [...] کی جگہ اقبال نے یہ کہا ہوتا کہ ـــ نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی ـ کوئی بھی [...] نہیں کر سکتیں بلکہ مرد [...]ت کا عزتِ نفس کا احساس اور اپنی نسوانیت کا پاس کرنے کا [...] اس کا نگہبان ہو سکتا ہے تو وہ بہت بڑی سچائی کی ترجمانی کرتے [...]

[...]ہیں

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ اُمومت — ہے حضرتِ انسان کے لئے اس کا ثمر موت

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہو نازن — کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

یورپ کی تہذیب کے سلسلے [...] دیکھ کر اقبال مغربی تعلیم اور تہذیب سے بڑے بدظن ہو گئے تھے مگر ان کے خیال میں عورت کے لئے تو یہ زہر اور موت سے بدتر تھی۔ بڑی حیرت ہوتی ہے یہ سوچ کر کہ اسلام کا فدائی، کلام الٰہی کو اتنے غور سے پڑھنے اور سمجھنے والا یہ مفکر کیسے عورت کو علم سے محروم رکھنے کی بات سوچ سکتا ہے۔ کلام الٰہی اور حدیث نبوی میں علم کی تاکید [...] یکساں کی گئی ہے۔ مگر آخری شعر اقبال کا مطلب واضح ہے کہ وہ [...] علم و ہنر کو موت سمجھتے ہیں جو مذہبی تعلیم و اقدار سے خالی ہو۔ اس [...] ہے کہ ان کی طرح دنیا کے سبھی [...] عورت کو دین کی امین سمجھتے ہیں جو اس [...] روشن رکھتی ہے

[...] دیں سے اگر مدرسۂ زن

ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت

[illegible] سے پیدا ہوا [illegible]

[illegible] کی دولت ، دل کی شرافت اور ذہنی قابلیت ابھارنے کی تربیت اور تعلیم [illegible]

ہے ۔ وہ خود کو مٹا اور کھپا کر افلاطون جیسے عالم اور مفکر پیدا کرتی ہے اور اقبال کے [illegible]

[illegible] سے دنیا [illegible] معقول انکار کر سکتا ہے کہ عورت کا پہلا اور سب [illegible]

[illegible] تربیت اور تعلیم ہے اور فطرت نے یہ کام خاص طور پر اسی لئے اسے [illegible]

[illegible] کام کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے ۔ لیکن اس عظیم مفکر کی نگاہ سے دو باتیں

[illegible] فطرت کے تقاضے سے ماں بن کر ہی یہ صلاحیتیں اور

[illegible] کی بہترین تربیت کر سکے ۔ ایک ان پڑھ ، جاہل ، دنیا سے

[illegible] سیاست سے بے گانہ معاشی مسائل سے بے خبر ، علم و عمل کی دنیا سے دور عورت

[illegible] خود بخود کہاں سے پیدا ہو جائیں گی جن سے کام لے کر

[illegible] انسان بنایا جا سکتا ہے ۔

[illegible] یہ نہیں آتی کہ اقبال نے یہ کیسے فرض کر لیا تھا کہ عورت علم

[illegible] نہیں ہو سکتی ۔ اگر عورت اس کی اہل نہ تھی تو قدرت نے اسے

[illegible] صلاحیتیں کیوں دی ہوتیں ۔ کوئی شک نہیں کہ مجرد علم اور سیاست

[illegible] نے مرد سے بہت کم [illegible]

[illegible]

[illegible] سے ہوں [illegible]

ان اشعار سے یہ بات تو صاف ہو گئی کہ اقبال کی نظر میں عورت

صرف ماں کی حیثیت ہے ! وہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ عورت کو بچہ پیدا کرنا اور اسے بہتر

بنانا اور اسی طرح بہتر دنیا پیدا کرنا اس کا عظیم و مقدس فرض ہے جو وہ انجام دیتی آئی ہے اور

اب بھی یہی کام اسے کرنا چاہیئے ۔ اس سے آگے وہ قدم بڑھائے تو گویا نسوانیت کا [illegible]

[illegible]گلتی عورتیں زندگی کے ہر [illegible] میدان میں کامیابی حاصل کر رہی ہیں۔ جن عورتوں کو خدا نے ذہنی اور دماغی قابلیتیں دی [illegible] کیوں نہ علم و آرٹ کے میدان میں ان سے کام لے کر ذہنی [illegible]لیں کا بے کراں [illegible]۔

بہرحال [illegible] عورت کے عمل کا دائرہ محدود سمجھتے ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس محدود دائرے میں ان کی نظر میں عورت کا مرتبہ بہت بلند و ارفع ہے۔ وہ [illegible]۔ بچے کی ماں، انسانیت اور تہذیب کی [illegible]

اپنی ایک مشہور فارسی نظم میں انھوں نے ماں کے مقام اور درجہ کو بڑی خوبصورتی [illegible] دو چار شعر سن لیجئے:

[illegible] از اُمّہات — جوہر صدق و صفا از اُمّہات
[illegible]ت رحمت [illegible] — زانکہ او را با نبوت نسبت است [illegible]
[illegible]ات — سیرت اقوام را صورت گر است

ان کا پہلا اندیشہ تو سراسر غلط ثابت ہوا اور دنیا کی آبادی اس خطرناک حد تک بڑھتی جا رہی ہے کہ لوگ [illegible] رہے ہیں کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا یہ خیال صحیح نکلا کہ [illegible] بے خبر اور عقیدہ کی دولت سے تہی مایہ ناولوں کی اولاد جن کے دل میں [illegible] ہی سے ایمان کی شمع روشن نہیں کی جاتی آج بے یقینی، بے زاری اور روحانی کرب میں [illegible] آتی [illegible]

[illegible] (میری طرح اور عورتیں بھی) متفق نہیں کہ مرد کا جوہر [illegible] کے بغیر ظاہر ہوتا ہے مگر عورت کے جوہر مرد کے ذریعے کھلتے اور نکھرتے ہیں ؎

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر
مرد کی ذات سے ہے جوہرِ عورت کی نمود

[illegible] سے ہی انکاری ہیں کہ جو جوہر مرد میں ہیں وہ عورت میں بھی ہیں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ عورت میں جو تخلیقی جوہر ہے یہی اس کا اصلی اور واحد جوہر ہے جس کو اسے بروئے کار لانا اور اپنی ساری ہمت اور صلاحیتوں کو اس میں گم کر دینا چاہیئے ؎

[illegible] ہے اس کی تپِ غم کا یہی نکتۂ شوق — آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود
کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرارِ حیات — گرم اسی آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود
میں بھی مظلومیِ نسواں سے ہوں غمناک بہت — نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

ان اشعار سے یہ بات تو صاف ہو گئی کہ اقبال کی نظر میں عورت کا مرتبہ بہت بلند ہے مگر صرف ماں کی حیثیت سے [illegible] سمجھانا چاہتے ہیں کہ عورت کو بچہ پیدا کرنا اور اسے بہتر انسان بنانا اور اسی طرح بہتر دنیا پیدا کرنا اس کا عظیم و مقدس فرض ہے جو وہ انجام دیتی آئی ہے اور اب بھی یہی کام اسے کرنا چاہیئے [illegible] آگے وہ قدم بڑھائے تو گویا نسوانیت کی توہین [illegible] گی۔

عورت کی آزادی کے بھی وہ خلاف ہیں سب

اس بحث کا میں فیصلہ کچھ کر نہیں سکتا — [illegible] سمجھتا ہوں کہ [illegible]

کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب — پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند

اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش — مجبور [illegible] ہیں مردانِ خرد مند

[illegible] ہے آرائش و قیمت میں زیادہ — آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

اقبال کے اس چیلنج یا اپیل یا تنبیہ کا جواب تو مشتاق کی عورت [illegible]
[illegible] زمرد کے گلوبند" کے مقابلے میں اُسے اپنی آزادی ـــ آزادیٔ کردار و گفتار، آزادی
[illegible] اور آزادیٔ [illegible] کے انداز سے پڑھا جاتا ہے
لیکن میں اس بات کی وضاحت کرنا چاہتی ہوں کہ اقبال نے "زمرد کا گلوبند" استعارے کے
طور پر استعمال کیا ہے جس سے ان کی مراد وہ مذہبی اور اخلاقی قدریں [illegible]
[illegible] اس ظاہری اور رسمی آزادی کے مقابلے میں جو ان کے [illegible]
میں عام طور عورت کو تنبیہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے بنیادی حقوق، صفات [illegible]

اقبال کی نظر میں عورت کا مرتبہ بلاشبہ بہت بلند ہے۔ اپنے ایک اور قطعہ میں وہ [illegible]

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ — اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی — کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا درِ مکنوں

مکالماتِ فلاطوں [illegible] — اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

[illegible] ہیں کہ دنیا میں جتنے صاحبانِ علم، مفکر، فلسفی، ہادی و رہنما
گزرے ہیں سب اُسی کی گود میں پروان چڑھے ہیں اور اسی لئے اس کا مقام آسمان [illegible]
[illegible] دنیا کے ہر شرف سے بڑھ کر ہے [illegible] یہاں مقصد صرف یہ نہیں

کہ افلاطون ایک عورت ہی کی کوکھ سے پیدا ہوا اس لئے ماں کا درجہ بلند ہے بلکہ یہ کہ مرد کی ایمان [illegible] ویقین کی دولت [illegible] کی فراست اور ذہنی قابلیت اجاگر ہی ماں کی تربیت اور تعلیم سے ہوتی ہے۔ وہ خود کو مٹا اور گھپا کر افلاطون جیسے عالم اور مفکر پیدا کرتی ہے اور اقبال کے اس نظریے سے دنیا [illegible] کا پہلا اور سب سے بڑا فرض بچے کی صحیح تربیت اور تعلیم ہے اور [illegible] اسی لئے اسے [illegible] ہے کہ اس میں اس کام کی بے پناہ صلاحیت [illegible] اس عظیم مفکر کی نگاہ سے دو باتیں اوجھل ہیں۔ پہلی یہ کہ عورت میں صرف فطرت کے تقاضے سے ماں بن [illegible] [illegible] کی بہترین تربیت کر سکے۔ ایک ان پڑھ، جاہل، دنیا سے ناواقف [illegible] معاشی مسائل سے بے خبر، علم وعمل کی دنیا سے دور [illegible] [illegible] بھی قدریں خود بخود کہاں سے پیدا ہو جائیں گی جن سے کام لے کر بچے کو ایک اچھا اور بلند انسان بنایا جا سکتا ہے۔

دوسری بات میری سمجھ میں یہ نہیں آتی کہ اقبال نے یہ کیسے فرض کر لیا تھا کہ عورت علم وفن کی دنیا میں کوئی مقام نہیں پا سکتی۔ اگر عورت اس کی اہل نہ تھی تو قدرت نے [illegible] [illegible] ذہنی اور دماغی صلاحیتیں کیوں دی ہوتیں۔ کوئی شک نہیں کہ مجرد علم اور سیاست وغیرہ کی دنیا میں عورت نے مرد سے بہت کم نمایاں مقام حاصل کیا ہے (جس کی وجہ بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں) لیکن تاریخ گواہ ہے کہ اس کے باوجود عورت [illegible] فرائض کے علاوہ بھی دنیا میں بہت کچھ کام کیا ہے۔ حکومت اور سیاست کے میدان میں بڑی بڑی حکمران عورتیں گزری ہیں [illegible]، شاعری، مصوری اور موسیقی میں کتنی عورتوں نے اپنا لوہا منوایا ہے۔ عرب کی مشہور شاعرہ خنسا اور فارسی کی شہرہ آفاق شاعرہ قرۃ العین [illegible] [illegible] مادام کیوری کے نام سے کون پڑھا لکھا ناواقف ہے جس نے سائنس کی دنیا میں وہ نام وشہرت پائی جس [illegible] اور آج کے دور میں کو

بے گنتی عورتیں زندگی کے ہر شعبے اور میدان میں کامیابی حاصل کر رہی ہیں۔ جن عورتوں کو خدا نے ذہنی اور دماغی قابلیتیں دی ہیں وہ کیوں نہ علم و آرٹ کے میدان میں ان سے کام لے کر ذہنی تخلیق کا بے کراں لطف اٹھائیں۔

بہرحال اقبال اگرچہ عورت کے عمل کا دائرہ محدود سمجھتے ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس محدود دائرے میں اس کو [illegible]
ماں ہے۔ بچے کی ماں، انسانیت اور تہذیب [illegible]
اپنی ایک مشہور نظم [illegible]
بیان کیا ہے۔ اس کے دو چار شعر سن لیجئے ؎

سیرت فرزندہا از امہات [illegible]
نیک اگر بینی امومت رحمت است   زانکہ او را با نبوت نسبت است

[illegible]

[illegible]یدہ سالم

نظام زر بحران میں

ابھی کچھ دن ہوئے کہ معاشی دنیا میں سونے کی قیمت کے اچانک اضافہ [illegible]
[illegible] ہو گئی تھی۔ سونے کی قیمت میں اضافہ کی وجہ سے ڈالر کی بیرونی قیمت میں تخفیف [illegible]
اور دنیا کے بڑے ملکوں کے مرکزی بنک، ماہرین معاشیات اور سیاست داں سب ہی اس صورت
حال [illegible] پیدا ہونے والی معاشی بدحالی اور انتشار کے نئے اندیشوں سے پریشان تھے
یہ بحران عارضی طور پر قابو میں آگیا ہے۔ لیکن اس کے جو اسباب تھے وہ اپنی جگہ باقی ہیں اس لئے
ان اندیشوں کی نوعیت کو سمجھنا اور ان اسباب کا تجزیہ کرنا جو ان حالات کے پیچھے ہیں یقیناً دلچسپی
سے خالی نہیں ہوگا۔ اس مضمون کا مقصد انہی کی تفصیل و تشریح ہے۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم سونے کی قیمت میں رد و بدل کے اسباب اور نتائج سے بحث کریں
ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ بین الاقوامی معیشت میں سونے کی کیا اہمیت ہے۔ مختلف ممالک میں
مختلف سکے اور کرنسی رائج ہیں جن کو اندرونی طور پر عام مقبولیت حاصل ہے لیکن وہ بیرونی
لین دین اور حساب فہمی کے لئے استعمال نہیں کئے جا سکتے۔ سونا ہی ایک ایسی چیز ہے جو مختلف
ملکوں کے باہمی لین دین کے سلسلے میں ذریعہ ادائیگی کا کام کرتا رہا ہے۔ اس وقت سونے کے
علاوہ دو سکے ڈالر اور اسٹرلنگ بھی بین الاقوامی سطح پر حساب کتاب صاف کرنے کے سلسلے
استعمال ہوتے ہیں۔ ان کو ریزرو کرنسی (RESERVE CURRENCY) کہا جاتا ہے لیکن
ڈالر [illegible] معیاری قبول کر رکھی ہے کہ پینتیس 35

رکھتے ہیں۔ غور کرنے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ بین الاقوامی تجارت اور بین الاقوامی سطح پر سرمایہ کاری کی ترقی کے لئے یہ لازمی ہے کہ مختلف ممالک کے سکوں کے مابین شرح مبادلہ میں استحکام ہو۔ اگر کسی ملک کو کسی دوسرے ملک کے سلسلہ میں یہ خطرہ ہوگا کہ اس کے اپنے سکہ اور غیر ملکی سکہ کا درمیانی رشتہ کمزور بنیادوں پر ہے اور کسی وقت بھی غیر متوقع تبدیلیاں پیدا ہو سکتی ہیں خواہ سرمایہ کاری کا رشتہ تو وہ تعلقات بڑھاتے ہوئے گھبرائے گا اور ایسی غیر [illegible] [illegible] کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے پاس غیر ملکی سکوں کی رسد ضرورت کے مطابق ہو اگر اس ملک کے پاس غیر ملکی [illegible] کی رسد کم ہوتی ہے تو اس [illegible] خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ملک کے سکے کی دوسرے [illegible] پیمانہ میں قیمت مقررہ حد سے گر جائے اس صورت میں مرکزی بینکوں کے پاس غیر ملکی سکہ کی [illegible] تو گویا ملک .I. M. F کے لئے اول الذکر مقصد کی تکمیل کی خاطر آغاز [illegible] دواری کو اٹھانا ناگزیر تھا۔ مثال کے طور پر ایک پاؤنڈ دو ڈالر چالیس سینٹ کے [illegible] اور [illegible] بازار میں ان سکوں کی شرح مبادلہ اس متعین شرح سے صرف دو سینٹ اوپر نیچے ہو سکتی ہے۔ فرض کیجئے انگلستان کے تاجروں و سرمایہ کاروں کے لین دین [illegible] سرمایہ کاری کے تقاضے یہ ہوں کہ انگلستان کے تاجروں [illegible] کو ڈالر کی ضرورت بمقابلہ امریکی تاجروں اور سرمایہ کاروں کی اسٹرلنگ کی ضرورت کے بہت زیادہ ہو تو اس کا مطلب ہوا کہ ڈالر کی [illegible] اسٹرلنگ [illegible] ڈالر کی باہمی قیمت [illegible] ڈالر اڑتیس سینٹ نیچے [illegible] اس صورت میں انگلینڈ کے سینٹرل بنک پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی کہ [illegible] وہ ڈالر مہیا کرے اور اسٹرلنگ کی بیرونی [illegible] کو تھامے رکھے۔ اسی طرح سے اگر حالات ایسے ہوں کہ اسٹرلنگ کی رسد کم ہو اور مانگ [illegible] امریکی تاجروں [illegible] اپنی خریداری کے دام ادا کر [illegible] امریکی سرمایہ کاروں کو انگلستان میں سرمایہ کاری کی وجہ سے تو اسٹرلنگ کی ڈالر [illegible] کے تعین دو ڈالر بیالیس

...ت نیچے یا ابھر جانے کا خطرہ پیدا ہوگا۔ ان حالات میں انگلستان کے سینٹرل بنک کی ذمہ داری
...کہ وہ ڈالر خریدے اور اسٹرلنگ مہیا کرے۔ غرضیکہ بنک آف انگلینڈ مانگ کی کمی کی صورت
میں خود خریدار کی صورت اختیار کرے گا اور مانگ کی زیادتی کی صورت میں بیچنے والے کی حیثیت
اختیار کرکے طلب و رسد کی قوتوں کو ایسے توازن پر رکھے گا کہ پاؤنڈ کی ڈالری قیمت دو ڈالر
... سینٹ سے زیادہ یا دو ڈالر اڑتیس سینٹ [illegible]
... میں ملکوں کے سینٹرل بنکوں کو اپنے سکوں کی بیرونی قیمت میں استحکام رکھنے کے لئے I.M.F.
... فنڈ کی ضرورت ہوتی ہے [illegible]

... سکنا ... [illegible]
[illegible] شرکت ان کی معاشی و اقتصادی حیثیت و دیگر حالات
... سامنے رکھ کر مقرر کیا گیا ہے ... کی ادائگی کے لئے کچھ مقدار سونے کی اور کچھ ان کے
اپنے سکوں کی مقرر کی گئی ہے۔ سونا ہر جگہ ہر وقت قابل قبول ہے اس لئے [illegible]
ملک کے سامنے باہمی لین دین کا مسئلہ ہوا اور اس کے سامنے دوسرے ملک کے سکہ کی کمی ہو
... ہی ایسی چیز ہے جو ذریعہ ادائگی کا کام دے گا۔ ممبران ممالک کو فنڈ میں شرکت کی بنا پر
یہ سہولت دی گئی [illegible] ضرورت کے وقت اپنے چندہ کا سو فیصدی بطور قرض
... اور اگر توازن ادائگی Balance of payment میں بنیادی طور پر ناموافقت
پیدا ہو جائے یعنی صورت حال یہ ہو کہ مستقل طور پر اس کو بیرونی ادائگی کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے تو
وہ اس سے بھی زیادہ قرض لے سکتے ہیں لیکن اس صورت میں I.M.F. قرض ان [illegible]
ساتھ دے گا جو توازن ادائگی کی اس بنیادی ناموافقت کو سدھارنے کے لئے ضروری سمجھے گا۔
مثال کے طور پر حال ہی میں برطا[illegible] I.M.F. سے قرض لینے کی ضرورت
پڑی اور I.M.F. کے مشورہ پر ا[illegible] سکہ کی قیمت گرانی پڑی۔
... کے قیام سے کچھ حد تک یہ خلا تو پر ہو گیا کہ ممبر [illegible]

نکلتا ہے کہ امریکہ اور انگلستان کے ریزرو میں اس دوران میں نمایاں کمی ہوئی۔ حال ہی کے چند سالوں
میں امریکہ کے ریزرو میں ۶ ملین ڈالر کی کمی ہوئی ہے۔ دراصل ۱۹۴۹ء سے امریکہ سے ڈالر باہر
جا رہا ہے۔ ابتدائی دور میں یہ رجحان منصوبہ اور خواہش و ارادہ کے تحت تھا۔ مارشل پلین
کے نام پر جنگ زدہ یورپ کے علاقوں کی بدحالی دور کرنا اور اعانت کرنا مقصود تھا۔ لیکن
۱۹۵۰ء کے بعد سے ڈالر کا یہ رجحان کہ [illegible] کے ریزرو سے نکل کر [illegible] ملکوں کے
ریزرو میں پہونچ رہا ہے قطعی غیر ارادی [illegible] رجحان کی بہت کچھ
ذمہ داری ویٹ نام کی جنگ پر اور امریکی [illegible] کی غیر ملکی سرمایہ [illegible]
[illegible] کے سلسلہ میں امریکہ زر مبادلہ [illegible] ۷۰۰ ملین ڈالر سالانہ خرچ کر رہا
[illegible] کے علاوہ چونکہ امریکہ میں اشیاء کی لاگت پیداوار بمقابلہ [illegible] ملکوں کے [illegible]
[illegible] کہ عام طور پر امریکہ کی سطح اجرت اونچی ہے اس لئے امریکہ کے سرمایہ کار دوسرے ملکوں میں
سرمایہ کاری کو زیادہ نفع آور پا رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ امریکی امداد کے تحت بھی ڈالر [illegible]
[illegible] یہ تمام تقاضے ایسے رہے جو امریکہ کی خالص برآمد کی قیمت سے نہیں پورے [illegible] اس سے
انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت بھی امریکہ کا موازنہ تجارت (Balance of Trade)
اس کے موافق ہے یعنی تجارت کے میدان میں اس کی برآمد درآمد سے زیادہ ہے لیکن بیرونی
[illegible] (Balance of Payments) کی دوسری مدوں [illegible]
کو پورا کرنے کے لئے قطعی ناکافی ہے۔ موازنہ ادائگی میں نمایاں مد جنگ ویٹنام کے اخراجات
[illegible] سرمایہ کاری کی مزدوریں ہیں۔ اس تمام بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی [illegible]
ویٹ نام کی جنگ اور غیر ملکی سرمایہ کاری کی بنا پر پچھلے دور میں امریکہ پر ادائگی کی ذمہ داریاں
[illegible] ادائگی ڈالر یا ان دستاویزوں کی صورت میں ہوتی رہی جو اتنی وزنی تھیں جتنی
[illegible] اور خواہش پر ان ڈالرس یا ان دستاویزوں کے حصول کرنے والے ان کے
[illegible] سکتے تھے لہذا امریکہ ڈالر کو سونے میں منتقل کرنے سے انکار

نہیں کر سکتا ہے کیونکہ پچھلے چونتیس 34 سال سے اس نے یہ پابندی قبول کر رکھی ہے۔ حال میں کچھ ایسی
[illegible]تیں پیدا ہوئیں کہ ڈالر کے پالنے والوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ اپنے اس ذخیرہ کو بجائے
[illegible]س کے اگر سونے میں رکھیں تو بہتر ہوگا۔ لہٰذا سونے کی مانگ بڑھنے لگی اور اس کے ساتھ
[illegible] میں اس کی قیمت۔ قبل اس کے کہ ان حالات کے محرکات پر تفصیل سے روشنی [illegible]
[illegible] بہتر ہوگا کہ سرکاری ریزرو کی ایک دوسری نمایاں خصوصیت پر نظر ڈال لی جائے۔

مجموعی ریزرو کا زیادہ تر حصہ [illegible]
[illegible]ت ہے اور ان دستاویزات اور معاہدوں پر مشتمل ہے جو زرمبادلہ کے طور پر استعمال
[illegible]
اضافہ کی رفتار 1.7 تھی اور یہ رفتار 1965 - 1960 کے دوران برقرار رہی یعنی سونے
کی رفتار بڑھی [illegible] رفتار اضافہ میں استقلال رہا۔ اس میں تیزی نہیں پیدا ہوئی برعکس
اس کے زرمبادلہ (Foreign exchanja) کے اعداد و شمار دکھاتے ہیں
[illegible] یہ جو محض ۲ فیصدی کے حساب سے بڑھا تھا لیکن دوسرے دور
[illegible] رفتار 5.7 فیصدی ہوگئی یعنی تقریباً سات گنی بڑھ گئی۔ زرمبادلہ کا جز
[illegible] کے کیوں اتنی تیزی سے بڑھا اور اس کے کیا نتائج ہوئے؟ زیر غور
[illegible] میں ان سوالات کی بہت اہمیت ہے۔ بین الاقوامی تجارت ۶ فیصدی کے حساب
سے بڑھ رہی جبکہ [illegible] کی پیداوار صرف ۲ فیصدی کے حساب سے۔ ساتھ ہی ساتھ سونے
کی مانگ صنعتی و ذاتی ضرورتوں کے لئے بہت بڑھی ہے لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بین الاقوامی لین
دین کے معاملات کو طے کرنے کے لئے کسی نعم البدل کی یعنی کسی ایسی شے کی جو عام قبولیت کا
درجہ رکھتی ہو ضرورت پڑی۔ وہ دستاویزیں اور کاغذات ہی یہ کام انجام دے سکتے تھے جنکو
اپنے اپنے ملکوں کے سنٹرل بینکوں [illegible] کی پشت پناہی حاصل ہو۔ لہٰذا زرمبادلہ
(Foreign exchange) اس دور میں بہت تیزی سے بڑھا۔

اس کے ریزرو کے سونے کے جز میں بہت کم اضافہ ہوا کیونکہ سونے کی مجموعی رسد اس کے لئے ناکافی رہی کہ وہ بڑھتی ہوئی صنعتی و نجی ضرورتوں کو پورا کرے اور ساتھ ہی ساتھ بین الاقوامی ادائگیوں کے تقاضوں کو۔

سونے کی طلب و [illegible]

(ملین ڈالر میں)

سال	نئی پیداوار	روسی فروخت	کل	سرکاری مانگ	صنعتی استعمال (۱۴ ممالک کی)	نجی استعمال	مجموعی نجی مانگ
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	455	–	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	1015	665	–	–	[illegible]
[illegible]	[illegible]	200	1375	345	265	765	[illegible]
[illegible]	[illegible]	550	1980	400	475	1105	1580
[illegible]	[illegible]	–	1435	-55	530	960	[illegible]

[illegible] پر دئے ہوئے اعداد و شمار یہ دکھاتے ہیں کہ ۱۹۵۵ء میں سونے کی مجموعی رسد ۱۰۱۵ ملین ڈالر کی قیمت کی تھی اس میں سے [illegible] ملین ڈالر کا سونا نجی و صنعتی استعمال میں آیا بقیہ 665 ملین ڈالر کا سونا زر کے زمرہ میں سرکاری استعمال میں آیا۔ برعکس اس کے ۱۹۶۵ء میں گو کہ سونے کی مجموعی رسد بڑھ کر ۱۹۸۰ ملین ڈالر کی قیمت کی ہو گئی لیکن اس میں سے 475 ملین ڈالر کا سونا صنعتی استعمال میں آیا۔ ۱۱۰۵ ملین ڈالر کا سونا نجی استعمال میں آیا اور صرف ۴۰۰ ملین ڈالر [illegible] کے استعمال میں آسکا یعنی کل رسد کے ایک پانچویں حصہ سے خفیف سا زیادہ سرکاری [illegible] میں آسکا۔ ۱۹۶۶ء میں حالت اور بھی گئی گذری رہی رسد 1435 ملین ڈالر کے سونے کی ہوئی لیکن پرائیوٹ سیکٹر سے مانگ اتنی بڑھی کہ ۵۵ [illegible] سرکاری استعمال سے نکل کر [illegible] صنعتی ضرورتوں میں کام آیا۔ غرضیکہ سونے کی رسدیوں تو تقریباً دگنی ہو گئی لیکن اس کی

مانگ خصوصاً نجی استعمال کے لئے اس قدر بڑھی کہ اس کی قلت بہت ہی نمایاں ہوگئی اور یہ ایک
معاشی حقیقت ہے کہ قلت کے دور میں ردعمل کے طور پر آئندہ کی قلت کے اندیشہ کی وجہ سے
مانگ اور بھی بڑھتی ہے جو قلت میں مزید اضافہ کرتی ہے اور عمل و ردعمل کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔
یہ سونے کی مانگ کے بڑھنے کی ابتدائی ذمہ داری کن عناصر [illegible] یہ سوال لازمی طور سے اٹھتا ہے۔
کیا اس بیسویں صدی میں عورتوں کو اپنے کو زیورات سے بوجھل کرنے کا یا مردوں کو سونے
کے طشت و برجیاں بنانے کا شوق [illegible] کی رجحان کے لئے [illegible]
ملتی۔ البتہ سٹہ بازی کے میدان [illegible] وسیع تر اضافہ ہوتا نظر آتا رہا۔ سٹہ بازی
میں اتنا اضافہ کیوں ہوتا گیا اس کی [illegible] سونے کی قیمت [illegible] نے
کی قیمت آج سے چونتیس سال پہلے 35 ڈالر فی آؤنس مقرر کی گئی تھی۔ اس دوران میں دیگر اشیاء
کی قیمتیں کہیں سے کہیں پہونچ گئیں [illegible] سونے کی مانگ میں بمقابلہ اس کی رسد [illegible] زیادہ
اضافہ ہوا لیکن طلب و رسد کے توازن کی اس تبدیلی نے سونے کی قیمت پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔
[illegible] پابندیوں میں جکڑی ہوئی اپنی جگہ منجمد رہی۔ لیکن اس خارجی مصنوعی پابندی کے لئے
[illegible]ت روز افزوں شدت کے ساتھ محسوس ہو رہے تھے۔ سٹہ بازوں کی اس
توقع کو تقویت پہونچ رہی تھی کہ سونے کی قیمت اس پابندی کو زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں
کر سکے گی اور [illegible] ہے گی۔ پابندی کو توڑنے کے غیر قانونی رجحانات مضبوط پڑ رہے تھے۔
ایسی فضا میں پرائیویٹ سیکٹر سے سٹہ بازی کے لئے سونے کی مانگ روز افزوں ترقی پر
[illegible] حالات میں پاؤنڈ کی بیرونی قیمت میں تخفیف (Devaluation) نے
ایک چنگاری کا کام کیا۔ بارود تو موجود تھا ہی شعلے بھڑک اٹھے۔ اس دلیل میں منطق تھی کہ اگر
ایک ریزرو کرنسی کی یعنی پاؤنڈ کی ناموافق موازنہ ادائگی (Unfavourable Balance
of Payment) کی وجہ [illegible] قیمت گھٹ سکتی ہے تو انہیں اسباب کے ساتھ دوسری
ریزرو کرنسی یعنی ڈالر کب تک اپنی بیرونی صحت کو برقرار رکھ سکے گا۔ اس کی بھی بیرونی قیمت

عنقریب گھٹے گی لہذا ڈالر کو جلد از جلد خرچ کرنے اور اس کے بدلے سونا خریدنے کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

سونے کے ساتھ اس بڑھتی ہوئی عقیدت اور ڈالر کے ساتھ اس بدعقیدگی کی ذمہ داری کچھ حد تک فرانس کے رویہ پر بھی ہے۔ پچھلے کچھ عرصہ سے ڈی گال زر کے لئے سونے کے معیار کے راگ الاپ رہے ہیں اور فرانس سونا خریدنے کی تگ و دو میں لگا ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈی گال فرانس [illegible] امریکہ کی بڑھتی ہوئی سرمایہ کاری سے بھرا ہوا بیٹھا ہے۔ امریکہ جس قسم کی [illegible] کر رہا ہے اس لئے فرانس کے پیداواری عناصر میں سے کسی کو بھی فائدہ نہیں پہونچ [illegible] ملک کسی دوسرے ملک میں نیا کارخانہ کھولتا ہے تو نفع [illegible] پہونچتا ہے لیکن اس کے مزدوروں کو اجرت ملتی ہے کچھ خام مال کے استعمال کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں کچھ اشیاء کی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے کچھ حد تک آنسو پونچھ جاتے ہیں لیکن [illegible] فرانس میں جو امریکی سرمایہ کاری ہو رہی ہے وہ اس صورت کی ہے کہ فرانسیسی ریزو میں امریکی سرمایہ کاروں کا ادا کیا ہوا ڈالر یا ڈالر سیکیوریٹیس بڑھ رہی ہیں جن کی گارنٹی پر فرانسیسی بنک اپنے ملک میں زر اعتبار (Credit money) میں اضافہ کر رہے ہیں۔ بدلے میں فرانسیسی ملکتیں اور جائدادیں امریکی سرمایہ کاروں کے نام منتقل ہو رہی ہیں، غرضیکہ فرانسیسی زر کے معاوضہ میں فرانسیسی جائدادیں بک رہی ہیں اور فرانس کو حاصل کیا ہو رہا ہے ڈالر کا اندوختہ اور اس کی بنا پر کچھ حد تک افراط زر (inflation) کا تلخ ذائقہ۔ اس رجحان کو روکنے کے لئے فرانس کو سب سے زیادہ موثر طریقہ یہی نظر آیا کہ تیزی سے ڈالر خرچ کرکے سونا خریدنا [illegible]۔ یہ ہتھیار ایسا تھا جس کے استعمال نے امریکہ کو کیا پوری دنیا کو چونکا دیا [illegible] کی سونے کی مانگ اور بھی تیزی سے بڑھی اور مجموعی مانگ اتنی بڑھ گئی جس کا [illegible] ناممکن نظر آنے لگا۔ ایک افراتفری کی فضا پیدا ہو گئی۔ زر کی دنیا میں [illegible] سونے کی قیمت اور ڈالر کی حیثیت پر فوری طور پر غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

زرکی معاشیات کے ماہرین اکٹھا ہوئے۔ زر کی پالیسی بنانے والے بینکیں سر جوڑ کر بیٹھے پے در پے میٹنگ اور کانفرنسیں ہوئیں۔ حالات کا تقاضا یہ تھا کہ سونے کی قیمت بڑھائی جائے تاکہ سٹے بازوں کی ہوس سرد پڑے لیکن یہ معاملہ ڈالر اور امریکہ کی ساکھ کا تھا۔ ڈالر کی [illegible] قیمت کا گھٹنا (Devaluation) معمولی حادثہ نہ ہوتا [illegible] بین الاقوامی معیشت زیر پر اس کے اثرات پڑتے۔ لہٰذا واشنگٹن [illegible]

[illegible] منعقد ہوئی اور اس میں یہ طے ہوا کہ سونے کی دو قیمتیں مقرر کی جائیں ایک قیمت اس سونے کی جو سرکاری [illegible] کے لئے [illegible] غیر سرکاری [illegible]

سونے کا بازار جو دنیا کا سب سے بڑا سونے کا بازار ہے۔ پہلی اپریل تک بند کر دیا گیا تاکہ سونے کا لین دین [illegible] سونا خریدنے والوں میں انکار کی صورت [illegible] پیچھے۔ مانگ اس رفتار سے بڑھ رہی تھی کہ فوری طور پر اس کا پورا کرنا وقت طلب مسئلہ تھا۔ [illegible] وقت دو راستے تھے۔ ایک طریقہ کار یہ تھا کہ امریکہ اس کا اعلان [illegible] ڈالر ایک ایسا ہی سکہ ہے جیسا کہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے سکے اور اس کا سونے [illegible] ختم کرتے لہٰذا ڈالر کی مدد سے سونے کی خرید و فروخت کا سلسلہ منقطع کر دے لیکن اس راستہ کے اختیار کرنے سے ایک طرف اندیشہ یہ تھا کہ ڈالر اور امریکہ کی [illegible]

دوسرا طریقہ کار جو امریکہ نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ ڈالر کی موجودہ قیمت حیثیت [illegible] اور مانگ کے دباؤ کو قابو میں لانے کی خاطر اپنی اندرونی کرنسی کی پچیس فیصدی [illegible] رکھنا ضروری تھا اس پابندی کو ختم کر کے اپنے ۱۱۴۰۰ ملین ڈالر کے سونے کے ذخیرہ میں سے [illegible] ڈالر کا سونا سونے کی مانگ کو پوری کرنے پر لگا دیا ہے۔ سونے کی دو قیمتیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ دنیا کے سات بڑے سینٹرل بینکوں نے یہ طے کیا ہے کہ وہ [illegible] استعمال کے [illegible] بھاؤ 35 ڈالر فی آونس رکھیں گے لیکن غیر سرکاری [illegible]

کے لئے بھاؤ 35 ڈالر اور 44 ڈالر 45 سینٹ کے درمیان رہے گا۔ اہم مسئلہ یہ ہے کہ
ایک ہی چیز کی یہ دو قیمتیں کب تک چل سکیں گی۔ سونے کی قیمت کھلے بازار میں کیا ہوگی اس کا فیصلہ
بہت کچھ جنوبی افریقہ [illegible] دو ممالک سے
ہوتی ہے [illegible] سنٹرل بنک جو اس فیصلہ میں شریک
[illegible] کم قیمت پر سونا خرید کر زیادہ قیمت پر بیچنے کے کاروبار میں شریک ہو جائیں۔ اگر ایسی
[illegible] تو دو قیمتوں کا یہ ڈھانچہ آناً فاناً بیٹھ جائے گا۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ [illegible]
طریقہ کار اختیار کیا [illegible] کی فوری روک تھام کی حیثیت [illegible] مستقل علاج نہیں
[illegible] علاج کے لئے تدابیر نہ اختیار کی گئیں تو مرض پھر ایسی مہلک شکل اختیار کرے
[illegible] عارضی تدبیروں سے کام نہیں چلے گا اور دنیا کو زیادہ پریشانیاں برداشت کرنی ہوں
[illegible] امریکہ کو اس وقت موقعہ مل گیا کہ وہ حالات کا صحیح جائزہ لے کر مناسب اور دیرپا حل
تلاش کرے۔ عالمی نظام زر میں سونے کو جو جگہ ملی ہوئی ہے اب ضرورت اس بات کی ہے
کہ اس کو اس جگہ سے ہٹایا جائے۔ اور سونے کے بجائے امریکی ماہر معاشیات زد برنلین
(Bernslaine) کے مشورہ کے مطابق S.D.R. یا Reserve chits قسم کی تدابیر
سے کام لیا جائے۔ لہذا بین الاقوامی لین دین کی سطح پر سونے کا استعمال و اہمیت ختم ہو جائے۔
ڈالر کا سونے میں منتقل ہونا بند کر دیا جائے اور ڈالر کا و دیگر سکوں کا رشتہ اس سے برطرف اور ڈالر
سونے سے وابستہ نہیں ہے۔ دوسرے مناسب تقاضوں کی روشنی میں نئے سرے سے
طے کیا جائے۔ فوری طور پر یہ ضروری ہے کہ امریکہ اپنے موازنہ ادائگی Balance of
Payment کو درست کرے۔ ویٹ نام کی جنگ کے طفیل امریکی معیشت پر بہت دباؤ
پڑ رہا ہے کچھ افراط زر کے رجحانات پیدا ہو رہے ہیں، لاگت پیداوار بڑھ رہی ہے
بین الاقوامی بازار میں امریکہ کے مقابلہ کی قوت گھٹ رہی ہے۔ امریکہ کی درآمد و برآمد کے اعداد
و شمار دکھاتے ہیں کہ پچھلے چند مہینوں میں امریکہ کی درآمد میں گیارہ فیصدی کا اضافہ ہوا جبکہ

برآمد اپنی جگہ برقرار رہی آیندہ کے رجحانات نہیں ہیں کہ برآمد و درآمد کے فرق میں کمی واقع ہوتی جائے گی۔ ان حالات میں پریذیڈنٹ جانسن کا یہ دعویٰ کہ یہ فرق ۵۰۰ ملین ڈالر ہوگا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔

مسئلہ کے صحیح اور دیرپا حل کا انحصار اس پر ہے کہ امریکہ سوجھ بوجھ سے کام لے [illegible] مفاد میں قدم اٹھایا جائے — لکیر کا فقیر بنے رہنے اور روایتی طور پر سونے کے [illegible] سے کام نہیں چلے گا۔

مختلف وجوہات کی بنا پر سونے کی رسد سونے کی مانگ کا ساتھ نہیں [illegible] بڑھتی [illegible] کی قیمت میں اضافہ ناگزیر ہے۔ اور اس صورت حال کی [illegible] کہ سونے کی دو قیمتیں متعین حلقوں تک محدود رہیں بہت ہی دشوار کن مسئلہ معلوم ہوتا ہے۔ قرین قیاس [illegible] کہ نظام زر کو سونے کی قیمت کی ردوبدل کے مضر اثرات سے [illegible] کی خاطر ڈالر اور سونے کے رشتہ کو ختم کرنا ہی ہوگا۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] کی باری باری اس کے پاس آتے ہیں اور ایک پرچہ پر کچھ لکھ کر چلے جاتے ہیں یہ بھی نہیں کہ
کہ دو چار کلمے تسکین اور تسلی کے مریض سے کہہ جاتے۔ ہسپتال کے سارے عملے میں
[illegible] ہمدردی اور انسانیت کا جذبہ [illegible]
[illegible] کے بعد مراسلہ نگار سوال کرتا ہے کہ
[illegible] اہل مغرب میں کیوں سما [illegible] اس اعلیٰ تعلیم یافتہ طبیعی علوم کے ماہر ڈاکٹر میں کیوں نہ سما [illegible]
[illegible] صورت حال اس ڈاکٹر کے معاملہ میں تھی اس سے کچھ کم اور علوم طبیعی کے ماہر [illegible]
[illegible] سے اعلیٰ تعلیم کے بعد ہمارے علماء و فضلاء میں
[illegible] کا جذبہ اس نسبت سے ترقی نہیں پاتا ہے جس رفتار [illegible] کے علم
میں اضافہ ہوتا [illegible] سبب فاضل مراسلہ نگار کے نزدیک یہ ہے کہ ہماری تعلیم میں
انسانی علوم [illegible] یعنی قدیم کلاسیکی زبانیں اور ادبیات ہمارے [illegible]
[illegible] روز بروز خارج ہوتی جا رہی ہیں۔ دوسرے معاشرتی علوم مثلاً فلسفہ، تاریخ، اجتماعیات، فنون لطیفہ
[illegible] ہے۔ ان مضامین اور علوم کی تعلیم کا انسانی جذبات کی نشوونما اور
عام انسانی [illegible] کے پیدا کرنے میں بہت بڑا حصہ ہے۔ ہمارے قدیم نظام تعلیم میں کسی شخص
کی تعلیم مکمل [illegible] اگر وہ ان علوم سے بے بہرہ ہے
[illegible] آج کل کا زمانہ اس کے برعکس ہے۔ آج کل کا دور سائنس کا دور سمجھا جاتا ہے، اور اس
[illegible] تعلیم میں ان مضامین کو ہٹا کر یا کم سے کم ان کی اہمیت کو گھٹا کر علوم طبیعی اور
سائنس کی تعلیم پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ طلبا کو شروع ہی سے انتخاب کر کے سائنس کی تعلیم
[illegible] دلاتے ہیں اور تعلیم سے فراغت کے بعد انھیں اچھی [illegible]
ملازمتیں اور کام مل جاتے ہیں۔ برعکس اس کے جو طلبا سائنس لے کر کامیاب نہیں ہوتے
ہیں، وہ برسوں دھکے کھاتے رہتے ہیں اور اگر انھیں کام مل بھی گیا تو وہ سماج [illegible]
درجہ کے سمجھے جاتے ہیں۔ یہ رخ ہوا کا نہیں رفتہ رفتہ زیادہ تیز دکھائی دیتا ہے۔ اب سے

کوئی ۱۰ سال پہلے جب ایک یونیورسٹی کمیشن ڈاکٹر رادھا کرشنن کی صدارت میں مقرر ہوا تھا، اس وقت اس نے ہمارے نظام تعلیم کی تنگ دامانی کا علاج ایک جنرل ایجوکیشن کی شکل میں تجویز کیا تھا، یعنی جو انسانی علوم کے طلباء ہیں، انھیں تھوڑا بہت جدید سائنس سے واقف ہونا چاہیئے اور جو [illegible] انسانی تہذیب، تار[illegible]فہ کے اثرات پیدا کرنے چاہئیں۔ لیکن [illegible]یشن کی اس سفارش پر منجملہ اور کمیشنوں کی سفارشات کے سب یونیورسٹیوں نے عمل نہیں کیا [illegible] سال پہلے کوٹھاری کمیشن تعلیم کی تمام منزلوں کا جائزہ لینے کے لئے مقرر ہوا [illegible] اس کمی کو دور کرنے کے بجائے مزید سائنس اور سائنسی علوم کی تعلیم پر [illegible]

[illegible]ال یہ نہیں ہے کہ علوم طبیعی ہوں یا انسانی علوم، بلکہ تعلیم کا سارا دارومدار اس پر [illegible] توازن کس طرح قائم رکھا جائے تاکہ موجودہ وقت کی ضروریات بھی پوری ہوں اور انسانی زندگی کی اعلیٰ قدریں بھی باقی رہیں۔

کیا بنیادی تعلیم ختم ہوگئی؟

اسی عنوان سے ابھی تھوڑے دن ہوئے اجمیر میں ایک سیمینار ہوا تھا، جس میں ٹیچرز کالج جامعہ ملیہ کے پرنسپل جناب ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب نے بھی شرکت کی تھی۔ آپ نے اسی مباحثہ کی بنیاد پر "بنیادی تعلیم کی حمایت میں" ایک مضمون لکھا ہے، جس میں آپ نے خود سیمینار کے منتظمین سے یہ سوال کیا ہے کہ یہی سوال تعلیم کے اور حصوں پر کیوں نہیں کیا جاتا ہے؟ مثلاً ثانوی تعلیم، اعلیٰ تعلیم، صنعتی تعلیم وغیرہا۔ صرف بنیادی تعلیم ہی کو کیوں اس کا مخاطب بنایا گیا ہے۔ اس مخصوص انداز سوال سے شبہ [illegible] ہے کہ بنیادی تعلیم کے خاتمے کا اعلان [illegible]

فرض کیجئے کہ اگر بنیادی تعلیم ختم بھی ہوگئی ہے تو اس کے خاتمے کے اس[illegible]

کیا یہ اس وجہ سے ناکام ہوئی ہے کہ ایک ابتدائی تعلیم کی اسکیم کی حیثیت سے یہ تجربہ کی کسوٹی پر پوری نہیں اتری ہے ؟ اگر یہ ناکام ہوئی ہے تو کیا اس کے اغراض و مقاصد صحیح نہیں تھے ؟ یا اس کا نصاب تعلیم ناقص تھا ؟ یا اس کے طریقہ تعلیم اور اسلوب میں خامیاں تھیں ؟

واقعہ یہ ہے کہ جہاں تک اس کے اصول کا تعلق ہے، تمام روشن خیال حلقہ اسے تعلیم کا ایک صحیح نظام سمجھتا رہا ہے۔ اس کے بڑے سے بڑے مخالف ... اس کے اصولوں کی بنیاد پر اس کی مخالفت کرنا آسان نہیں سمجھا ہے۔ بنیادی تعلیم کے بنیادی اصول بہ حیثیت مجموعی تعلیم کے نزدیک بالعموم اور تعلیم یافتہ لوگوں کے نزدیک بالخصوص غیر معمولی سمجھے گئے ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں حکومت ہند نے جو تعلیمی کمیشن مقرر کیا تھا، اس نے اس کا جس انداز میں اپنی رپورٹ کے اندر ذکر کیا ہے، وہ بعض لوگوں کے نزدیک اس کی رسم فاتحہ سے کم نہیں ہے۔ حالانکہ کمیشن نے جن لفظوں میں ذکر کیا ہے، وہ خود بہت قابل تعریف ہے

> بنیادی تعلیم جو مہاتما گاندھی نے ۲۵ سال قبل شروع کی تھی، وہ ابتدائی تعلیم کی ایک نئی شکل تھی جو کسی ہاتھ کے اور نفع بخش کام پر مبنی تھی اور جس کا سماجی زندگی سے بہت گہرا تعلق تھا، وہ ہندوستان کی تعلیم کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی تھی۔

پھر آخر یہ ناکام کیوں رہی ؟ اس کی ناکامی کا اصل سبب لائق مضمون نگار کی نگاہ میں ہماری سماجی زندگی کی بناوٹ ہے۔ ایک طرف تو پیداوار بڑھانے پر اس قدر زور دیا جا رہا ہے۔ ہندستان میں ... کرنی چاہئیں، آج کا سب سے بڑا نعرہ ہے۔ اس کے لئے ظاہر ہے کہ زراعت اور صنعت دونوں کو ترقی دینی ہے، اس لئے کہ اس کے بغیر ہندوستان میں اشتراکی طرز کی زندگی نہیں بن سکتی ہے۔ اور اس مقصد کی تکمیل میں ہماری تعلیم کو بھی بہت بڑا حصہ لینا ہے، چنانچہ ایسی تعلیم جس میں پیداوار پر زور دیا جاتا ہو، ہر شخص چاہتا ہے۔ لیکن ہمارے ... اور تعلیم گاہوں کی جو حالت ہے، وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس اختلاف کی آخر وجہ کیا

ہے ہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ برسرِ اقتدار طبقہ نے دماغی کام اور جسمانی کام میں ایک آہنی دیوار کھڑی کر رکھی ہے [illegible] ملک [illegible] ہے اور جسمانی کام ادنیٰ درجہ کا سمجھا جاتا ہے۔ اور جب تک یہ امتیاز ہمارے ذہنوں میں رہے گا، کوئی کام ہاتھ کا مدرسہ کے نصاب [illegible] چے حرف پسندانہ انداز میں لکھا ہے کہ اگر ہمارا ارادہ ایک سماجی نظام قائم کرنے کا ہے تو اس سے مفر نہیں ہو سکتا کہ [illegible] ہمارے مدرسے پیداواری کاموں سے ایسے بھرپور ہوں کہ ہمارے بچے اور نوجوان پیداواری ہنرمندیوں اور صلاحیتوں میں کامل ہو کر نکلیں۔ بنیادی تعلیم یقیناً ایک اشتراکی نظام قائم کرنے میں مدد دے سکتی ہے، اس لئے کہ یہ ایک ہاتھ کے کام اور دماغ کے کام کے فرق کو مٹاتی ہے [illegible] دوسری طرف بچوں میں ایسی صلاحیتیں اور ہنرمندیاں پیدا کرتی [illegible] سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن یہ صرف چند پرانے حرفوں اور دستکاریوں تک ہی محدود نہیں رہنی چاہیئے۔ ایجوکیشن کمیشن کے الفاظ میں "بنیادی تعلیم کے پروگرام کو ازسرِ نو ترتیب دینے کی ضرورت ہے جو ایسے سماج کے تقاضوں کو پورا کرتا ہو جو سائنس اور ٹکنالوجی سے روز بروز متاثر ہو رہا ہے"

جلد ۵۷ کی فہرست مضامین

[illegible] ماہنامہ جامعہ کی جلد ۵۷ کی فہرست مضامین یعنی جنوری سے [illegible] جون [illegible] مضامین اور مضمون نگاروں کی فہرست [illegible] کے ساتھ بھیجی جائے گی۔ جلد بندھوانے سے قبل [illegible] انتظار کر لیا جائے۔

عبداللطیف اعظمی

نیاز فتحپوری کے خطوط

([illegible] ۱۹۶۶ء کو انتقال ہوا تھا، ان کی [illegible]
برسی کی مناسبت سے ذیل کا مضمون شائع کیا جا رہا ہے)

[illegible] کی ہر تحریر میں ان کا [illegible] منفرد [illegible] موجود ہوتا ہے [illegible] معاملے میں مولانا ابوالکلام اور مولانا نیاز فتحپوری دونوں [illegible] زیادہ ملتے جلتے ہیں، دونوں کا اسلوب [illegible] دور کے ذوق اور چلن سے مختلف تھا، مگر پھر بھی دونوں کی مقبولیت میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا، دونوں کی تحریروں میں اشعار کی کثرت ہوتی ہے، دونوں کا استعمال اس قدر برمحل ہوتا ہے کہ ان کی تحریروں میں جان پڑ جاتی ہے اور لطف دوبالا ہو جاتا [illegible]

دونوں کے خطوط میں بھی زبان و بیان کی وہی خوبیاں موجود ہیں جو ان کے دوسرے ادب پاروں میں ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی خط نہیں، کسی سنجیدہ موضوع پر کوئی اہم مقالہ لکھ رہے ہوں، ان دونوں کے مکتوب الیہم بھی قریب قریب اسی پائے کے ادیب اور عالم ہیں، جتنے یہ خود ہیں۔

[illegible] کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں، ان خطوں پر نہ کوئی تاریخ ہے، نہ مکتوب الیہ کے [illegible] کا پتا چلتا ہے کہ مکتوب نگار نے کس جگہ سے لکھا ہے، جس کی وجہ سے ان کی تاریخی حیثیت باقی نہیں رہی۔ ان [illegible] کے نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ خطوط نہ کسی کو لکھے گئے اور نہ بھیجے گئے، بلکہ یہ مختصر انشائیے ہیں، جنہیں نیاز نے خطوط کے طرز میں لکھا ہے۔ ظاہری صورت حال اسی خیال کی تائید کر[illegible] صاحب کی زندگی میں اس قسم کے شبہات کئے گئے تھے، مگر انھوں نے کبھی اس کی تردید نہیں کی، اس لیے اور یقین ہو جاتا ہے کہ یہ بات صحیح ہے، لیکن ان مجموعوں میں بہت سے خط ایسے بھی ہیں، جن میں اشخاص اور واقعات کا اس طرح ذکر ہے، جس طرح سبھی خطوط میں ہوتا ہے،

اس لیے میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ تمام کے تمام خطوط محض فرضی نہیں، میرا خیال ہے کہ اگر سب کے سب نہیں تو بیشتر مختلف لوگوں کو لکھے گئے ہیں اور بھیجے بھی گئے ہیں اور انھیں ضرور "نگار" میں شائع کیا گیا۔ نیاز صاحب چاہتے تھے کہ ان کے مکتوب الیہ زیر بحث نہ آئیں، اس لیے خطوط کے تمام لوازمات کو حذف کر دیا اور جب انھوں نے دیکھا کہ انھیں [illegible] اس حالت میں کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ میرے اس خیال کی جن باتوں سے تائید ہوتی [illegible] ہوں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: "[illegible] نامہ گرامی عزیزی یوسف کے ذریعہ سے پہونچا۔" ایک اور خط میں [illegible] اسلم صاحب نے زمانے سے خط و کتابت بند کر دی ہے اور اگر آپ یہ نہ لکھتے کہ وہ بمبئی میں ہیں تو مجھے یہ بھی خبر نہ ہوتی کہ زندہ ہیں یا مر گئے۔" ایک اور مثال ذرا طویل، ملاحظہ [illegible] ۲۰ جون کا گرامی نامہ کل ۸ راگست کو ملا، آپ نے دیکھا، آپ مجھ سے کتنی دور ہیں، یعنی اس دور برق و کہربا میں بھی پورے دو مہینے [illegible] اگر ہم آپ دو مختلف کرۂ [illegible] فاصلہ اربوں میل ظاہر کیا جاتا۔ آپ ابھی جوان ہیں، اس لیے یہ سمجھ کر شاید ہنسیں گے، لیکن مجھے اس خیال سے اختلاج ہونے لگتا ہے۔ آپ نے یہ لکھ کر میری واپسی کا کچھ ٹھیک نہیں" [illegible] مایوس کر دیا، بار بار میر کا شعر یاد آتا ہے

عہد تک نہ [illegible] مگر نے ہم سے بے وفائی کی

[illegible] کا زمانہ ہے، ہندوستان میں رہتا ہوں، ملاحظات میں کیا رکھا ہے کہ انھیں علاحدہ کر کے آپ کو پرچہ بھیجا جائے۔ رسالہ [illegible] نے کچھ [illegible] کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ درمیان میں بیس جگہ احتساب و مراقبہ ہوتا [illegible] پرزے پرزے ہو کر اس قابل نہیں رہتا کہ آگے بڑھایا جا سکے۔ مارچ و اپریل کے پرچے پھر بھیج رہا ہوں، لیکن ان کے پہونچنے یا نہ پہونچنے کی اطلاع بھی غالباً چار مہینے کے بعد آئے گی [illegible] اللہ!

[illegible] دوران میں آپ کے پاس جتنے عربی رسائل جمع ہو گئے ہیں وہ سب یا ان میں سے خاص خاص بھیج دیجیے۔ کتابوں کی ضرورت نہیں۔" (مکتوبات نیاز حصہ دوم صفحات ۲۰۷ و ۲۰۸)

[illegible] آپ کا خط [illegible] ہوتا ہے کہ [illegible] کوئی ایسا شخص [illegible] میں ہے، اس کو پرچہ نہ ملنے کی شکایت ہے، اس شخص کو ملاحظات اس قدر پسند ہیں کہ خواہش کر [illegible] رسالہ سے الگ کر کے بھیج دیے جائیں [illegible] مگر یہ بھی عین ممکن ہے کہ یہ واقعات سب صحیح ہوں اور مخاطب واقعی کوئی زندہ شخصیت ہو، مگر پھر بھی میرا خیال غلط ہو سکتا ہے اور یہ ایک ممکن ہے کہ یہ خط اس کو نہ بھیجا گیا ہو۔ "نگار" کے کسی قاری کا کوئی خط آیا ہو اور اس کے مضمون کے پیش نظر ایک خط لکھ کر "نگار" کے صفحات [illegible] اسی لیے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کہ

یہ خیال صحیح ہو سکتا ہے کہ " وہ لکھے ہی اس مقصد سے گئے ہیں کہ شائع کئے جائیں" اس خیال کو اس سے اور تقویت پہنچتی ہے کہ بیشتر خطوط میں ایسے موضوعات زیر بحث لائے گئے ہیں، جن سے نیاز کو بڑی دلچسپی تھی اور جن پر عام طور پر نجی خطوط میں اس انداز اور اس تفصیل کے ساتھ، جس طرح ان خطوط میں کثرت سے ہیں، اظہار خیال نہیں کیا جاتا۔ مثلاً علمائے کرام کو چھیڑنا، ان پر طنز کرنا، ان کے خیالات کا [illegible] اور ان کے جذبات و احساسات کو ٹھیس پہنچانا، نیاز کا خاص مشغلہ تھا، ان خطوط میں اس کی مثالیں بڑی کثرت سے ملتی ہیں۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

حضرت! یہ آپ کس زمانہ کی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کو کیونکر معلوم ہوا کہ "قالو بلیٰ" کہنے والوں میں میری روح بھی شامل تھی۔ "لن ترانی" کی توہین برداشت کرنے والے کب کے ختم ہو چکے اور دار [illegible] داری کے دور [illegible] اگر آپ [illegible] ہیں، یعنی [illegible]

[illegible] طاعت و عبادت کا مفہوم اگر صرف یہ ہے کہ پیشانی رگڑ رگڑ کر تقدیر کے لکھے کو مٹایا جائے (حالانکہ آپ اس کے بھی قائل نہیں) تو یہ "گھس گھس" میرے بس کی بات نہیں لیکن اگر [illegible] بتائیے کہ اس کا انحصار "تسبیح و مصلا" [illegible] پر کیوں؟

درکار عشق نالہ و آہے ضرور نیست

(حصہ دوم صفحات ۴۶ و ۴۷)

[illegible] خطوط میں جس کثرت سے اپنے ادبی نظریات اور خیالات کی تبلیغ و اشاعت کرتے ہیں، اس کا بھی ایک نمونہ ملاحظہ ہو، ان کو پڑھ کر خاص طور پر یہ خیال یقین کی حد تک پہنچ جاتا ہے کہ یہ خطوط محض قارئین نگار کی دلچسپی اور تسکین ذوق و شوق کی خاطر لکھے گئے ہیں:

[illegible] نامہ فرمائے نیاز منداں، گرامی نامہ نے معزز فرمایا۔ فارسی تغزل کے بارے [illegible] اور کیا ہو سکتی ہے۔ آپ میری طرف بڑھ گئے ہیں [illegible] ظاہر ہے میں کیا اور میری ذات کیا [illegible] سے غالباً یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ میں قدامت پرستی کا دشمن ہوں، لیکن اسی کے ساتھ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جس حد تک تغزل کا تعلق ہے، میں قدامت کا پرستار ہوں۔

نظیری، حافظ اور عرفی، اس میں شک نہیں کہ "غزل" کے بادشاہ ہیں، لیکن رات کی تنہائی اور پچھلے پہر کے سکوت میں سوائے [illegible] کے مجھے کوئی یاد نہیں آتا۔ ہندی نشاد شعراء [illegible]

[illegible]

لے نگار (پاکستان)، نیاز نمبر حصہ اول صفحہ ۲۳

خسرو کے تغزل کا اسی لیئے دلدادہ ہوں کہ اس کے کلام سے بھی وہی "بوئے خوشدلی" آتی ہے۔
یوں ادب و انشا میں میرا ذوق کافی دقت پسند ہے، لیکن غزل میں جہاں کوئی اشکال پیدا ہو
[illegible] وسہل الفاظ، سلجھا ہوا انداز بیان، شگفتہ ترکیبیں، — یہ ہیں ایک غزل
[illegible] رنگ اتنا ہی رچا ہوا ہے جتنا اردو میں میر کے یہاں۔"
(حصہ دوم صفحات ۵۱ و ۵۲)

اس کے بعد نیاز [illegible] خیال کی تائید میں مختلف اور متعدد اشعار پیش کر کے تفصیل سے بحث کی ہے [illegible] یہ خطوط (کسی کو بھیجے گئے ہوں یا نہ بھیجے گئے ہوں) نجی خطوط کی تعریف میں آتے ہیں یا نہیں [illegible] وہ یہ کہ اپنی شوخی، ندرت بیان، لطف زبان اور ادبی قدر و قیمت کے لحاظ سے [illegible] عقیدت مند — ارشد کاکوی — لکھتے ہیں:

"[illegible] کے مکاتیب [illegible] حیثیت کو UNDERVALUE کرتے ہیں، حالی کے خطوط ان کی پاکیزہ سرشت کے عکاس ہیں، وحشت کے مکاتیب ان کی خاکساری و انکساری کے نمائندہ ہیں، شبلی کے نامہائے شوق اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ انسان تھے اور ان کے پہلو میں دل اور دل میں جذب و شوق بلکہ ہوا و ہوس کی لہر تھی، غالب کے خطوط ایک دور کی تاریخ اور خود غالب کی زندگی کے فوٹو ہیں، اقبال کے مکاتیب محض علمی دستاویز ہیں، لیکن نیاز کے مکاتیب میں یہ تمام چیزیں ایک جگہ جمع ہیں اور ان کے مطالعہ کے بعد ان کی شخصیت کے بہت سارے پہلو اور ان کے عقیدے و نظریے کے تمام گوشے سامنے آجاتے ہیں[1]"

اس بیان میں کچھ مبالغہ ہو سکتا ہے، خصوصاً موازنہ کرنے اور دوسرے مشاہیر کے خطوط کی خصوصیات کے تعین میں، میرے نزدیک خلوص سے کام نہیں لیا گیا ہے، مگر آخری فقرہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔

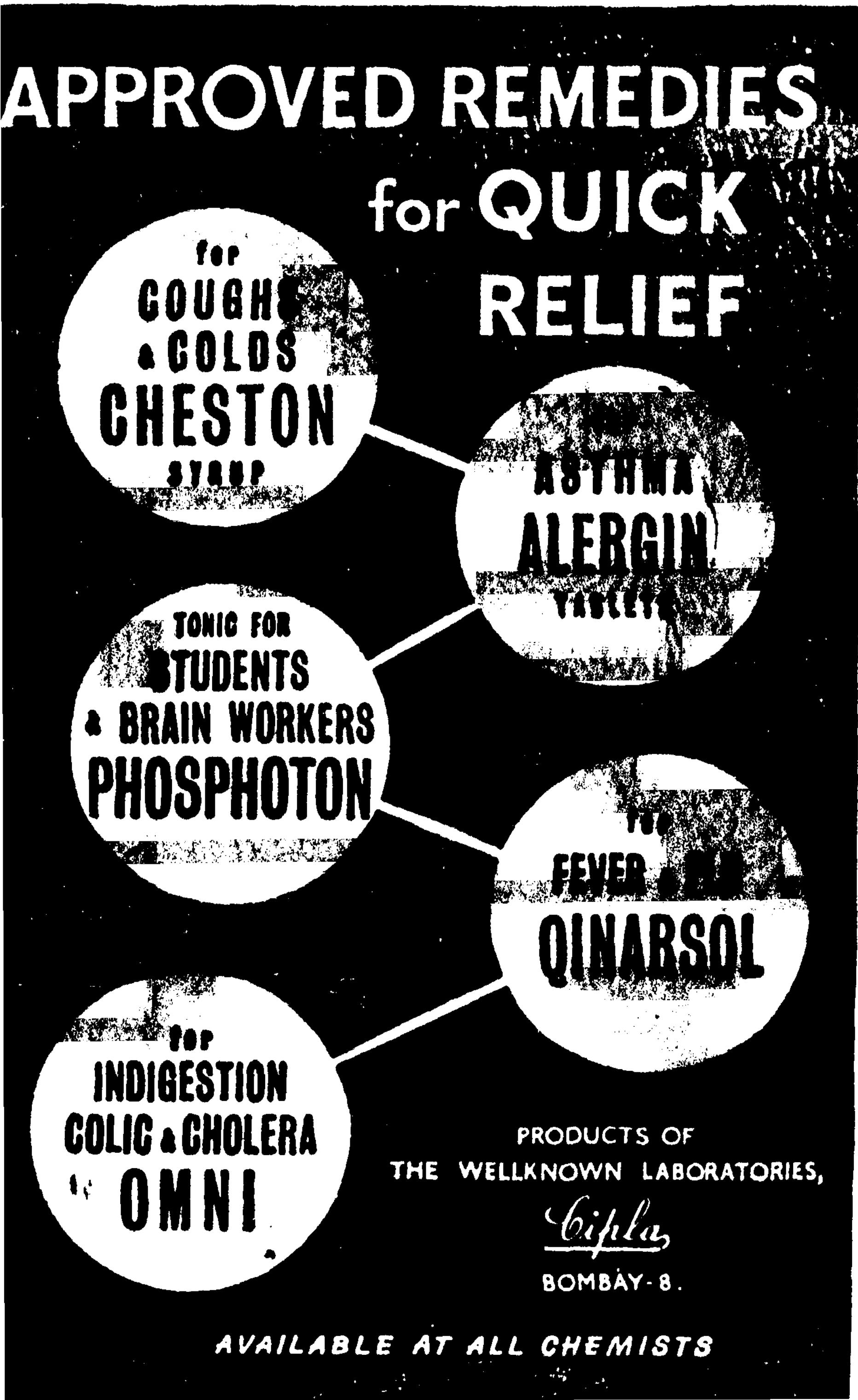
غرض "مکتوبات نیاز" چاہے نجی خطوط کی دلچسپی، خلوص اور سادگی سے محروم ہوں، مگر ان کے [illegible] کا تنوع، پھیلاؤ اور رنگا رنگی، ان کی انشا پردازی اور ادبی و تنقیدی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور اس لحاظ سے ان کا مقابلہ دوسرے خطوط سے نہیں کیا جا سکتا، وہ خطوط بھی اس درجے کے نہیں ہیں، جو محض ادبی موضوعات اور زندگی کے مختلف مسائل پر اظہار خیال اور صرف چھپنے کے لئے لکھے گئے

[illegible]

---

[1] نگار، نیاز نمبر حصہ اول صفحہ [illegible]




APPROVED REMEDIES
for QUICK
RELIEF
for
COUGHS
& COLDS
CHESTON
ASTHMA
ALERGIN
TONIC FOR
STUDENTS
& BRAIN WORKERS
PHOSPHOTON
FEVER
QINARSOL
for
INDIGESTION
COLIC & CHOLERA
OMNI
PRODUCTS OF
THE WELLKNOWN LABORATORIES,
Cipla
BOMBAY-8.
AVAILABLE AT ALL CHEMISTS

۰۵۱ ۱۵ ج ۳۹۷۷۲

۱/۱۹۶۸ء

یہ کتاب اُس تاریخ کو جو سب سے آخیر میں ڈالی گئی ہے واپس کرنی ہے، ورنہ پانچ پیسے روزانہ کے حساب سے ہرجانہ ادا کرنا ہوگا

~~9 APR 1971~~

~~24 MAY 1972~~

~~26 OCT 1972~~

~~1.2.77~~